اللہ کے سپاہی



ابو علی عبدالوکیل حفظہ اللہ

نعمانی کتب خانہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب ....

- عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد اپ لوڈ (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشرواشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

☆ تنبیہ ☆

- کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔
- ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی وشرعی جرم ہے۔

﴿اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں﴾

- نشرواشاعت، کتب کی خرید وفروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔


اللہ کے سپاہی

نام کتاب

اللہ کے سپاہی

مؤلف

ابو علی عبد الوکیل حفظہ اللہ

سرورق

ضیغم لاہور

تاریخ اشاعت

جولائی ۲۰۰۴ء

مطبوعہ

علی آصف پرنٹرز لاہور

ناشر

نعمانی کتب خانہ

حق سٹریٹ اُردو بازار لاہور

E.mail.nomania2000@hotmail.com

042 - 7321865

NOMANI

اللہ کے سپاہی

ابو علی عبد الوکیل حفظہ اللہ



نعمانی کتب خانہ

فہرست

ماضی کا آئینہ

”ماضی وہ جھروکہ ھے ‘جس میں سے جھانکتے ہوئے کوئی فرد یاقوم اپنے اسلاف پرفخر بھی کرتی ھے اور جوش وجذبہ کا اظھار بھی .“

”ماضی وہ آئینہ بھی ھے‘ جس میں دیکھ کر اپنی سابقہ کوتاھیوں اورخامیوں کو جانچا جاتاھے اور مستقبل کی راھوں کا تعین کرتے وقت گذشتہ کوتاھیوں اورخامیوں سے احتراز کیاجاتاھے .“

حرف آغاز

مدینہ کی پر امن گلیوں سے گزرتے ہوئے تاجدار کونین ﷺ کی یہ حالت ہوا کرتی تھی کہ آپ ﷺ کی نظریں باحیا کنواری لڑکیوں سے بھی زیادہ باشرم ہوتی تھیں اور عجز و انکساری کا یہ عالم کہ ہمہ وقت کمال اطاعت وفرمانبرداری کی صورت نظر آتی تھی مگر جب یہی عظیم ہستی کفر کے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے نکلتی ہے اور بغاوت کا راستہ اختیار کرنے والے یہودیوں کی سرکوبی کا عزم کرتی ہے تو میدان جنگ میں بڑے دلیرانہ اور مجاہدانہ رنگ میں اکیلے اپنی سواری کو دشمن کی طرف بھگائے جارہے ہیں اور بڑی جرات کے ساتھ یہ شعر دہرا رہے ہیں۔

انا النبی لا کذب انا ابن عبدالمطلب

میں نبی ہوں اس میں کوئی جھوٹ نہیں اور میں عبدالمطلب کا فرزند ہوں۔

آباء واجداد کے ناموں پر فخر کی ریت مٹانے والے محسن انسانیت ﷺ میدان کارزار میں جرات وجوانمردی کی تاریخ رقم کرنے کے لئے اپنی قوم کو یہ درس دیتے ہیں کہ جب کفر کی آندھیوں سے مقابلہ کرنے نکلو تو اس شان سے نکلنا کہ کفر کو مجبوراً تمہارے سامنے گھٹنے ٹیکنے پڑ جائیں۔

دنیا کی قیادت سنبھالنے والی قوم کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ ایسا طریق اختیار کرتی کہ جس میں اس کے مستقبل کی ضمانت ملتی۔ اسلام کو ماننے والے لوگ چونکہ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ تھے اس لئے اسلام نے انہیں حالت امن میں گردن جھکا کر چلنے کا حکم دیا مگر کفر سے

معرکہ آرائی میں سر اٹھا کر چوڑا چکلا سینہ باہر نکال کر فخر سے چلنے کا درس دیا تاکہ کفر مقابلے سے پہلے ہیبت زدہ ہو جائے اور اس کا سب سے پہلا اور مسلسل مظاہرہ کرنے کے لئے اسلام نے اس گھر کا انتخاب کیا جو آج تک مسلمانوں کا قبلہ ہے اور اس کے لئے ایسے موقع کا انتخاب کیا جو آج تک سب مسلمانوں کے لئے مقدس اور محترم ہے۔

اور پھر یہیں بس نہیں بلکہ روم و ایران جیسی سپر پاورز کو سبق سکھانے کے لئے محمد عربی قیصر و کسریٰ کو خطوط لکھتے ہیں اور ان کی سرکوبی کے لئے موتہ و تبوک جیسی عظیم مہمات جنگ روانہ کرتے ہیں بلکہ جب آپ ﷺ اس عالم فانی سے کوچ کر رہے تھے تو اس وقت بھی آپ ﷺ کو کفر کی سرکوبی کی فکر دامن گیر تھی اور اپنے ہاتھوں سے اپنے چہیتے غلام سیدنا زید رضی اللہ عنہ کے فرزند ارجمند اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کی قیادت میں لشکر تیار کر کے روم کی سرحدوں کی طرف روانہ کرتے ہیں۔ جب ہر مسلمان اور بالخصوص مسلمانوں کے حکمرانوں کو یہ فکر تھی کہ اسلام کو دنیا پر کیسے غالب کیا جا سکتا ہے تو وہ ہمیشہ دفاع و قوت کے لئے نئے آفاق اور وسائل تلاش کرنے میں مصروف تھے۔ وہ عرب جن کے تمام جاہلی اشعار سمندر سے خوف کی داستانوں سے بھرے پڑے تھے حتیٰ کہ مستشرقین یہ تبصرہ کرتے ہیں کہ ان کا ادب اس لئے ناقص تھا کہ اس میں سمندر کی جھلک کہیں نظر نہیں آتی۔

تاریخ شاہد ہے کہ یہی عرب سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں ایک عظیم بحری بیڑہ لے کر سمندر کی بے رحم موجوں میں صرف اس لئے کود پڑتے ہیں کہ اس وقت ان کے سامنے اسلام کی سرحدوں کو وسیع کرنے کے لئے اور کوئی چارہ کار نہ تھا۔ بلکہ اس سے بڑھ کر دیکھیں تو یہی عرب اندلس کی سرزمین پر اسلام کے جھنڈے گاڑنے کے لئے سمندر کا وہ خطرناک راستہ اختیار کرتے ہیں جس پر آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی جہاز گزارنے سے پہلے بڑے بڑے افسران سر جوڑ کر بیٹھتے ہیں اور راستے کو تباہ کن بھنوروں سے بچنے کی تدبیریں کر کے جہاز سمندر کی لہروں کے سپرد کرتے ہیں۔ ہسپانیہ کی سرزمین کو جانے والے اسی سمندری راستے کو دیکھنے والے آج بھی حیرت زدہ ہیں کہ طارق بن زیاد رحمہ اللہ نے اس تباہ کن اور تنگ سمندری راستے کو اپنی بحری بیڑے سے کیسے عبور کیا تھا؟ طارق بن زیاد رحمہ اللہ کی کامیابی میں

سب سے بڑا یہ راز بھی مضمر تھا کہ اندلس کو اسلام کی تجربہ گاہ بنانے کے لئے اسی راستے کا انتخاب کیا تھا۔

اندلس کی سرزمین میں جب طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا اور ہر علاقہ پر الگ الگ حکمران تھے تو باوجود اس سیاسی انتشار اور افتراق کے اس سرزمین میں ایسے لوگوں کی کمی نہ تھی جو دولت ایمان سے مالا مال تھے۔ مسلمانوں کے اس سیاسی انتشار سے فائدہ اٹھا کر ہمسایہ عیسائی حکمران نے پورے اندلس پر اپنا سکہ یوں جمانے کی کوشش کی کہ کسی علاقے کو اپنے تسلط میں لے لیا اور کسی کے باشندوں سے جزیہ وصول کرنا شروع کر دیا۔ اس نازک موڑ پر کچھ زندہ دل مسلمان شمالی افریقہ میں قائم مسلمانوں کی مضبوط ترین حکومت کے پاس داد رسی کے لئے پہنچتے ہیں تو وہ اپنے گھوڑے دوڑاتے ہوئے اندلس کی سرحدوں پر پہنچتا ہے اور اس وقت اشبیلیہ میں مسلمان سخت کشمکش کا سامنا کر رہے تھے ان کے سامنے دو ہی راستے تھے یا تو وہ بیرونی دشمن سے لڑتے جس کی تعداد ان سے بیسیوں گنا زیادہ تھی' ورنہ انہیں جزیہ کی ذلت قبول کر کے عیسائی حکمرانوں کی عیش و عشرت کا سامان فراہم کرنا تھا' تو ایسے نازک موقع پر اشبیلیہ کا حاکم عباد بن معتمد بڑی جرأت اور بہادری سے عیسائی حکمران کے نمائندے کو یہ دندان شکن جواب دیتا ہے جو آج بھی تاریخ کے صفحات پر سنہری حروف سے رقم ہے۔

''مجھے سوروں کی نگہبانی کرنے کی بجائے مسلمانوں کے اونٹ چرانا پسند ہے۔''

اس تاریخی جملے کو دہراتے ہوئے اس حاکم نے اپنی مسلم رعایا اور بیرونی معاونین ''مرابطین'' کی مدد سے کفر پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ وہ سرزمین جو مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل چکی تھی وہ دوبارہ پھر مسلمانوں کے قبضے میں آ جاتی ہے اور ایک سو سال تک مرابطین کی حکومت قائم رہتی ہے۔ اسلامی تاریخ کے ابواب کی عظمت ایسے ہی عظیم سپوتوں کے کارناموں سے لکھی جاتی ہے جو کفر کے سامنے سر جھکانے کی بجائے سر اٹھانے کی رسم ڈالتے ہیں۔ ملک مظفر قطز اور سلطان بیبرس بندقداری کو تاریخ نے آج تک کیوں یاد رکھا ہوا ہے؟ اس لئے کہ جب تاتاری سیلاب کو روکنے کے لئے جلال الدین شاہ خوارزمی اور بغداد کی عظیم الشان خلافت ناکام ہو جاتی ہے اور بغداد کی گلیاں خون سے بھر جاتی ہیں اور ان اشخاص جیسے عظیم

مصنف کا ہاتھ اس سال تک کچھ لکھنے کے لئے تیار نہیں ہوتا اور وہ حسرت بھرے لہجے میں اس تباہی کے منظر کو بیان کرتے وقت کہتا ہے ’’کاش! میں اس واقعہ سے پہلے مر چکا ہوتا اور میرا نام ونشان تک باقی نہ ہوتا۔‘‘ تاتاریوں کا یہ سیلاب جب مصر کے دروازوں پر دستک دے رہا تھا تو مصر کا یہ جوانمرد حکمران مصر کے تمام بڑے سرداروں کی دولت اور جاگیریں فروخت کر کے مجاہدین کے لئے اسلحہ کے انبار لگا چکا تھا تاکہ دشمن سے مقابلہ کرتے وقت مسلمانوں کے حوصلے اس لئے پست نہ ہو جائیں کہ ان کے پاس اسلحہ کم ہے۔ تاریخ گواہ ہے، آسمان کو آج بھی وہ واقعہ یاد ہوگا اور سرزمین مصر کی سرحدوں پر واقع عین جالوت کا میدان آج بھی گواہی دینے کے لئے تیار ہے کہ جہاد اور دفاع کے لئے تمام قوت کو صرف کرتے ہوئے جب مٹھی بھر نوجوانوں نے تاتاریوں کے اس فخر وغرور کو توڑنے کا عزم کر لیا تو اقوام عالم کو اپنا فیصلہ بدلنا پڑا۔ جو لوگ اس واقعہ سے پہلے کہا کرتے تھے کہ انسانوں کے سروں سے مینار تعمیر کرنے والی ظالم قوم تاتاریوں کو کبھی شکست نہیں ہو سکتی وہ آج یہ کہہ رہے تھے کہ ایمان وعمل اور حکم ربانی کو بجالانے والی قوم کا وہ بھی مقابلہ نہیں کر سکتے۔ جب مصر کی سرحدوں پر تاتاریوں کے آنے کی خبریں موصول ہو رہی تھیں تو وہاں بھی ایسے مشیر موجود تھے جو یہ مشورہ دے رہے تھے کہ ہمیں تاتاریوں سے دوستی کا ہاتھ بڑھانا چاہئے لیکن انہیں ان کا بہادر حکمران یہ درس دیتا ہے کہ بغداد کی خلافت نے تاتاریوں کی اطاعت وفرمانبرداری کے لئے کون سے جتن نہیں کئے لیکن تاتاریوں نے نہ کسی دوست کو چھوڑا اور نہ کسی دشمن کو۔ اسلام نے ہمیشہ یہی درس دیا ہے کہ زندہ قوموں میں اپنا نام رقم کروانا چاہتے ہو تو اللہ تعالیٰ کے احکام کو پورا کرنا، خواہ تمہیں روکھی سوکھی کھانا پڑے۔

جب بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اس لئے لشکر اسامہ کی روانگی سے روک رہے تھے کہ خود حجاز میں مرتدین، جھوٹے نبوت کے دعویداروں اور زکوۃ کے منکرین کا فتنہ سر اٹھا رہا ہے تو انہوں نے بڑی ایمانی جرأت سے کہا تھا کہ اگر مجھے یہ خدشہ ہو کہ لشکر اسامہ کو روانہ کرنے کے بعد میں مدینہ میں اکیلا رہ جاؤں گا اور بھیڑیئے مجھے چیر کھائیں گے تو تب بھی میں اس لشکر کو نہیں روکوں گا جس کی روانگی کا حکم نبی کریم ﷺ اپنی وفات سے قبل دے

چکے ہیں۔ بظاہر حالات ان لوگوں کی تائید کر رہے تھے جو اس مہم کی روانگی سے منع کر رہے تھے مگر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کی تکمیل سے ملنے والی فتح ونصرت پر یقین رکھنے والے خلیفہ اول صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ان ناگزیر اور مشکل حالات میں روم جیسی سپر پاور سے ٹکر لینے کے لئے ان مجاہدین اسلام کو روانہ کرتے ہیں جنہیں سرور کائنات ﷺ نے روانگی کے لئے منتخب فرمایا تھا۔ اللہ کے نبی ﷺ کے اس فیصلے کو نافذ کرنے کا فائدہ یہ ہوا کہ وہ مٹھی بھر مجاہدین رومیوں کے ٹڈی دل لشکر کو شکست دے کر مدینہ میں مال غنیمت کے ڈھیر لگا دیتے ہیں اور مسلمان اس مال غنیمت سے تمام اندرونی شورشوں کو دبانے کے لئے جنگی مہمیں روانہ کرتے ہیں۔

ایک مسلمان کامیابی اور فتح ونصرت کے لئے کبھی ظاہری وسائل پر اعتماد نہیں کرتا بلکہ اس کی فکر وہی ہوتی ہے جس کی ترجمانی سیدنا عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے جنگ موتہ میں یوں کی تھی۔

مانقاتلهم بعددولا عدة ولكن نقاتلهم بهذا الدين فما هي الااحدى الحسنين

''ہم کفار سے تعداد یا تیاری کے بل بوتے پر نہیں لڑتے بلکہ اس دین کی بنیاد پر لڑتے ہیں کیونکہ ہمارے مقدر میں دو میں سے کوئی ایک خوبی ضرور ہوتی ہے فتح یا شہادت۔''

یہ بات انہوں نے گھر میں بیٹھ کر نہیں کہی تھی بلکہ اس موقعہ پر کہی کہ جب صرف تین ہزار مسلمان مجاہدین کا سامنا دو لاکھ عیسائی فوج سے ہوتا ہے جن میں سے چالیس ہزار انجیل اٹھا کر یہ قسم اٹھا چکے تھے کہ ہم آنے والے مسلمانوں کی تکہ بوٹی کر دیں گے۔ اس صورت حال کو دیکھ کر جب مسلمانوں کے لشکر کے تمام بڑے بڑے مجاہدین مل بیٹھے' کوئی کہہ رہا تھا کہ ہمیں مدینہ پیغام بھیج کر مزید کمک منگوانا چاہئے اور کوئی کچھ' تو اس وقت اس مرد مجاہد نے یہ کلمات کہے تھے اور پھر انہیں واقعتاً سچ کر دکھایا اور خود اگرچہ اس معرکہ میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کر دیا مگر تاریخ کے صفحات پر یہ باب لکھ ڈالا کہ تین ہزار کی جماعت دو لاکھ فوج کو اپنے سامنے سے بھگا سکتی ہے۔ تاریخ میں ایسی بے مثال قربانیوں کی بے شمار مثالیں موجود ہیں کہ

مسلمانوں نے ظاہری اسباب کی بجائے اسباب کے ربّ پر اعتماد کرتے ہوئے آتش نمرود میں کود کر عشق کی داستانیں رقم کی ہیں۔

زیر نظر کتاب میں چند ایسی ہی شخصیات کا تذکرہ دلپذیر ہے جنھوں نے اپنی زندگیوں کو اللہ کی راہ میں وقف کیا ہوا تھا۔ ان کے دن گھوڑوں کی پیٹھ پر جہاد کے میدانوں میں اور راتیں مصلوں پر اپنے ربّ کی عبادت میں گزرتی تھیں۔

اس ضمن میں ایک وضاحت ضروری ہے کہ اس تذکرہ کو بیس شخصیات تک محدود دیکھ کر یہ نہ سمجھا جائے کہ مؤلف کے نزدیک دعوت و جہاد کے میدان میں صرف یہی شخصیات اس تذکرہ میں شمولیت کے قابل ہیں۔ بلاشبہ اسلام کی تاریخ اس مقام بلند و عالی وقار کی حامل اور بھی بہت سی شخصیات ہیں۔ اس کتاب میں شامل دراصل وہ شخصیات ہیں جن پر مؤلف اب تک قلم اٹھا سکا ہے۔ یہ مضامین مختلف رسائل و جرائد کے لئے لکھے گئے بعدازاں ان پر مزید کام کر کے ان کو کتابی شکل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

دوسری عرض یہ ہے کہ اس کتاب میں ان شخصیات کی سوانح نہیں بیان کی گئی بلکہ ان کی سیرت و کردار کے چند روشن پہلوؤں کی عکاسی کی گئی ہے جو ایک طرف ان کے مقام و مرتبے کو واضح کرتی ہے تو دوسری طرف اس سے اہل ایمان فیض حاصل کر کے راہ حق میں جدوجہد کرنے اور اللہ کی راہ میں تن من دھن کی بازی لگا دینے کا جوش و جذبہ حاصل کر سکتے ہیں۔

اللہ ہمیں بھی دین حق کی سربلندی' باطل کی سرکوبی کے لئے کام کرنے کی توفیق دے ہمیں سعادت کی زندگی اور شہادت کی موت سے نوازے۔ آمین

ابوعلی عبدالوکیل
جمال دین بھک، ڈاک خانہ ملک پورہ
تحصیل و ضلع بہاول نگر ۶۲۳۰۰

خالد بن ولیدؓ



خالدا! تمھاری عقل و دانش اور فہم وفراست کی بنا پر مجھے بہت امید تھی کہ تم ایک نہ ایک دن ضرور اسلام قبول کر لو گے. فرمان نبویؐ

زبان نبوت سے اللہ کی تلوار کا لقب پانے والے جرنیل اسلام

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام حکمرانوں کی طرف تبلیغی خطوط روانہ کیے۔ ان میں سے ایک خط اپنے ایک صحابی حارث بن عمیر ازدی رضی اللہ عنہ کو دے کر وادی بصریٰ کے حکمران حارث بن ابی شمر غسانی کی طرف روانہ کیا۔ شام کے سرحدی صوبے بلقاء کے گورنر شرجیل بن عمرو غسانی نے انہیں گرفتار کر کے شہید کر دیا۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک یہ اطلاع پہنچی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بہت پریشان ہوئے۔ اس کے علاوہ پندرہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت کو (جو شام کے علاقے میں تبلیغ اسلام میں مصروف تھی) کو ذات الطلح کے مقام پر دھوکہ دے کر شہید کر دیا گیا۔ انہی وجوہ کی بنا پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے 8 ہجری میں ایک لشکر روانہ کیا جس کا سپہ سالار حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا گیا اور فرمایا کہ اگر حضرت زید رضی اللہ عنہ شہید ہو جائیں تو لشکر کے سپہ سالار جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ہوں گے۔ اگر وہ بھی شہید ہو جائیں تو عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ سربراہ ہوں گے۔ عبداللہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد لشکر اسلام جس کو چاہے اپنا قائد چن لے۔ لشکر کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ وصیت کی کہ جس مقام پر حارث رضی اللہ عنہ شہید ہوئے وہاں پڑاؤ کریں اور اللہ سے مدد طلب کرتے ہوئے دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کریں۔ کسی سے بدعہدی نہ

کرنا اور نہ ہی خیانت کا ارتکاب کرنا۔ بچے، بوڑھے یا عورت کو قتل نہ کرنا اور نہ ہی تارک الدنیا راہب کو قتل کرنا۔ لشکر جب شام کے علاقے بلقاء میں پہنچا تو پتہ چلا کہ دشمن اسی مقام پر پہلے سے ہی موجود ہے۔ مجاہدین راستہ تبدیل کرتے ہوئے موتہ کے مقام پر پہنچے۔ وہاں لشکر اسلام کا کفار سے مقابلہ ہوا۔ مسلمانوں نے بڑی بہادری سے دشمن کا مقابلہ کیا۔ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے بڑی بہادری سے دشمن پر حملہ کیا اور دشمن کی صفوں کے اندر گھستے چلے گئے اور جام شہادت نوش کیا۔ ان کی شہادت کے بعد جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے لشکر کی قیادت سنبھال لی۔ آپ بھی بڑی بہادری سے لڑے اور اور پاپیادہ دشمن کی صفوں میں گھس کر اس کو تہہ تیغ کرنے لگے۔ ایک دشمن نے جب آپ رضی اللہ عنہ کا دایاں بازو کاٹ دیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے جھنڈا بائیں بازو میں پکڑ لیا۔ اس نے بایاں بازو بھی کاٹ دیا تو آپ نے اپنے پاؤں کے سہارے جھنڈے کو سرنگوں نہیں ہونے دیا۔ اس نے ایک اور وار کیا جس سے آپ شہید ہو گئے۔ ان کے بعد حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے جھنڈا تھام لیا اور جرأت و بہادری سے لڑتے ہوئے جام شہادت نوش کیا۔

تین جرنیلوں کی شہادت کے بعد لشکر اسلام کے حوصلے پست ہونے لگے۔ ثابت بن ارقم رضی اللہ عنہ نے اسلامی جھنڈے کو اپنے قابو میں لیا اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے لشکر کی قیادت کرنے کی درخواست کی۔ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے پہلے پہل تو انکار کیا لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اصرار پر مجاہدین کی قیادت سنبھالنے پر تیار ہو گئے۔ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے قیادت سنبھالتے ہی پہلے روز لشکر کی ترتیب بدل دی اور چند مجاہدین کو عقب میں گھوڑے دوڑانے پر مامور کیا۔ فضا گرد و غبار سے اٹ گئی۔ رومی لشکر یہ سمجھ کر خوف زدہ ہو گیا کہ مسلمانوں کی مدد کے لیے نیا لشکر پہنچ گیا ہے اور اس کے حوصلے پست ہونا شروع ہو گئے۔ یہ دیکھ کر خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے مجاہدین کو پیچھے سرکانا شروع کر دیا اور مجاہدین کو رومی لشکر سے بچا کر لے آئے۔ اس جنگ میں خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے نو تلواریں ٹوٹیں۔

خالد بن ولید رضی اللہ عنہ قبیلہ بنو مخزوم کے سردار ولید بن مغیرہ کے گھر پیدا ہوئے۔ آپ رضی اللہ عنہ بچپن سے ہی نہایت پھرتیلے اور بہادر تھے۔ بدر سے لے کر حدیبیہ تک لشکر قریش کے سپہ

سالار رہے۔ اس کے بعد آپ رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کر لیا۔ ان کے اسلام قبول کرنے کا واقعہ نہایت دلچسپ ہے۔

طبقات ابن سعد میں حارث بن ہشام کے حوالے سے منقول ہے' فرماتے ہیں کہ میں نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ اسلام قبول کرنے سے پہلے میں تقریباً ہر معرکے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں آیا۔ لیکن ہر مرتبہ آپ کا رعب و دبدبہ میرے دل پر طاری ہوا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے اسلام کی محبت میرے دل میں پیدا ہوگئی۔ حدیبیہ میں قریش سے مصالحت کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ہمراہ مدینہ واپس چلے گئے تو میں نے سوچا اب کیا ہوگا؟

میرے دل میں طرح طرح کے خیالات آنے لگے یہاں تک کہ میرے بھائی کا ایک خط مجھے موصول ہوا جو اسلام قبول کر چکا تھا۔ میرے بھائی نے مجھے لکھا ''بھائی جان! میرے آقا نے ایک روز مجھ سے پوچھا خالد کہاں ہے؟ میں نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن ضرور ایسا آئے گا جب میرا بھائی آپ کے قدموں میں آئے گا۔'' اس خط سے میرے دل میں اسلام قبول کرنے کی رغبت ہوئی اور مجھے دلی خوشی ہوئی۔ میں نے عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ سے مدینہ جانے کی خواہش کا اظہار کیا تو وہ بھی میرے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو گئے۔ سفر کے دوران عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ بھی چلے آرہے تھے۔ میں نے اسے خوش آمدید کہا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہاں جارہے ہو؟ میں نے کہا اسلام قبول کرنے کے لیے مدینہ جارہا ہوں۔ میں نے اس سے یہی سوال پوچھا تو اس نے بھی مجھے یہی جواب دیا۔ ہم تینوں یکم صفر 8 ہجری کو بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام عرض کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کا جواب دیا۔ میں نے کلمہ طیبہ پڑھ کر اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے محبت بھرے انداز میں ارشاد فرمایا:

''خالد! تمہاری عقل و دانش اور فہم وفراست کی بنا پر مجھے بہت امید تھی کہ تم ایک نہ ایک دن ضرور اسلام قبول کر لو گے۔''

میں نے عرض کی یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے لیے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کیجیے کہ وہ

میرا یہ گناہ معاف کر دے جو میں بزور شمشیر لوگوں کو راہ اسلام سے روکتا رہا۔ آپ ﷺ نے میری یہ پریشانی دیکھتے ہوئے ارشاد فرمایا: خالد! اسلام قبول کرنے سے پہلے گناہ خود ہی مٹ جاتے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ اس کے باوجود میرے لیے دعا کیجیے۔ آپ ﷺ نے میرے حق میں دعا کی۔ اس کے بعد عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ اور عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا۔

اسلام قبول کرنے کے بعد موتہ کے میدان میں خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے سپاہی کی حیثیت سے شرکت کی۔ اس جنگ میں تین جرنیلوں کی شہادت کے بعد لشکر کی قیادت آپ رضی اللہ عنہ کے سپرد ہوئی۔ مجاہدین صرف تین ہزار تھے جبکہ دشمن فوج کی تعداد دو لاکھ تھی۔ غزوہ موتہ کے بعد حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے غزوہ مکہ میں شرکت کی۔ اس معرکے میں رسول اکرم ﷺ نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو بنو سلیم، بنو خزیمہ، بنو غفار اور جہینہ نامی قبیلوں کا قائد مقرر کیا اور مکہ کے بالائی علاقے کی جانب سے شہر میں داخل ہونے کا حکم دیا اور کہا کہ اگر کوئی راستہ روکے تو تمہیں لڑنے کی اجازت ہے۔ اس موقع پر مسلمانوں کی تعداد دس ہزار تھی۔ عکرمہ بن ابی جہل، صفوان بن امیہ اور سہل بن عمرو نے مقام خندمہ پر اس دستے کا راستہ روکنے کی کوشش کی جس کی قیادت حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے پاس تھی۔ جب انہوں نے مقابلہ شروع کیا تو دشمن پسپا ہو گیا۔ اس مقابلے میں بنو بکر اور بنو ہذیل کے چار آدمی مارے گئے جبکہ دو مسلمان شہید ہوئے۔ اس کے علاوہ باقی سارا لشکر کسی لڑائی کے بغیر مکہ مکرمہ میں 20 رمضان المبارک بروز جمعہ 8 ہجری کو داخل ہوا۔ اس موقع پر رسول کریم ﷺ نے عام معافی کا اعلان کیا۔

فتح مکہ کے پانچ دن بعد ہی حضرت محمد ﷺ نے تیس مجاہدین کا ایک لشکر خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی قیادت میں مقام نخلہ کی جانب روانہ کیا تاکہ وہ مشرکین کے ملجا عزیٰ نامی بت کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے شرک کے ایک اہم مقام کا قلع قمع کر سکے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے وہاں پہنچ کر اس بت کے پرخچے اڑا دیئے۔ اس وقت وہ اپنی زبان سے کہہ رہے تھے کہ اے عزیٰ میں تجھے جھٹلاتا ہوں، تیرے اندر ذرہ برابر بھی تقدس نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تجھے ذلیل و رسوا کیا ہے۔ اسے توڑ کر بعد میں آگ لگا دی گئی۔

فتح مکہ کے بعد خاتم النبیین ﷺ ...

لیے مختلف اطراف میں تبلیغی وفود میں روانہ کیے۔ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی قیادت میں تبلیغی وفد بنو خزیمہ کی جانب روانہ کیا۔ اس کے متعلق یہ مشہور ہو چکا تھا کہ یہ پورا قبیلہ مسلمان ہو گیا ہے۔ جب قبیلے کے سرداروں نے دیکھا کہ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور کچھ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بستی کی طرف آ رہے ہیں تو یہ بھی ہاتھوں میں ہتھیار پکڑے بستی سے باہر نکل آئے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا کہ کیا تم ابھی مسلمان نہیں ہوئے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہم صابی ہیں۔ یہ سن کر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے تلوار نکال لی۔ ان میں سے کچھ مارے گئے اور کچھ گرفتار کر لیے گئے۔ قیدیوں کو دوسرے روز قتل کرنے کا حکم دیا گیا۔ اس واقعہ کی اطلاع جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی تو آپ کو دلی صدمہ ہوا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے علی رضی اللہ عنہ کو بنو خزیمہ کی طرف کثیر مال و زر دے کر بھیجا تاکہ انہیں خون بہا دے کر راضی کریں۔

حنین ایک وادی کا نام ہے۔ جس کی جانب فتح مکہ کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارادہ کیا۔ اس میں لشکر اسلام کی تعداد بارہ ہزار تھی جبکہ دشمن کی تعداد چار ہزار تھی۔ اس غزوہ میں مہاجرین کی قیادت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے سپرد کی گئی۔ حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ کو قبیلہ اوس، حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو قبیلہ خزرج اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو قبیلہ بنو سلیم کا سالار بنایا گیا۔ قبیلہ بنو سلیم کو مقدمۃ الجیش کے طور پر پہلے روانہ کیا گیا۔ دشمن کی تعداد دیکھ کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فتح کو یقینی سمجھنے لگے۔ اللہ تعالیٰ کو یہ انداز پسند نہ آیا۔ اس منظر کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں یوں بیان کیا ہے۔ ترجمہ: اور اللہ نے بہت سے مواقع پر تمہاری مدد کی اور حنین کے دن جبکہ تمہیں اپنی کثرت پر ناز تھا تو وہ تمہارے کچھ کام نہ آئی اور زمین باوجود فراخی کے تم پر تنگ ہو گئی پھر تم پیٹھ پھیر کر بھاگے پھر اللہ نے رسول اور مومنین پر تسکین نازل کی اور فرشتوں کے لشکر اتارے جنہیں تم نہیں دیکھتے تھے اور عذاب دیا ان لوگوں کو جنہوں نے کفر کیا اور یہی سزا ہے کافروں کی۔

قبیلہ ہوازن اور قبیلہ بنو ثقیف کے تجربہ کار جنگجو راستے میں گھات لگائے بیٹھے تھے۔ جونہی خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اپنا دستہ لے کر یہاں پہنچے تو ان دونوں قبیلوں کے جوانوں نے اس

دستہ پر تیروں سے حملہ کر دیا جس سے ان کے پاؤں اکھڑ گئے۔ دشمن کے ایک اور زوردار حملے کی وجہ سے لشکر اسلام کے قدم اکھڑ گئے اور وہ پیچھے بھاگ گئے۔ صرف رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور چند مجاہدین اسلام میدان میں رہ گئے۔ ان حالات میں بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پکار رہے تھے۔

''میں اللہ کا نبی ہوں اس میں کوئی شک نہیں میں عبدالمطلب کا فرزند ہوں۔''

عباس رضی اللہ عنہ کی آواز سن کر مجاہدین واپس پلٹے اور دشمن پر زوردار حملہ کیا جس سے میدان جنگ کا نقشہ بدل گیا۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اپنی تلوار کے جوہر دکھائے اور جو بھی سامنے آیا وہ ان کی تلوار سے نہ بچ سکا۔ اس معرکہ میں آپ شدید زخمی ہوئے۔ فتح حاصل کرنے کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی تیمارداری کے لیے تشریف لائے۔ جس سے آپ بے حد خوش ہوئے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے زخموں پر لعاب دہن لگایا جس سے آپ بہت جلد صحت یاب ہو گئے۔

فتح کے بعد ابھی اسلامی لشکر حنین میں ہی تھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ملی کہ شکست خوردہ قبیلے بنو ہوازن کے سرکردہ افراد طائف میں جمع ہو رہے ہیں۔ یہ خبر سن کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم طائف کی طرف بڑھے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو قبیلہ بنو سلیم کا سالار مقرر کیا گیا۔ قبیلہ بنو ہوازن اور بنو ثقیف قلعہ بند ہو گئے۔ اٹھارہ روز کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مشورے پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے محاصرہ ختم کر دیا۔ تھوڑے عرصے کے بعد دونوں قبائل نے اسلام قبول کر لیا۔

قبیلہ بنو مصطلق بنو خزاعہ کی شاخ تھا۔ یہ دوسری ہجری میں اسلام قبول کر چکا تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قبیلے سے زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے ولید بن عقبہ کو ان کے پاس بھیجا۔ جب یہ وہاں پہنچے تو قبیلے کے سردار استقبال کے لیے بستی سے باہر نکل آئے۔ ولید بن عقبہ انہیں اپنی طرف آتا دیکھ کر خوف زدہ ہو گئے اور اس خدشے سے یہ مجھے قتل کرنے کے لیے میری طرف آ رہے ہیں واپس مدینہ کی طرف چلے آئے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی کہ مذکورہ قبیلہ زکوٰۃ دینے سے انکاری ہے۔ یہ سن کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحیح صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی قیادت میں ایک وفد قبیلہ کی طرف بھیجا

خالد بن ولید رضی اللہ عنہ جب وہاں پہنچے تو رات کا وقت تھا۔ آپ نے صحیح صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے صبح سویرے چند افراد کو بھیس بدل کر قبیلہ کی طرف بھیجا۔ انہوں نے واپس آکر بتایا کہ قبیلہ مسلمان ہے۔ ہم نے لوگوں کو نماز پڑھتے دیکھا ہے۔ یہ سن کر آپ نے مسرت کا اظہار کیا اور دن چڑھے بستی میں چلے گئے۔ سرداران سے ملاقات کی اور ان سے زکوٰۃ نہ دینے کی وجہ دریافت کی۔ انہوں نے کہا کہ ہم تو خوش آمدید کہنے کے لیے باہر نکلے تھے لیکن وہ ہمیں دیکھتے ہی ملے بغیر ہی بھاگ نکلے۔ ہم نے اس واقعہ کی اطلاع کے لئے ایک آدمی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھی بھیجا ہوا ہے۔ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ یہ سن کر واپس آگئے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو صحیح صورت حال سے آگاہ کیا۔ تبوک میں قیام کے دوران نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو پانچ سو جوانوں کا دستہ دے کر دومتہ الجندل کی طرف بھیجا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اکیدر بن عبدالمالک شکار کرتے ہوئے ملے گا اسے قتل نہ کرنا بلکہ گرفتار کر کے میرے پاس لے آنا۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اپنے دستے کو لے کر رات کے وقت وہاں پہنچے۔ اکیدر بن عبدالمالک اس وقت اپنی بیوی کے ساتھ مے نوشی میں مصروف تھا۔ اچانک نیل گائے جنگل سے نمودار ہوئی اور قلعے کے دروازے سے ٹکریں مارنے لگی۔ بیوی نے خاوند سے کہا وہ دیکھو تیرا مرغوب شکار چل کر تیرے قریب آچکا ہے جلدی کرو شکار ہاتھ سے جانے نہ پائے۔ شاہ دومتہ الجندل نے اپنے چند خدام اور بھائی حسان کو ہمراہ لیا اور گائے کے تعاقب میں چلا گیا۔ جونہی چند قدم آگے بڑھا حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں نے اس کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ اکیدر کے بھائی نے مقابلہ کیا اور مارا گیا جبکہ اکیدر نے گرفتاری پیش کر دی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے معاف کر دیا اور جزیہ مقرر کر کے اسے امان دے دی اور علاقے کی سرداری اس کے پاس رہنے دی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کئی قبائل نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا۔ اس کے علاوہ کئی افراد نے نبوت کا اعلان کر دیا۔ کئی قبائل مرتد ہو گئے۔ ان حالات میں خلیفہ اسلام ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان تمام فتنوں کی سرکوبی کا ارادہ کر لیا اور گیارہ لشکر ترتیب دیئے اور ان کو مختلف اطراف میں روانہ کیا۔

خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو طلیحہ بن خویلد اور مالک بن نویرہ کی طرف روانہ کیا۔ عکرمہ رضی اللہ عنہ بن ابی جہل کو مسیلمہ کذاب، عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو قضاعہ قبیلے سے نپٹنے کے لیے روانہ کیا۔ شرجیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ پہلے عکرمہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل کر مسیلمہ کذاب کو تہ تیغ کریں اور اس کے بعد حضر موت میں آباد بنوکندہ قبیلے پر حملہ کریں۔ سوید بن مقرن کو یمن میں آباد اہل تہامہ، حذیفہ بن محصن کو عمان کے سردار لقیط بن مالک، طریفہ بن حاضر رضی اللہ عنہ کو بنوسلیم اور بنو ہوازن، علاء بن حضرمی کو بحرین، خالد بن سعید بن عاص رضی اللہ عنہ کو شام، مہاجر بن ابی امیہ کو اسود عنسی اور عرفجہ بن ہرشمہ کو اہل مہرہ کی طرف بھیجا۔

خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے پہلے طلیحہ بن خویلد کا مقابلہ کیا۔ اس نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری کی خبر سنتے ہی نبوت کا دعوٰی کر دیا تھا۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے طلیحہ اور اس کے پیروکاروں کو شکست دی اور اس کے بعد مالک بن نویرہ سے مقابلہ کرنے کے لیے مقام نطاح کا رخ کیا۔ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اس کو بھی شکست فاش دی۔ اس کے بعد آپ کو دربار خلافت میں طلب کیا گیا اور آپ کو ایک لشکر دے کر مسیلمہ کذاب سے مقابلے کے لیے بھیجا۔ اس سے پہلے عکرمہ رضی اللہ عنہ اور شرجیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ اس سے شکست کھا چکے تھے۔ مسیلمہ کو جب خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی آمد کا پتہ چلا تو وہ بھی چالیس ہزار کا لشکر لے کر مقابلے میں آ گیا۔ دونوں فوجوں کے درمیان گھمسان کا رن پڑا، مسیلمہ کا لشکر جم کر لڑ رہا تھا اور کسی بھی طرح پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہ تھا۔ یہ دیکھ کر خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے لشکر کو قبائل کی بنیاد پر تقسیم کیا اور ہر قبیلے کا ایک سالار مقرر کیا۔ اس طرح ہر قبیلے نے جان توڑ کر لڑائی کی۔ مسیلمہ کذاب کا لشکر پسپا ہو کر ایک باغ میں پناہ لینے پر مجبور ہوا۔ باغ کے اندر جاتے ہی انہوں نے دروازہ بند کر لیا۔ دروازہ انتہائی مضبوط تھا جسے توڑنا ناممکن تھا۔ اس صورت حال میں براء بن مالک رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ مجھے اٹھا کر باغ میں پھینک دو۔ جب براء رضی اللہ عنہ اندر گرے تو مسیلمہ کی فوج میں بھگدڑ مچ گئی۔ آپ نے دشمن کی صفوں کو چیرتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔ اس کے بعد لشکر اسلام باغ کے اندر داخل ہو گیا۔ مسیلمہ مارا گیا اور اس کی فوج کے ہزاروں آدمی قتل ہو گئے۔ اس کے بعد مجاہدین یمامہ میں مقیم ہو گئے۔ ابھی یمامہ میں ہی تھے کہ خالد

بن ولید رضی اللہ عنہ کو امیر المومنین ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرف سے عراق اور ایران کی طرف پیش قدمی کا حکم ہوا۔ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اپنے لشکر کو لے کر عراق کی طرف روانہ ہوئے۔ لشکر خالد ابلہ کے مقام پر پہنچا۔ یہیں دیگر کمانڈر بھی خالد رضی اللہ عنہ سے آ ملے۔ لشکر اسلام کی کل تعداد اٹھارہ ہزار تھی۔ ابلہ پر نامکمل سا کنٹرول حاصل کر کے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ بصرہ کی طرف بڑھے۔ بصرہ میں قطبہ بن قتادہ رضی اللہ عنہ اپنے مجاہدین کے ساتھ پہلے سے موجود تھے۔ راستے میں'' قریات'' بانقیا، باروسما اور الیس نامی بستیوں پر مشتمل ایک علاقے پر لشکر اسلام مقیم ہوا۔ یہاں کے سردار بص بہریٰ ابن صلوبا نے ایک ہزار چادروں اور ایک ہزار درہم (دس ہزار دینار) کے جزیہ پر مسلمانوں سے صلح کر لی۔

لشکر خالد اس کے بعد حیرہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب لشکر اسلام یہاں پہنچا تو اس وقت حیرہ پر قبیصہ بن ایاس کی حکومت تھی۔ سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے قبیصہ بن ایاس اور اس کے ساتھیوں کو اسلام کی دعوت دی اور کہا: اگر تم مسلمان ہو جاؤ تو وہ ساری رعایتیں ملیں گی جو دیگر مسلمانوں کو ملتی ہیں۔ انکار ہو تو جزیہ دو۔ بصورت دیگر یاد رکھو میں ایک ایسی قوم کو لے کر آیا ہوں جو موت سے اس قدر زیادہ محبت کرتی ہے جتنی تمہیں زندگی سے بھی نہ ہو۔ قبیصہ کہنے لگا: ہمیں آپ سے لڑنے کی ضرورت نہیں۔ ہم اپنے دین پر قائم رہیں گے اور آپ کو جزیہ دیں گے۔ اس نے 90 ہزار درہم سالانہ پر صلح کر لی۔

خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے جزیے وصول کر کے مدینہ منورہ روانہ کر دیئے۔ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے یہاں کچھ دنوں تک قیام کیا اور جنوبی عراق کے تمام سرداروں، رؤسا اور چوہدریوں کی طرف ایک خط روانہ کیا جس میں انہیں اسلام کی دعوت دی گئی تھی اور عدم قبول کی صورت میں جزیہ اور اس سے انکار کی صورت میں جنگ کی وارننگ دی گئی تھی۔ اس پورے علاقے کی ایرانی فوجوں کا سپہ سالار ہرمز تھا۔ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے ہرمز کو بھی خط لکھا جس میں لکھا تھا کہ اے ہرمز! اسلام قبول کر لو یا اسلامی حکومت کے آگے سر تسلیم خم کرتے ہوئے جزیہ ادا کرنا شروع کر دو ورنہ تجھے ایک قوم سے واسطہ پڑنے والا ہے جسے موت اتنی ہی عزیز ہے جتنی تمہیں زندگی۔

ہرمز یہ خط لے کر کسریٰ کے پاس ایرانی دربار میں حاضر ہوا۔ جب یہ خط ایرانی دربار میں پہنچا تو وہاں ہلچل مچ گئی۔ ایرانی' اسلامی لشکر کا مقابلہ کرنے کے لیے تیاری میں لگ گئے۔ حفیر نامی جگہ پر دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔ لشکر اسلام کی تعداد اٹھارہ ہزار تھی جبکہ مقابلے میں دشمن کا لشکر ایک لاکھ تھا۔ سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے لشکر کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک حصہ کا سالار مثنیٰ رضی اللہ عنہ دوسرے کا عدی بن حاتم الطائی رضی اللہ عنہ جبکہ تیسرے کی قیادت خود سنبھال لی۔ جنگ کے آغاز میں ہرمز نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو مقابلے کا چیلنج کیا۔ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے پہلے ہی وار میں ہرمز کو قتل کر دیا۔ یہ دیکھ کر دونوں فوجیں گتھم گتھا ہوگئیں اور جنگ کا آغاز ہو گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد دشمن کا لشکر پسپا ہونا شروع ہو گیا۔ مسلمانوں نے فرات تک ان کا پیچھا کیا۔

اس جنگ میں دشمن کے تیس ہزار فوجیوں نے اپنے آپ کو زنجیروں میں جکڑ لیا۔ اسی وجہ سے اس جنگ کا نام جنگ ذات السلاسل مشہور ہو گیا۔ اس جنگ میں مجوسیوں کے ستر ہزار آدمی قتل ہو گئے۔ مال غنیمت میں 25 من سونا اور بے شمار اسلحے سمیت ہرمز کی وہ ٹوپی بھی شامل تھی جس کی قیمت ایک لاکھ درہم تھی۔ امیر المومنین ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یہ ٹوپی حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو بطور انعام عطا کی۔ حج سے فارغ ہو کر خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سیدھے حیرہ پہنچے۔ امیر المومنین ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ یہ سن کر بہت ناراض ہوئے اور تنبیہ کی۔ امیر المومنین ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو شام کی طرف جانے کا حکم دیا اور کہا کہ "یرموک" کے مقام پر پہنچ کر دیگر اسلامی لشکر کے ساتھ مل جائیں۔ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حکم پر آدھا لشکر یرموک کے لیے علیحدہ کر لیا۔ کمزور مردوں اور عورتوں کو سیدنا عمیر بن سعد رضی اللہ عنہ کی قیادت میں مدینہ منورہ کی طرف روانہ کر دیا۔ باقی لشکر کو مثنیٰ بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں چھوڑا۔ مقام صندوداء پر دشمن سے مقابلہ ہوا جس کو شکست فاش ہوئی۔ مصیح اور حصید میں بھی دشمن سے مقابلہ ہوا۔ اسے بھی شکست دی۔ مال غنیمت حاصل کیا۔ قرار اور سوی میں بھی دشمن کو شکست دے کر مال غنیمت حاصل کیا۔ آرک نامی قصبے کے باشندوں نے جزیہ پر صلح کر لی۔ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ بہراء کی بستی سوی جا پہنچے اور اس پر حملہ

کر دیا۔ دشمن کو شکست فاش ہوئی اور مال غنیمت حاصل ہوا۔ اس کے بعد اسلامی لشکر رومیوں کو شکست دیتا ہوا آگے بڑھا اور دمشق کا رخ کیا اور اس کا محاصرہ کر لیا۔ سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے شہر کے دروازوں پر ان افسروں کو مامور کیا جو شام کے صوبوں کی فتح پر مامور ہو کر آئے تھے۔ عیسائی محاصرے کی سختی دیکھ کر ہمت ہارے جاتے تھے۔ ان کا یہ خیال تھا کہ اہل عرب ان ممالک کی سردی کو برداشت نہیں کر سکتے اور وہ موسم سرما تک خود بخود چلے جائیں گے۔ لیکن ان کی امید بیکار گئی۔ دوسری طرف خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے ذوالکلاح کو کچھ فوج دے کر دمشق سے ایک منزل کے فاصلے پر متعین کر دیا تھا کہ ادھر سے کوئی مدد آنے نہ پائے۔ انہی دنوں بطریق دمشق کے گھر بیٹا پیدا ہوا جس کی خوشی میں شہر نے خوشی سے جلسے کیے اور کثرت سے شراب نوشی کر کے سو گئے۔ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اس موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے چند بہادر افسروں کو ساتھ لیا اور کمند کے ذریعے دیوار پر چڑھ گئے اور اوپر جا کر رسی کی سیڑھی کمند سے اٹکا کر نیچے پھینک دی۔ اس طریقے سے تھوڑی دیر میں بہت سارے جاں نثار فصیل پر پہنچ گئے۔ خالد رضی اللہ عنہ نے نیچے اتر کر پہلے دربانوں کو قتل کیا۔ پھر دروازے کھول دیئے۔ اسلامی لشکر اندر داخل ہوا اور پہرے کی فوج کو قتل کر دیا۔ عیسائیوں نے یہ دیکھ کر شہر کے دروازے خود کھول دیئے اور ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سے صلح کی درخواست کی۔ سیدنا خالد رضی اللہ عنہ اور ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کا سامنا ہوا۔ خالد رضی اللہ عنہ نے شہر کا جو حصہ فتح کر لیا تھا اگرچہ لڑ کر فتح کیا تھا لیکن چونکہ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے صلح منظور کی تھی اس لیے مفتوحہ علاقے میں بھی صلح کی شرطیں تسلیم کی گئیں۔

دمشق کی فتح کے بعد فحل کے مقام پر مسلمانوں اور رومیوں کے لشکر کا آمنا سامنا ہوا۔ ایک گھنٹہ کی لڑائی کے بعد رومیوں کے چھکے چھوٹ گئے اور وہ میدان جنگ سے بھاگ گئے رومی جو مسلمانوں سے بار بار شکست کھا رہے تھے۔ ہرقل کے پاس پہنچے اور اس سے فریاد کی۔ ہرقل نے چند آدمیوں کو دربار میں طلب کیا اور ان سے مسلمانوں سے شکست کھانے کی وجہ دریافت کی۔ ایک بوڑھے نے اس کا یوں جواب دیا کہ عرب کے اخلاق ہمارے اخلاق سے اچھے ہیں وہ رات کو عبادت کرتے ہیں اور دن کو روزے رکھتے ہیں۔ کسی پر ظلم نہیں کرتے۔ ہمارا یہ حال ہے کہ شراب پیتے ہیں، بدکاریاں کرتے ہیں اور اقرار کی پابندی نہیں کرتے۔ ان

کے کام میں جوش اور استقلال پایا جاتا ہے اور ہمارا ہر کام ہمت اور استقلال سے خالی ہوتا ہے۔ قیصر روم مسلمانوں سے مرعوب ہو چکا تھا اور شام چھوڑنے کا ارادہ کر چکا تھا۔لیکن آنے والے عیسائیوں کی وجہ سے اسے سخت جوش آیا اور اس نے مسلمانوں سے مقابلے کا ارادہ کر لیا۔ اس نے ہر جگہ حکم بھیجا کہ تمام فوجیں ایک تاریخ معینہ تک پہنچ جائیں۔اس کے حکم کی وجہ سے فوجیوں کی کثیر تعداد دارالحکومت میں پہنچ گئی۔

جب ان حالات کی خبر حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کو ہوئی تو آپ نے تمام افسروں کو جمع کیا اور ان سے رائے طلب کی۔ تمام افسروں نے مختلف آراء کا اظہار کیا۔آخر کار اس بات پر اتفاق ہوا کہ حمص کو چھوڑ دیا جائے اور دمشق میں خالد رضی اللہ عنہ کے پاس جایا جائے۔ اس کے بعد حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے عیسائیوں کو جزیہ واپس کیا۔ ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے دمشق میں پہنچ کر تمام افسروں کو جمع کر کے مشورہ کیا۔ یہاں بھی تمام افسروں نے مختلف آراء کا اظہار کیا۔ دوسرے دن ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ یہاں سے روانہ ہوئے اور یرموک میں قیام کیا۔عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ بھی یہیں آکر ملے۔ ادھر رومیوں کی آمد کا سن کر مسلمان گھبرائے جاتے تھے۔ ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک اور قاصد بھیجا۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی جواب میں خط لکھا۔جس دن قاصد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا خط لے کر پہنچا اسی دن عامر بھی ہزار آدمی کے ساتھ پہنچ گئے۔ رومی فوج بھی یرموک میں اتری۔ خالد رضی اللہ عنہ نے جنگ کی تیاری شروع کر دی۔ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو میمنہ اور قباث بن اشیم کو میسرہ پر مقرر کیا اور ہاشم بن عتبہ کو پیدل فوج کا سالار بنایا۔اپنی فوج کے چار حصے کیے۔ ایک کو اپنی کمان میں رکھا اور باقی تین کا سالار قیس بن ھبیرہ، سبرہ بن مسروق اور عمرو بن الطفیل کو مقرر کیا۔ رومیوں کی تعداد دو لاکھ تھی اور ان کی 24 صفیں تھیں۔فوجیں آمنے سامنے آئیں اور ایک رومی صف سے باہر نکلا اور تنہا مقابلے کے لیے چیلنج کیا۔مسلمانوں کی طرف سے قیس بن ہبیرہ نے اس کا مقابلہ کیا اور اسے قتل کر دیا۔عیسائیوں نے خالد رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں الگ الگ فوجیں متعین کی تھیں لیکن ہر فوج نے شکست کھائی۔رات کو باہان نے سرداروں کو جمع کیا اور ان سے کہا کہ مسلمانوں سے صلح کی بات کرنی چاہیے۔ چنانچہ اس نے دوسرے دن ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کے پاس ایک قاصد بھیجا کہ کسی

افسر کو ہمارے پاس صلح کے لیے بھیجا جائے۔ قاصد کا نام جارج تھا وہ شام کے وقت یہاں پہنچا۔ اس نے ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سے چند سوال پوچھنے کے بعد اسلام قبول کر لیا۔ وہ اپنے لشکر میں واپس نہیں جانا چاہتا تھا لیکن ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے اسے اس کے لشکر میں واپس بھیج دیا اور کہا کہ کل اسلام کے سفیر کے ساتھ واپس آ جانا۔ دوسرے دن خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اسلام کے سفیر کی حیثیت سے رومی لشکر میں گئے۔ مترجم کے ذریعے گفتگو شروع ہوئی۔ باہان نے کہا کہ اہل عرب! تمہاری قوم کے لوگ ہمارے ملک میں آ کر آباد ہوئے ہم نے ہمیشہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا۔ ہمارا خیال تھا کہ ان مراعات کا تمام عرب ممنون ہو گا لیکن تم ہمارے ملک پر چڑھ آئے۔ اب تم کو یہ حوصلہ ہوا ہے کہ تم سے بڑھ کر کوئی قوم جاہل اور وحشی نہیں۔ اگر تم یہاں سے چلے جاؤ تو ہم سپہ سالار کو دس ہزار دینار اور افسروں کو ہزار ہزار اور سپاہیوں کو سو سو دینار دیں گے۔

اس کی تقریر کے جواب میں خالد رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یہ سچ ہے کہ ہم نہایت محتاج، تنگ دست اور خانہ بدوش تھے۔ ہماری جہالت کا یہ عالم تھا کہ قوی کمزور کو پیس ڈالتا تھا، بہت سے خدا بنا رکھے تھے اور ان کی پوجا کرتے تھے۔ بالآخر اللہ تعالیٰ کو ہماری حالت پر رحم آیا۔ اس نے ہمارے پاس ایک رسول بھیجا جس نے ہمیں بتایا کہ اللہ کا کوئی شریک نہیں۔ اس نے ہمیں یہ حکم دیا کہ ہم دین اسلام کو تمام دنیا کے سامنے پیش کریں۔ جو اس دین کو مانے گا وہ ہمارا بھائی ہے اور مسلمان ہے۔ جس نے اسے قبول نہ کیا اسے جزیہ دینا ہو گا۔ ہم اس کے حامی اور محافظ ہیں۔ جو ان دونوں سے انکاری ہے اس کے لیے تلوار ہے۔

یہ سن کر باہان نے کہا کہ ہم جزیہ لیتے ہیں دیتے نہیں۔ غرض کوئی معاملہ طے نہیں ہوا اور خالد رضی اللہ عنہ واپس چلے آئے۔ رومیوں نے جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اس سے اگلے دن خالد رضی اللہ عنہ نے نئے سرے سے صف بندی کی اور فوج کو 36 حصوں میں تقسیم کیا اور اسی قدر ہی صفیں قائم کیں۔ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو قلب فوج کا سالار بنایا، میمنہ پر عمرو بن العاص اور شرجیل رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو مقرر کیا اور میسرہ کو یزید بن سفیان کی کمان میں دیا۔ اس کے علاوہ ہر صف پر الگ الگ افسر مقرر کیے۔ اس جنگ میں مسلمانوں کی تعداد کم و بیش ۳۵ ہزار تھی۔

رومیوں کے تیس ہزار آدمیوں نے پاؤں میں بیڑیاں پہن رکھی تھیں۔ جنگ کی ابتداء رومیوں کی طرف سے ہوئی۔ عیسائیوں نے زور وشور سے تیروں سے حملہ کیا۔ مسلمان دیر تک ثابت قدم رہے لیکن حملہ کی شدت برداشت نہ کر سکے اور مسلمانوں کے میمنہ کو پسپا ہونا پڑا۔ جب میمنہ پسپا ہو کر حرم کے خیمہ گاہ کے قریب پہنچا تو عورتوں کو یہ دیکھ کر سخت غصہ آیا۔ انہوں نے خیمہ کی چوبیں اکھاڑ لیں اور کہا کہ اگر ادھر آئے تو چوبوں سے تمہارا سر توڑ دیا جائے گا۔

یہ حالت دیکھ کر معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ گھوڑے سے اترے اور پیدل لڑنے لگے۔ ان کا بیٹا ان کے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ دونوں باپ بیٹا بڑی بے جگری سے لڑے۔ اس طرح مسلمانوں کے قدم سنبھل گئے۔ حجاج اپنے پانچ سو آدمیوں کے ساتھ بھی شامل ہو گئے اور عیسائیوں کے آگے بڑھتے ہوئے قدموں کو روک لیا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ بھی اپنی فوج کو لے کر میدان میں آ گئے اور رومیوں پر زور دار حملہ کر کے ان کی صفیں الٹ کر رکھ دیں۔ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ نے گھوڑا آگے بڑھایا اور کہا کہ میں حالت کفر میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑ چکا ہوں۔ میں آج کیسے پیچھے رہ سکتا ہوں۔ یہ کہہ کر انہوں نے مجاہدین سے کہا کہ تم میں سے کون مرنے پر بیعت کرتا ہے۔ چار سو مسلمانوں نے موت پر بیعت کی۔ ان میں ضرار بن ازد بھی شامل تھے۔ یہ سارے مجاہدین بڑی بے جگری سے لڑے اور ہزاروں رومیوں کو جہنم واصل کر کے شہید ہو گئے۔ سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے حملوں کی وجہ سے رومیوں کی صفیں الٹ گئیں اور انہیں پسپا ہونا پڑا۔ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ عیسائیوں کو پیچھے ہٹاتے ہوئے ان کے سپہ سالار تک پہنچ گئے۔

اس وقت تک لڑائی کے دونوں پہلو برابر تھے۔ اس کے ساتھ ہی قیس بن ھبیرہ عقب سے نکلے اور اس طرح رومیوں پر جھپٹے کہ رومیوں کی صفوں کی صفیں الٹ دیں۔ رومی پسپا ہونے لگے۔ سعید بن زید نے بھی عقب سے نکل کر حملہ کر دیا۔ رومیوں کو دور تک پیچھے ہٹنا پڑا یہاں تک کہ وہ نالے کے کنارے تک آ گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں رومیوں کی لاشوں سے نالہ بھر گیا۔ اس معرکے میں تین ہزار مسلمانوں نے جام شہادت نوش کیا جبکہ ستر ہزار رومی مسلمانوں کے ہاتھوں جہنم واصل ہوئے۔ قیصر روم کو انطاکیہ میں شکست کی خبر ملی تو اس نے

قسطنطیہ جانے کی تیاری کر لی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو جب فتح کی خبر ملی تو آپ نے سجدہ میں گر کر اللہ کا شکر ادا کیا۔ معرکہ یرموک میں ایک رومی جرنیل جرجہ نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد صرف دو رکعت نماز پڑھنے کا موقع ملا۔ اس کے بعد اسی معرکہ میں جام شہادت نوش کیا۔ اس کے بعد عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کے ماتحت کر دیا۔ مسلمانوں کو اس وقت تک یقین ہو گیا تھا کہ مسلمانوں کو جنگ میں فتوحات خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ امیر المومنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے خالد رضی اللہ عنہ کو اس لیے معزول کیا تاکہ مسلمانوں کو یقین آ جائے کہ جو کچھ کرتا ہے اللہ کرتا ہے۔

ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ یرموک سے حمص کو چلے گئے اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو قنسرین روانہ کیا۔ شہر والوں نے مقابلہ کرنے کے بعد جزیہ پر صلح کر لی۔ یہاں پر آباد تمام قبائل نے ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کی دعوت پر اسلام قبول کر لیا۔

اس کے بعد حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ حلب کی طرف روانہ ہوئے۔ شہر سے باہر آباد قبائل نے جزیہ پر صلح کر لی اور بعد میں اسلام قبول کر لیا۔ چند دنوں کے بعد حلب پر بھی مسلمانوں کا کنٹرول ہو گیا۔ انطاکیہ کے بھی عیسائیوں نے جزیہ پر صلح کر لی۔ اس کے بعد ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ نے مختلف اطراف میں لشکر روانہ کیے۔ خالد بن ولید رضی اللہ نے مرعش پر حملہ کیا اور اس شرط پر صلح ہوئی کہ عیسائی شہر چھوڑ کر چلے جائیں۔

یہاں سے فارغ ہو کر حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ نے بیت المقدس کا رخ کیا۔ یہاں کے عیسائیوں نے یہ شرط رکھی کہ امیر المومنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ خود آ کر معاہدہ کریں۔ چنانچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بیت المقدس کا سفر کیا۔ شام کے مقام پر خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ نے استقبال کیا۔ جابیہ کے مقام پر عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے دیر تک قیام کیا اور معاہدہ بھی یہاں لکھا گیا۔ یرموک میں شکست کھانے کے بعد جزیرہ والوں نے قیصر روم کو خط لکھا کہ مسلمانوں سے لڑنے کی دوبارہ کوشش کرو ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ قیصر روم نے ایک کثیر فوج حمص کی طرف روانہ کی۔ جزیرہ والے بھی تیس ہزار کا لشکر لے کر شام کی طرف بڑھے۔ ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ بھی فوجوں کو لے کر حمص کی طرف بڑھے۔ ساتھ ہی حضرت

فاروق رضی اللہ عنہ کو تمام حالات کی اطلاع دی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے آٹھ بڑے شہروں میں فوجی چھاؤنیاں قائم کر رکھی تھیں اور ہر جگہ چار چار ہزار گھوڑے موجود رہتے تھے۔ جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو خط ملا تو انہوں نے قعقاع بن عمرو رضی اللہ عنہ کو (جو کوفہ میں مقیم تھے) چار ہزار سواروں کے ساتھ حمص پہنچنے کا حکم کیا۔ سہل بن عدی کو جزیرہ میں پہنچ کر جزیرہ والوں کو حمص کی طرف جانے سے روکنے کا حکم دیا۔ اسی طرف عبداللہ بن عتبان کو نصیبین کی طرف روانہ کیا۔ عرب کے کچھ قبائل بھی عیسائیوں کی مدد کو آئے۔ اب یہ قبائل پچھتانے لگے اور انہوں نے خفیہ طور پر خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو پیغام بھیجا کہ اگر تم پسند کرو تو ہم اسی وقت یا عین موقع پر عیسائیوں سے الگ ہو جائیں۔ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ اب میں کسی دوسرے شخص (ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ) کے ہاتھ میں ہوں اور وہ حملہ کرنا پسند نہیں کرتا۔ اس کے بعد فوج نے بھی ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سے حملہ کرنے کی اجازت مانگنی شروع کر دی۔ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے ان کی رائے معلوم کی تو انہوں نے جواب دیا کہ میری رائے یہ ہے کہ عیسائی ہمیشہ کثرت کے بل بوتے پر لڑتے ہیں۔ اب کثرت بھی نہیں رہی لہٰذا اب کسی بات کا اندیشہ نہیں۔ چونکہ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو خود بھی اطمینان نہ تھا اس لیے انہوں نے فوج کو جمع کر کے حملے کا حکم دے دیا۔ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ قلب لشکر اور خالد و عباس رضی اللہ عنہم میمنہ و میسرہ کو لے کر آگے بڑھے۔ مسلمانوں کے حملہ کے ساتھ عرب کے قبائل بھی پیچھے ہٹ گئے اور عیسائیوں کی قوت ٹوٹ گئی۔ عیسائی تھوڑی دیر تک لڑنے کے بعد بھاگ گئے۔

خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اپنی زندگی میں مسلمانوں کی طرف سے بیسیوں معرکوں میں شرکت کی اور ہر معرکہ میں شہادت کی آرزو لے کر شریک ہوئے لیکن انہیں میدان جہاد میں شہادت کی موت نصیب نہ ہوئی۔ ہر معرکہ میں انہوں نے فتح حاصل کی اور کفار کا غرور خاک میں ملایا۔ عالم کفران کا نام سن کر کانپ جاتے تھے۔ ان کے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جس پر تلوار کے زخم کا نشان نہ ہو۔



ابوعبیدہ بن جراح رض

ہر امت کا ایک امین ہوتا ہے اور میری امت کے امین ابو عبیدہ ابن الجراح ہیں۔ فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

دنیا میں جنت کی بشارت پانے والے عظیم سپہ سالار

یہ ایک پررونق نورانی مجلس تھی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ساتھ تشریف فرما تھے اور ان کے پاس اہل نجران کا ایک گروہ بیٹھا تھا۔ یہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اسلام قبول کرنے کی غرض سے آئے تھے۔ قبول اسلام کے بعد اہل نجران نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے جو چاہیں خراج لے لیں، ہم ہمیشہ دیتے رہیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی امانت دار آدمی کو ہمارے ساتھ کر دیجیے۔ جو ہمیں دین کی تعلیم بھی دے اور صدقات کی وصولی کا فریضہ بھی سرانجام دے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا! ”میں تمہارے ساتھ ایسے امین کو بھیجوں گا جو انتہا درجہ امانت دار ہے۔“

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشادگرامی سن کر وہاں پر موجود تمام صحابہ نہایت شوق و تجسس سے دیکھنے لگے کہ یہ شرف کس خوش بخت کو نصیب ہوتا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک جانثار کی طرف شفقت بھری نظر سے دیکھا اور ان کا نام لے کر فرمایا ”کھڑے ہو جاؤ۔“ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان صاحب کی طرف اشارہ کرتے

ہوئے اہل نجران سے مخاطب ہو کر کہا ''یہ اس امت کے امین ہیں۔''

یہ صحابی رسول جن کو زبان نبوت سے ''امین الامت'' کا عظیم لقب مرحمت ہوا۔سیدنا ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ تھے۔

سیدنا ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کا اصل نام عامر تھا۔مگر اپنی کنیت ابوعبیدہ سے شہرت پائی۔ ان کے والد کا نام عبداللہ تھا۔لیکن اپنے دادا کی نسبت سے ابن الجراح مشہور ہوئے۔

۲ ہجری کو میدان بدر میں حق و باطل کا عظیم معرکہ برپا ہوا۔دونوں طرف سے جنگ شباب پر تھی۔باطل کی کوشش تھی کہ وہ حق کا چراغ بجھا دے۔لیکن جس چراغ کو اللہ تعالیٰ کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے سینوں کے اندر روشن کیا تھا وہ باطل سے کب بجھنے والا تھا۔ سیدنا ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ اس معرکہ میں شریک بے جگری سے لڑ رہے تھے۔آپ کا والدہ عبداللہ کفار کی جانب سے لڑ رہا تھا۔بیٹے کے اسلام لانے پر وہ سخت برگشتہ و مضطرب تھا۔تمام رشتوں کو بھلا کر وہ بیٹے کا جانی دشمن بن گیا تھا۔اب اسے موقعہ ملا تھا کہ بیٹے سے اس کے اسلام قبول کرنے کا بدلہ لے سکے۔وہ تاک تاک کر آپ کو نشانہ بنا رہا تھا۔لیکن ہر بار بیٹے نے درگزر سے کام لیا۔جب دیکھا کہ وہ باز نہیں آتا تو اسلامی حمیت نسبتی رشتے پر غالب آ گئی۔آپ نے ایسا وار کیا کہ باپ کو خون میں نہلا دیا۔اسلامی جوش اور مذہبی وارفتگی کی ایسی مثال تھی جو چشم فلک نے شاید اس سے قبل نہ دیکھی ہوگی۔ان عظیم جذبوں کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے بے حد پسند فرمایا اور سورہ مجادلہ میں یوں ارشاد فرمایا

''جو لوگ اللہ تعالیٰ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں تم ان کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں سے دوستی کرتے ہوئے نہ دیکھو گے،خواہ ان کے باپ بیٹے یا بھائی یا خاندان کے لوگ ہوں۔یہ وہ لوگ ہیں جن کے قلوب میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایمان تحریر کر دیا ہے اور فیصلہ غیبی سے ان کی مدد کی ہے۔''

سیدنا ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ جب زندگی کی ستائیس بہاریں دیکھ چکے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان بعثت فرمایا۔توحید کی آواز نے مشرکین قریش میں ہل چل مچا دی۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے یار غار سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ درپردہ لوگوں کو دعوت حق دیتے تھے۔سیدنا ابوعبیدہ بن

جراح رضی اللہ عنہ پر ان کی باتوں کا بے حد اثر ہوا۔ زیادہ سوچ و بچار سے کام نہیں لیا۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں یقین تھا کہ جس چیز کی دعوت دے رہے ہیں وہی حق ہے۔ ان دنوں ابھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دارارقم میں تشریف نہیں لے گئے تھے کہ سیدنا ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ حاضر بارگاہ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم ہوئے۔ اسی دن سیدنا عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ بھی آئے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی کا سنہری طوق گلے میں پہن لیا۔

جب کوئی شخص حلقہ بگوش اسلام ہوتا تھا تو تمام لوگ اس کے دشمن بن جاتے تھے اور تعلق ورشتوں کو بالائے طاق رکھ کر اس پر ظلم و استبداد کے دروازے کھول دیتے تھے۔ منشاء و مقصود یہ ہوتا تھا کہ اذیتوں سے تنگ آ کر بت پرستی کی طرف واپس لوٹ آئے مگر ان کو یہ خبر نہ تھی کہ دین حق میں شامل ہونے کے بعد مصائب و آلام کا برداشت کرنا اس پر آسان ہو جاتا تھا۔ سیدنا ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ پر بھی انہوں نے مشق ستم کی۔ دو مرتبہ ملک شام کی طرف ہجرت فرمائی۔ آخری مرتبہ صحابہ کرام کے ہمراہ مدینہ کی جانب جب ہجرت کی تو وہاں سیدہ کلثوم بن الہدم کے ہاں قیام پذیر ہوئے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کا بھائی چارہ سیدنا سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ سے کرا دیا۔

تمام غزوات و مشاہد میں آپ نے بڑی گرم جوشی و جاں فروشی سے شرکت کی۔ غزوہ احد میں عبداللہ بن قیہ کے حملہ سے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا روئے انور زخمی ہو گیا۔ ذرہ کی دو کڑیاں رخسار مبارک میں کھب گئی تھیں۔ شدید تکلیف تھی۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بڑی تیزی سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف گئے۔ دوسری طرف سیدنا ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ بھاگتے ہوئے آئے، جیسے ہوا میں اڑ رہے ہوں۔

"میں آپ کو اللہ تعالیٰ کی قسم دیتا ہوں مجھے اجازت دیں کہ میں سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک گال سے ذرہ کے حلقے نکالوں۔"

سیدنا ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ نے ملتجیانہ انداز میں سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کہا۔ حالانکہ اس سعادت سے وہ خود بہرہ ور ہونا چاہتے تھے۔ انہوں نے اجازت دے دی۔ سیدنا ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ نے پہلے ذرہ کے ایک حلقہ پر اپنے دانت رکھ کر پوری طاقت

وقوت سے اسے باہر کھینچا۔ اس میں آپ کا ایک دانت شہید ہوگیا۔ ذرہ کے دوسرے حلقے کو دانتوں سے زور لگا کر باہر نکالا تو دوسرا دانت بھی اپنے محبوب ﷺ پر قربان ہوگیا۔ ذرہ کے حلقے نکلنے کی دیر تھی کہ خون بہہ نکلا۔ سیدنا مالک بن سنان رضی اللہ عنہ جو اس وقت پاس کھڑے تھے اس خون کو پیتے اورزخم پر منہ رکھ کر چوستے تھے۔ قریب کھڑے دوسرے عشاق نے پوچھا ''ملک رضی اللہ عنہ بن سنان ! تم خون پیتے ہو۔؟''

''ہاں۔ رسول اللہ ﷺ کا خون اقدس شربت کی طرح پیتا ہوں۔''

غزوہ احزاب اور بنو قریظہ میں بھی آپ نے مثالی جان نثاری کا مظاہرہ کیا۔ یہی آرزو تھی کہ کسی طرح نبی اکرم ﷺ راضی ہوجائیں کیونکہ اللہ کو راضی کرنے کا یہی واحد طریقہ تھا۔

ربیع الاول ۶ ہجری میں نبی اکرم ﷺ آپ کو بنو ثعلبہ کی سرکوبی کے لیے ذی القصہ کی طرف روانہ فرمایا۔ آپ کی ماتحتی میں چالیس سرفروش تھے۔ بنی ثعلبہ وانمارا اور محارب کی بستیاں بے آب وگیاہ ہوگئیں تو انہوں نے مدینے کے مویشی لوٹ لینے کا فیصلہ کیا۔ جو مدینے سے سات میل دور بیضاک مقام پر چرتے تھے۔ ان کی سرکوبی مقصود تھی۔ سیدنا ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ تعمیل ارشاد میں مغرب کی نماز کے بعد ذی القصہ کی طرف چل پڑے۔ راتوں رات منزل مقصود پر پہنچ گئے۔ جب صبح کا چہرہ ابھی زیادہ تاباں نہیں ہوا تھا کہ آپ نے بنی ثعلبہ پر حملہ کردیا۔ وہ خوف اور ذر سے بھاگ کر پہاڑوں میں جا کر چھپ گئے۔ صرف ایک شخص ہاتھ آگا جس نے اسلام قبول کرلیا۔ اس مہم میں کچھ اونٹ اوردوسرا مال واسباب ہاتھ لگا جسے آپ نے لاکر بارگاہ نبوت میں پیش کردیا۔

رجب المرجب ۸ ہجری میں نبی اکرم ﷺ نے تین سو مجاہدین پر آپ کو امیر بنا کر قریش کے قافلہ کی حفاظت اور قبیلہ جہنیہ کو روکنے کے لیے بھیجا۔ حکم سیف البحر تک جانے کا تھا کیونکہ جہنیہ قبیلہ ساحل سمندر پر آباد تھا۔ مدینہ سے یہ مقام پانچ دن کی مسافت پر تھا۔ اس سریہ میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اور جابر رضی اللہ عنہ جیسے صحابہ بھی موجود تھے۔ بوقت روانگی امیر العسکر کو بطور توشہ کھجوروں کی ایک تھیلی عطا کی گئی جس میں سے آپ نے تمام مجاہدین کو ایک ایک مٹھی خرما دے دیئے۔ جب راستے میں کھانے کے لیے کوئی چیز نہ رہی تو لشکری اپنی کمانوں سے

درختوں کے پتے توڑ کر کھاتے تھے۔اس لحاظ سے اس کا جیش الخبط (لشکر برگ) نام پڑ گیا۔ جب سمندر کے کنارے یہ مجاہدین اسلام پہنچے تو کھانے کو کچھ نہ تھا۔سب صبر وشکر و رضا کے پیکر بنے ہوئے تھے۔اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ان جانثاروں کے لیے سمندر کی لہروں کو حکم دیا۔انہوں نے ایک بہت بڑی مچھلی کو ساحل پر پھینک دیا۔اس کی لمبائی ساٹھ گز تھی اور اس کی آنکھ کے حلقے میں تیرہ آدمی بیٹھ سکتے تھے۔سیدنا ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ اونٹ پر سوار اس مچھلی کی پسلی کے نیچے سے گزر گئے۔اس لحاظ سے اسے سریہ سلف البحر بھی کہتے ہیں۔ اٹھارہ دن تک مجاہدین شکم سیر ہو کر مچھلی کا گوشت کھاتے رہے۔اس کی چربی کو جسم پر مل کر نہاتے رہے یہاں تک کہ خوب توانا ہو گئے اور کامیاب وکامران مدینہ منورہ واپس لوٹ آئے۔

جمادی الآخر ۸ ہجری میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین سو مجاہدین پر سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو امیر مقرر فرما کر ذات السلاسل کی طرف بھیجا۔ جب پہنچے تو پتہ چلا کہ غنیم کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ کمک کے لیے لکھ بھیجا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کو دوسو مجاہدین پر امیر بنا کر بھیجا۔ان میں سیدنا شیخین رضی اللہ عنہما جیسی عظیم ہستیاں شامل تھیں۔سیدنا ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں سیدن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو سپہ سالاری کا حق نہ تھا۔لیکن آپ نے اصرار نہیں فرمایا اور جس مقصد سے وہاں تشریف لے گئے تھے اسے سرانجام دینے کے بعد مدینہ منورہ واپس لوٹ آئے۔

ایک مرتبہ آپ کو اہل بحرین سے جزیہ کی رقم وصول کر کے لانے پر مامور فرمایا۔آپ جب واپس تشریف لائے تو اس روز نماز فجر کا غیر معمولی ہجوم تھا۔نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسکراتے ہوئے ارشاد فرمایا''شاید تم لوگوں کو ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کے آنے کی خبر ہوگئی ہے۔'' جی ہاں! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ''بشارت ہو آج تمہیں خوش کر دوں گا۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اور پھر گویا ہوئے۔

''لیکن اللہ کی قسم! میں تمہارے فقر و افلاس سے نہیں ڈرتا۔خوف ہے کہ پہلی امتوں کی طرح تم پر دنیا کشادہ ہو جائے گی اور جس طرح ان کو باہمی مناقشت اور حسد

وطمع نے ہلاک کر دیا تھا تمہیں بھی ہلاک کر دے گی۔“

حجۃ الوداع میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔اس کے تین ماہ بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال پر جب سقیفہ بنوساعدہ میں انتخاب خلیفہ کا مسئلہ زیر بحث آیا تھا تو اس وقت سیدنا ابوعبیدہؓ نے بڑا اہم کردار ادا کیا تھا۔ انصاری کو مخاطب کر کے فرمایا ”تم نے امداد واعانت کا وعدہ کیا تھا لہٰذا اس پر حرف نہ آنے دو۔“

اس وقت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے علاوہ سیدنا ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کا نام بھی خلافت کے لیے پیش کیا لیکن ہر دو بزرگوں نے آگے بڑھ کر سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ مبارک پر بیعت کر لی۔

عہد صدیقی میں ملک شام پر کئی اطراف سے لشکر کشی کی گئی۔حمص کی طرف سے سیدنا ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کو دمشق کی جانب،سیدنا یزید بن سفیان رضی اللہ عنہ کو سوئے اردن، سیدنا شرجیل رضی اللہ عنہ بن حسنہ کو ر ا اور بطرف فلسطین سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو روانہ کیا گیا۔لیکن ان سب پر سیدنا ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کو سپہ سالار اعظم تعینات کیا گیا۔عرب کی سرحد سے باہر قدم قدم پر رومیوں سے آمنا سامنا ہوا لیکن آپ نے ان کو مار بھگایا۔ان کی کثرت کا اندازہ لگا کر خلیفۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم سیدنا صدیق رضی اللہ عنہ کو کمک کے لیے لکھ بھیجا۔انہوں نے سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو عراقی مہم چھوڑ کر شام جانے کا حکم دیا۔ سیدنا ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ نے تمام اسلامی فوج کو یکجا ہونے کا حکم دیا اور پھر متحدہ فوج نے بصرے فحل اور اجنادین کو فتح کرنے کے بعد دمشق کا محاصرہ کر لیا۔ اسی دوران میں سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اپنے خالق کے پاس تشریف لے گئے تو ان کی جگہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ خلیفہ مقرر ہوئے۔ انہیں دنوں دمشق کے بطریق کے ہاں ایک لڑکے نے جنم لیا اس خوشی میں لوگوں نے شرابیں پی کر بدمستی کی اور بے سدھ پڑ کر سو رہے۔سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ مع چند جانبازوں کے فصیل شہر پھاند کر اندر داخل ہو گئے اور دروازے کھول دیئے۔فوج اندر داخل ہو گئی۔اس آفت ناگہانی کا صرف ایک ہی حل تھا کہ سپہ سالار اعظم سیدنا ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ سے صلح کی درخواست کریں۔آپ اس وقت دوسری طرف تھے اور اس صورتحال کا علم نہ تھا کہ مسلمان شہر کے اندر داخل ہو چکے

ہیں۔انہوں نے صلح قبول کر لی۔سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور سیدنا ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کی فوجوں کی جب دمشق کے بازار کے وسط میں ملاقات ہوئی تو حقیقت حال منکشف ہوئی چونکہ سیدنا عبیدہ رضی اللہ عنہ مصالحت کر چکے تھے۔اس لیے دمشق کی فتح مصالحانہ قرار دی گئی۔کسی کے ماتھے پر بل تک نہ پڑا کیونکہ اسلامی تعلیم اور اطاعت امیر کا یہی تقاضا تھا۔

رومیوں کو بڑا دکھ تھا کہ دمشق ان کے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔انہوں نے فوجوں کو اردن کے شہر میں جمع کیا لیکن مسلمانوں کے رعب و دبدبہ اور عزم و جاں نثاری کے جذبوں کو دیکھ چکے تھے۔لہٰذا گفت وشنید کے لیے اپنا قاصد براہ راست سیدنا ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا۔

رومی قاصد حیران و پریشان اسلامی لشکر میں پھر رہا تھا۔ہر شخص کو ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے دیکھ کر بڑا پریشان ہوا۔افسر اور ماتحت میں کوئی تمیز نظر نہیں آتی تھی جو کہ ان کے ہاں بڑی نمایاں تھی آخر کار اس نے ایک مسلمان سے پوچھا۔

''تمہارا سردار کون ہے؟''

''سامنے زمین پر بیٹھے ہیں۔''

انگلی کے اشارے سے اسے بتایا تو وہ اور ورطہ حیرت میں ڈوب گیا۔یقین نہیں آتا تھا کہ اسلامی فوجوں کا سپہ سالار اعظم ایک عام آدمی کی طرح زمین پر بیٹھا ہوگا۔مزید تسلی کرنے کے بعد وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔

''کون ہو؟'' آپ نے پوچھا۔

''میں رومی قاصد ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

''کس لیے آئے ہو؟'' آپ نے دریافت کیا۔

''مصالحت کے لیے بھیجا گیا ہے۔ہمارا سردار کہتا ہے کہ اگر آپ یہاں سے چلے جائیں تو فی کس دو دو اشرفیاں دیں گے۔''

''ہرگز نہیں۔''

سیدنا ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ نے دوٹوک فیصلہ کرتے ہوئے فرمایا اورخون ریز معرکے کے بعد اردن فتح کرلیا۔

حمص اوردوسرے شہر فتح کرنے کے بعد آپ لاذقیہ پہنچے۔ یہ بڑا مضبوط و مستحکم شہر تھا۔ اس کو فتح کرنے کے لیے آپ نے میدان میں بہت سے پوشیدہ غار کھدوائے اور بظاہر محاصرہ چھوڑ کر حمص کی طرف روانہ ہوگئے۔ اہل شہر نے دیکھا تو اطمینان کا سانس لیا اور کاروبار کے لیے شہر کے دروازے کھول دیئے۔لیکن آپ اسی شب واپس آ کر ان پوشیدہ غاروں میں چھپ گئے اور صبح جب لوگ اپنے کاروبار میں مصروف تھے کہ شہر میں داخل ہوکر اسلام کا جھنڈا بلند کردیا۔

مسلسل شکستیں کھانے کے بعد رومیوں نے ہرقل شاہ روم سے فریاد کی تو اس کی غیرت جاگ اٹھی۔ پوری قوت سے مسلمانوں کو پسپا کرنے کے لیے اس نے تمام ممالک کو فوجیں بھیجنے کے لیے لکھ بھیجا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انطاکیہ میں فوجوں کا طوفان امڈ پڑا۔ سیدنا ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ نے ایک بار پھر تمام افواج اسلامی کو دمشق میں جمع ہونے کے لیے کہا۔ صلاح مشورہ کے بعد طے پایا کہ یرموک میں مورچہ بندی کی جائے۔ان حالات میں مفتوحہ علاقوں کے عیسائیوں کی حفاظت ممکن نہ تھی۔ لہٰذا ان سے وصول شدہ جزیہ کی ایک ایک کوڑی تک واپس کردی۔ یہ حسن سلوک اورانصاف دیکھ کر وہ رو رو کر مسلمانوں کی واپسی کے لیے دعائیں کرنے لگے۔

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو صورت حال سے مطلع کیا گیا اور امداد طلب کی تو مدینہ کا ہر شخص جذبہ جہاد سے لبریز ہوگیا اور جنگ پر جانے کے لیے تیار ہوگیا۔ بہرکیف تھوڑی سی کمک روانہ کردی گئی۔

یرموک کے قریب ہی دو لاکھ سے زائد رومیوں کا لشکر خیمہ زن تھا۔ اگرچہ تعداد میں وہ مسلمانوں سے سات گنا زیادہ تھے لیکن مسلمانوں کے ہاتھ دیکھ چکے تھے۔ چاہتے تھے کہ بھرم رہ جائے ان کے سپہ سالار اعظم باہان نے مصالحت کے لیے قاصد بھیجا۔ جب جارج اسلامی لشکر میں آیا تو مغرب کی نماز شروع ہوئی۔ عجب روح پرور نظارہ تھا۔ وہ بے حد متاثر ہوا۔

بعداز نماز قاصد نے سیدنا ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ سے متعدد سوالات کیے اور مسلمان ہوگیا۔ آپ نے اسے واپس جانے کے لیے فرمایا وہ جانا نہیں چاہتا تھا تو کہا

''اس طرح رومیوں کو بدعہدی کا گمان ہوگا۔ مسلمان کبھی بدعہدی نہیں کرتا لہٰذا تم واپس جاؤ اور کل جو سفیر آئے اس کے ساتھ چلے آنا۔''

15 ہجری اور رجب المرجب کا مہینہ تھا کہ معرکہ یرموک پیش آیا۔ بڑی خون ریز جنگ ہوئی۔ دل کھول کر داد شجاعت دی گئی۔ جب رومیوں کے ستر ہزار افراد واصل جہنم ہو چکے اور مسلمانوں کے تین ہزار مجاہدین مقام شہادت پر فائز ہوئے تو رومیوں کے پاؤں اکھڑ گئے اور فتح کا سہرا مسلمانوں کے سر بندھا۔

جزیرہ جو عراق کا حصہ تھا مگر اس کی سرحد شام کے ساتھ ملی ہوئی تھی۔ ہنوز فتح نہیں ہوا تھا اور وہاں سے خطرہ کسی وقت بھی جنم لے سکتا تھا۔ چنانچہ وہاں بھی رومیوں کے پاؤں نہ جم سکے اور فتح وکامرانی نے سیدنا ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کے قدم چومے۔

سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ دمشق کے والی مقرر ہوئے تھے کہ خلیفۃ المومنین سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے حکم سے معزول کردیے گئے بوقت رخصتی سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا

''لوگو! تمہیں خوش ہونا چاہیئے کہ امین الامت تمہارا والی ہے۔'' اس کے جواب میں سیدنا ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ گویا ہوئے

''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ خالد رضی اللہ عنہ اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار ہے۔''

18 ہجری میں جب عرب میں قحط پڑا تو آپ نے شام سے چار ہزار اونٹ غلے سے لدے ہوئے بھجوا دیئے۔ آپ نے اشاعت اسلام میں بڑا نمایاں حصہ لیا۔ ان گنت لوگ آپ کے اخلاق حسنہ سے متاثر ہوکر حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔

اسی سن ہجری میں طاعون کی وباء پھیلی شام میں اس کا بڑا زور تھا۔ بے شمار لوگ لقمہ اجل بن گئے۔ کئی مشہور ونامور ہستیاں اس کا شکار ہوگئیں۔ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو علم ہوا تو بڑے فکر مند ہوکر بطرف ملک شام روانہ ہوئے مقام سرغ پر سیدنا ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ اور دوسرے

سرداروں نے آپ کا استقبال کیا۔ طاعون کا زور بڑھتا جارہا تھا۔ مشاورت سے طے پایا کہ فی الحال لوگوں کو یہاں سے کہیں اور منتقل ہو جانا چاہیے۔ اس ضمن میں منادی کرادی گئی۔

سیدنا ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ تقدیر کے بڑے قائل تھے۔ خلیفۃ المومنین سے عرض کیا۔

''آپ تقدیر سے بھاگتے ہیں۔''

اس پر سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جواب دیا۔ ''ہاں تقدیر الٰہی کی طرف بھاگتا ہوں۔''

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مدینہ واپس آ کر سیدنا ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کو بلا بھیجا۔ آپ اپنے خلیفہ کا اشارہ پا گئے جواباً لکھا۔ ''جو مقدر میں ہے پورا ہوگا۔''

اس پر سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے تاکیداً لکھا کہ فوجوں کو مرطوب مقامات سے ہٹا کر کسی بلند اور صحت بخش مقام کی طرف لے جاؤ چنانچہ آپ نے فوجوں کو جابیہ منتقل کر دیا۔ مرض طاعون اندرونی طور پر سیدنا ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ پر اپنا اثر کر چکا تھا۔ لہٰذا جابیہ پہنچے تو اس مرض میں مبتلا ہو گئے۔ جب مرض بڑھ گیا تو سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو اپنا جانشین مقرر کیا اور لوگوں کو جمع کر کے فرمایا۔

''صاحبو! یہ مرض اللہ کی رحمت اور تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت ہے۔ پہلے بہت سے صلحاء روزگار اس میں جاں بحق ہوئے ہیں اور اب عبیدہ اپنے اللہ سے اس سعادت میں حصہ پانے کا متمنی ہے۔''

جب نماز کا وقت آیا تو سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ نے امامت کی اور جب نماز ختم ہوئی تو آپ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اس وقت آپ کی عمر اٹھاون سال تھی۔ آپ کو اردن کے شہر بیسان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

آپ بلند قامت وسینہ، دبلے پتلے تھے۔ چہرے مبارک پر گوشت کم تھا۔ داڑھی چھدری تھی۔ پیشانی سے ذہانت و فطانت ٹپکتی تھی۔ اللہ ترسی، اتباع سنت، تقویٰ وزہد تواضع وانکساری، رحم ومساوات، خشیت الٰہی اور محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پیکر تھے۔ آپ ان دس صحابہ کرام میں سے تھے جنہیں رسول رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا میں ہی جنت کی بشارت دی تھی۔

سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ



میں نے رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے
سعد رضی اللہ عنہ کے سوا اور کسی کے لئے
"فداک ابی وامی" کا جملہ نہیں سنا.
سیدنا علی رضی اللہ عنہ

دفاع اسلام کے لیے ننگی تلوار ثابت ہونے والے صحابی رسول

وہ اپنی ماں کا بہت ہی پیارا اور لاڈلا بیٹا تھا۔ اللہ نے اسے شکل وصورت کے ساتھ ساتھ عقل وبصیرت بھی وافر مقدار میں عطا کی تھی۔ اس عقل وبصیرت نے اسے اسلام قبول کرنے پر مجبور کر دیا اور وہ مسلمان ہوگیا۔ جب اس کی ماں نے لڑکے کے تبدیل مذہب کا حال سنا تو سخت رنجیدہ ہوئی اور بات چیت، کھانا پینا چھوڑ بیٹھی۔ چونکہ وہ لڑکا ماں کا حد درجہ فرمانبردار اور اطاعت شعار تھا۔ اس لیے یہ سخت آزمائش کا موقع تھا۔ لیکن جو دل توحید کی لذت سے آشنا ہو چکا تھا وہ کفر وشرک کی طرف کس طرح رجوع کر سکتا تھا۔ ماں تین دن مسلسل بھوکی رہی لیکن بیٹے کے استقلال میں کوئی کمی نہ آئی۔ اللہ ربّ العزت کو یہ شان استقامت اس قدر پسند آئی کہ تمام مسلمانوں کے لیے معصیت الٰہی میں والدین کے عدم اطاعت کا قانون بنا دیا گیا۔ چنانچہ آیت نازل ہوئی۔

"اگر والدین تجھ کو میرے ساتھ شرک پر مجبور کریں جن کا کوئی علم ویقین تیرے پاس نہیں تو اس میں ان کی اطاعت نہ کر۔"

اسلام کی خاطر ماں کی محبت قربان کرنے والے یہ عظیم انسان سیدنا سعد بن ابی وقاص

رضی اللہ عنہ تھے۔ سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ انیس برس کے تھے کہ اسلام کی صدائے دلنواز نے توحید کا شیدائی بنا دیا اور سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ بارگاہ نبوت میں حاضر ہو کر اسلام کی دولت سے مالا مال ہوئے۔ آپ کا نام سعد اور کنیت ابواسحٰق تھی۔ اسلام قبول کرنے کے بعد ہجرت نبوی تک مکہ ہی میں مقیم رہے اور صبر و استقلال کے ساتھ ہر طرح کی سختیاں جھیلتے رہے۔

سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کفار کے خوف سے عموماً مکہ کی ویران و سنسان گھاٹیوں میں چھپ کر معبود حقیقی کی پرستش و عبادت فرمایا کرتے تھے۔ایک دفعہ ایک گھاٹی میں چند صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ مصروف عبادت تھے کہ اتفاق سے کفار کی ایک جماعت اس طرف آ نکلی اور اسلام کا مذاق اڑانے لگی۔ سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو اس بے بسی کی زندگی میں بھی جوش آ گیا اور اونٹ کی ہڈی اٹھا کر اس زور سے ماری کہ ایک مشرک کا سر پھٹ گیا اور خون بہنے لگا، اسلام کی حمایت میں یہ پہلی خونریزی تھی جو سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے عمل میں آئی۔

مکہ میں جب کفار کے ظلم و ستم سے مسلمانوں کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ہجرت مدینہ کا حکم دیا۔ اس حکم عام کی بناء پر سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے مدینہ کی راہ لی اور اپنے بھائی عتبہ بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے مکان میں فروکش ہوئے۔ جنہوں نے ایام جاہلیت میں ایک خون کیا تھا اور انتقام کے خوف سے مدینہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔

یہاں پہنچ کر مسلمانوں کو آزادی وطمانیت نصیب ہوئی۔ تاہم قریش مکہ کی حملہ آوری کا خطرہ موجود تھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش بینی کر کے سیدنا عبدہ بن الحارث رضی اللہ عنہ کو ساٹھ یا اسی سواروں کے ساتھ غنیم کی نقل و حرکت دریافت کرنے کے لیے روانہ فرمایا۔ سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بھی اس جماعت میں شامل تھے۔ دورہ کرتے ہوئے حجاز کے ساحلی علاقہ میں قریش کی ایک بڑی تعداد سے مڈبھیڑ ہوئی، چونکہ محض تجسس مقصود تھا، اس لیے کوئی جنگ پیش نہ آئی مگر سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو کہاں تاب تھی، انہوں نے ایک تیر چلا ہی دیا۔ چنانچہ

یہ اسلام کا پہلا تیر تھا جو راہ خدا میں چلایا گیا۔

دوسری دفعہ خود سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے زیر قیادت آٹھ مہاجرین کی ایک جماعت جاسوسی کے لیے روانہ کی گئی۔ چنانچہ یہ مقام خرار تک گئے اور واپس آئے مگر کوئی جنگ نہ ہوئی۔ اس کے بعد عبداللہ بن جحش کے ساتھ دشمن کی خبر گیری پر مامور ہوئے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا عبداللہ بن جحش کو ایک سربمہر فرمان دیا تھا کہ دو روز سفر کرنے کے بعد کھول کر پڑھیں اور اس پر عمل کریں۔ انہوں نے جب ہدایت نامہ دو روز کے بعد پڑھا تو اس میں لکھا تھا کہ مکہ اور طائف کے درمیان جو نخلستان ہے وہاں پہنچ کر قریش کی نقل و حرکت کا پتہ چلائیں۔ سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں کو فرمان کا مضمون سنا کر کہا ''میں کسی کو مجبور نہیں کرتا جس کو شہادت منظور ہو وہ ساتھ چلے ورنہ واپس جائے۔'' سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اور تمام دوسرے ساتھیوں نے جوش کے ساتھ سمعاً و طاعۃً کہا، لیکن کچھ دور جانے کے بعد عتبہ بن غزوان رضی اللہ عنہ اور سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا اونٹ جو مشترکہ طور پر دونوں کی سواری میں تھا گم ہو گیا اور اس طرح وہ دونوں پیچھے رہ گئے۔ عبداللہ بن جحش نے نخلستان میں پہنچ کر قریش کے ایک قافلہ سے جنگ کی اور مال غنیمت اور چند قیدیوں کے ساتھ مدینہ واپس آئے چونکہ یہ وہ مہینہ تھا جس میں رسماً جنگ ممنوع سمجھی جاتی تھی، اس لیے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر ناپسندیدگی ظاہر کی اور فرمایا کہ میں نے تمہیں جنگ کا حکم نہیں دیا تھا۔ مسلمانوں نے بھی عبداللہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کو ملامت کی۔ لیکن وحی الٰہی نے اس مسئلہ کو اس طرح صاف کر دیا۔

> ''لوگ تم سے ماہ حرام کی نسبت پوچھتے ہیں کہ اس میں لڑنا (جائز ہے) کہہ دو اس میں لڑنا گناہ اور خدا کی راہ سے روکنا اور اس کا نہ ماننا اور مسجد حرام سے باز رکھنا اور اس کے اہل کو اس سے نکال کر اللہ کے نزدیک اس سے بھی بڑھ کر ہے اور فتنہ کشت وخون سے زیادہ برا ہے۔''

قریش فدیہ لے کر اپنے قیدیوں کو چھڑانے آئے لیکن اس وقت تک عتبہ بن غزوان رضی اللہ عنہ اور سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا کچھ پتہ نہ تھا۔ اس لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

کہ جب تک یہ دونوں صحیح وسلامت پہنچ نہ جائیں تمہارے قیدی رہا نہ ہوں گے۔ غرض جب یہ دونوں جانثار واپس آ گئے تو مشرکین چھوڑ دیئے گئے۔

معرکہ بدر سے مستقل جنگوں کی ابتدا ہوئی۔ سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے اس جنگ میں غیر معمولی شجاعت و جان بازی کے جوہر دکھائے اور سعید بن العاص سرخیل کفار کو تہ تیغ کیا۔ سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو اس کی ذوالکتیفہ نامی تلوار پسند آ گئی تھی۔ تلوار لیے ہوئے بارگاہ نبوت میں حاضر ہوئے چونکہ اس وقت تک تقسیم غنیمت کے متعلق کوئی حکم نازل نہ ہوا تھا۔ اس لیے ارشاد ہوا کہ جہاں سے اٹھائی ہے وہیں رکھ دو۔

سیدنا سعد رضی اللہ عنہ کے برادر عزیز سیدنا عمیر رضی اللہ عنہ اس جنگ میں شہید ہوئے تھے کچھ تو ان کی مفارقت کا صدمہ اور کچھ تلوار نہ ملنے کا افسوس۔ غرض غمگین وملول واپس آئے۔ لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد سورہ انفال نازل ہوئی اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بلا کر تلوار لینے کی اجازت دے دی۔

۳ ہجری میں غزوہ احد پیش آیا۔ گھاٹی کو قبل از حکم رسول صلی اللہ علیہ وسلم چھوڑ دینے کی وجہ سے مسلمانوں کی فتح شکست میں بدل گئی اور ناگہانی حملہ کے باعث اکثر غازیوں کے پاؤں اکھڑ گئے لیکن سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ ان ثابت قدم اصحاب کی صف میں تھے جن کے پائے استقلال کو آخیر وقت تک لغزش نہ ہوئی۔ سیدنا سعد رضی اللہ عنہ تیر اندازی میں کمال رکھتے تھے، اس لیے جب کفار کا نرغہ ہوا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اپنے ترکش سے تیر دیتے جاتے اور فرماتے

''اے سعد! تیر چلا میرے ماں باپ تجھ پر فدا ہوں۔''

(سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سعد رضی اللہ عنہ کے سوا اور کسی کے لیے ''فداك ابی و امی'' کا جملہ نہیں سنا۔)

اثنائے جنگ میں ایک مشرک سامنے آیا جس نے اپنے تیز وتند جملوں سے مسلمانوں کو پریشان کر رکھا تھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو نشانہ بنانے کا حکم دیا، لیکن اس وقت ترکش تیروں سے خالی ہو چکا تھا۔ سیدنا سعد رضی اللہ عنہ نے تعمیل ارشاد کے لیے ایک تیر اٹھا کر جس میں پھل نہیں تھا، اس صفائی کے ساتھ اس کی پیشانی پر مارا کہ وہ بدحواسی کے ساتھ برہنہ ہو کر گر گیا۔ نبی

اکرم ﷺ ان کی تیراندازی اور اس کی بدحواسی پر بے اختیار ہنس پڑے۔ یہاں تک کہ دندان مبارک نظر آنے لگے۔

مکہ سے واپس آنے کے بعد اسی سال رسول اللہ ﷺ نے وفات پائی اور سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سقیفہ بنی ساعدہ میں کثرت آراء سے مسند نشین خلافت ہوئے۔ سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے بھی جمہور کا ساتھ دیا اور خلفیہ اول کے ہاتھ پر بلا توقف بیعت کر لی۔

خلیفہ اول نے سوا دو برس کی خلافت کے بعد داعی حق کو لبیک کہا اور فاروق اعظم کو جانشین بنا کر رحلت فرمائی۔ اس وقت اندرونی مہمات کا فیصلہ ہو کر شام وعراق پر فوج کشی کی ابتدا ہو چکی تھی۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے مسند نشین ہونے کے ساتھ ہی تمام عرب میں جوش وخروش کی آگ بھڑکا دی اور ان حملوں کا انتظام زیادہ وسیع پیمانہ پر قائم کر دیا۔ خصوصاً عراق کی فوج کشی پر سب سے پہلے توجہ کی۔

اہل عرب اور ایرانیوں میں قدیم زمانہ سے ہی عداوت چلی آتی تھی، ایرانیوں نے بارہا عربوں کے اختلاف اور کمزوری سے فائدہ اٹھا کر تمام عرب کو تباہ وبرباد کر دیا تھا۔ خصوصاً عراق، عرب اور سرحدی علاقوں پر مستقل قبضہ جما لیا تھا۔ لیکن عرب بھی دب کر رہنے والے نہ تھے، جب موقع ملتا بغاوت کر دیتے تھے۔ چنانچہ پوران دخت کے زمانہ میں جب طوائف الملوکی کے باعث ایرانی حکومت کا نظام ابتر ہو گیا تو سرحدی قبائل کو پھر شورش کا موقع ملا اور مثنیٰ شیبانی اور سوید عجلی نے تھوڑی جمعیت فراہم کر کے عراق کی سرحد حیرہ اور ابلہ کی طرف غارت گری شروع کر دی۔ یہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کا زمانہ تھا۔ مثنیٰ نے بارگاہ خلافت میں حاضر ہو کر باقاعدہ عراق پر حملہ آوری کی اجازت طلب کی، چونکہ عام عرب میں اسلام کی روشنی پھیل چکی تھی، اس لیے اس کے ایک وسیع خطہ کا کسی دوسری حکومت کے زیر اقتدار رہنا مذہبی اور قومی نقطہ نگاہ سے نہایت خطرناک تھا۔ اس بناء پر خلیفہ اول نے مثنیٰ کو اجازت دے دی اور سیدنا خالد رضی اللہ عنہ کو ایک بڑی جمعیت کے ساتھ مدد کے لیے روانہ کیا۔ انہوں نے حملہ کر کے بہت سے سرحدی مقامات فتح کر لیے لیکن چونکہ دوسری طرف شام کی مہم بھی درپیش تھی اور وہاں کمک کی بہت زیادہ ضرورت تھی، اس لیے سیدنا ابوبکر

صدیق رضی اللہ عنہ نے خالد رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ مثنیٰ کو اپنا جانشین مقرر کر کے شامی رزمگاہ کی طرف روانہ ہو جائیں، لیکن خالد رضی اللہ عنہ کا جانا تھا کہ عراق کی مہم دفعتہً سرد پڑ گئی۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے مسند خلافت پر قدم رکھا تو پھر نئے سرے سے عراق کی مہم پر توجہ مبذول فرمائی اور سیدنا ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کو ایک فوج گراں کے ساتھ اس طرف روانہ فرمایا، انہوں نے ایرانیوں کو متفرق معرکوں میں شکست دے کر تمام متصلہ علاقوں پر قبضہ کر لیا اور مشرقی فرات کے کنارے ایک مقام پر جس کا نام مروحہ تھا، غنیم کی ایک زبردست فوج کے سامنے صف آرائی کی چونکہ بیچ کنی میں دریا حائل تھا۔ اس لیے ایرانی سپہ سالار بہمن نے کہلا بھیجا کہ یا تو تم اس پار اتر کر آؤ یا ہم آئیں۔ ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے سربراہان لشکر کے اختلاف کے باوجود جذبات کے جوش میں خود دریا کے پار اتر کر مقابلہ کیا لیکن مسلمانوں کو نہایت افسوسناک شکست ہوئی۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کمک بھیج کر فوج کو از سر نو مستحکم کر دیا اور مثنیٰ شیبانی کو سپہ سالاری کی خدمت سپرد کر دی، انہوں نے معرکہ بویب اور دوسری جنگوں میں دشمن کو پے در پے شکستیں دے کر عراق کے ایک وسیع خطہ پر قبضہ کر لیا۔

ایرانیوں کو اب تک مسلمانوں کی جارحانہ قوتوں کا اندازہ تھا، ان فتوحات نے ان کی آنکھیں کھول دیں۔ اراکین سلطنت نے حکومت کیانی کو محفوظ رکھنے کے لیے نئی تدبیریں اختیار کیں۔ پوران دخت کو جو ایک عورت تھی تخت سے اتار کر خاندان کسریٰ کے اصلی وارث یزدگرد کو تخت نشین کیا اور تمام ملک میں اتحاد، اتفاق اور جوش و خروش کی آگ بھڑکا دی۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کے مفتوحہ مقامات میں بھی بغاوت و سرکشی کی آگ بھڑک اٹھی اور مثنیٰ کو مجبوراً عرب کی سرزمین میں واپس آنا پڑا۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ان واقعات سے مطلع ہو کر تمام عرب میں پر جوش خطیب پھیلا دیئے کہ وہ اپنی پرتاثیر تقریروں سے قبائل عرب کو جنگ میں شریک ہونے کے لیے آمادہ کریں۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں دار الخلافت کی طرف جنگ آزما بہادروں کا ایک طوفان امنڈ آیا۔ سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ عہد صدیقی سے ہوازن کے عامل تھے۔

انہوں نے اپنے اثر سے ایک ہزار آدمی بھیجے۔ جن میں سے ہر ایک تیغ وتفنگ کا ماہر تھا۔ غرض فوج توقع سے زیادہ فراہم ہوگئی۔ لیکن سب سے زیادہ دقت یہ تھی کہ اس عظیم الشان لشکر کی سربراہی کے لیے کوئی شخص موزوں نظر نہ آتا تھا، سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے درخواست کی گئی تو انہوں نے بھی اس بارگراں کے اٹھانے سے انکار کردیا۔ عوام کے اصرار سے خود سیدنا عمر رضی اللہ عنہ تیار ہوگئے۔ لیکن اہل الرائے صحابہ مانع ہوئے کہ آپ کا جانا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ لوگ اسی شدومد میں تھے کہ دفعتاً سیدنا عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے اٹھ کر کہا کہ میں نے پالیا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کون؟ بولے سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ تمام حاضرین اس انتخاب پر پھڑک اٹھے اور سب نے متفقہ طور پر تائید کی۔

سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نہایت بلند پایہ صحابی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ماموں تھے۔ اس کے ساتھ بہادری وشجاعت میں بھی بے نظیر تھے۔ تمام فوج نے ان کی سپہ سالاری کو نہایت پسندیدگی وفخر کی نگاہ سے دیکھا۔

سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے مشراف میں اپنی فوج کا باقاعدہ جائزہ لیا، جو کم وبیش تیں ہزار تھی۔ پھر میمنہ ومیسرہ وغیرہ کی تقسیم کرکے ہر ایک پر جدا جدا افسر مقرر کیے اور مقام کا نقشہ، فرودگاہ کا ڈھنگ، لشکر کا پھیلاؤ اور رسد کی کیفیت وغیرہ سے دربار خلافت کو مطلع کیا۔ وہاں سے حکم آیا کہ مشراف سے آگے بڑھ کر قادسیہ پر اس طرح مورچے جمائیں کہ پشت پر عرب کے پہاڑ ہوں اور سامنے دشمن کا ملک ہو۔ چنانچہ وہ یہاں سے روانہ ہوکر عذیب میں عجمیوں کے میگزین پر قبضہ کرتے ہوئے قادسیہ پہنچے اور مناسب موقعوں پر مورچے جمادیئے۔

رستم کی فوجیں قادسیہ پہنچیں تو سعد رضی اللہ عنہ نے ہر طرف جاسوس پھیلادیئے کہ دشمن کی نقل وحرکت سے ہر وقت مطلع کرتے رہیں۔ نیز غنیم کی فوج کا رنگ ڈھنگ، لشکر کی تربیت اور پڑاؤ کی حالت دریافت کرنے کے لیے فوجی افسر متعین کردیئے۔ اس میں کبھی کبھی دشمن کا سامنا بھی ہوجاتا تھا۔ چنانچہ ایک دفعہ رات کے وقت غنیم کے کیمپ میں گشت کررہے تھے۔ ایک جگہ ایک بیش بہا گھوڑا بندھا دیکھا، تلوار سے باگ ڈور کاٹ کر اپنے گھوڑے کی باگ ڈور سے اٹکالی۔ لوگوں نے ان کا تعاقب کیا تو ایک سپاہی کو قید کرکے لڑتے بھڑتے صاف نکل

آئے، قیدی نے سیدنا سعد رضی اللہ عنہ کے سامنے آکر اسلام قبول کیا اور عجمی فوج کے بہت سے راز بیان کیے۔

عرصہ تک صرف اسی قسم کی جھڑپ ہوتی رہی اور کوئی باقاعدہ جنگ پیش نہ آئی۔ رستم قصداً جنگ سے جی چراتا تھا۔ اس نے ایک دفعہ پھر صلح کی کوشش کی اور سیدنا سعد رضی اللہ عنہ نے اس کی خواہش پر متعدد سفارتیں روانہ کیں۔ آخری سفارت میں مغیرہ بھیجے گئے لیکن مصالحت کی کوئی صورت نہ نکلی۔ رستم کو ناکامی ہوئی تو اس نے غضب ناک ہو کر کہا کہ "کل تمہاری فوجیں تہ وبالا کر ڈالوں گا" مغیرہ رضی اللہ عنہ نے واپس آکر رستم کا مقولہ بیان کیا تو سیدنا سعد رضی اللہ عنہ نے بھی جوش وخروش کے ساتھ مسلمانوں کو تیاری کا حکم دے دیا۔

رستم اس قدر غضب ناک ہو گیا تھا کہ اس نے اسی وقت فوج کو کمر بندی کا حکم دے دیا اور دوسرے روز صبح کے وقت درمیان کی نہر کو عبور کر کے میدان جنگ میں صف آراء ہوا۔ دوسری طرف سیدنا سعد رضی اللہ عنہ کا لشکر بھی تیار تھا۔ مشہور شعراء اور پر جوش خطیب رزمیہ اشعار اور جادو اثر تقریروں سے تمام بہادر سپاہیوں کے شجاعانہ ولولے بھڑکا رہے تھے۔ اس کے ساتھ قاریوں کی خوش الحانی اور جہاد کی آیتوں نے جنت کے عاشقوں کو بے تاب کر رکھا تھا۔

سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے قاعدہ کے مطابق اللہ اکبر کے تین نعرے بلند کیے اور چوتھے پر جنگ شروع ہوگئی۔ گو وہ خود عرق النساء کے عارضہ میں مبتلا ہونے کے باعث عام فوج کا ساتھ نہ دے سکے اور خالد ابن عرطفہ کو قائم مقام کر کے میدان جنگ کے قریب جو قصر تھا اس کے بالاخانہ پر رونق افروز ہوئے۔ تاہم فوج کو لڑاتے خود تھے۔ جس وقت جو حکم دینا مناسب سمجھتے تھے پرچوں پر لکھ کر اور گولیاں بنا کر خالد رضی اللہ عنہ کی طرف پھینکتے جاتے تھے اور خالد رضی اللہ عنہ ان ہی ہدایتوں کے مطابق بموقع لڑائی کا اسلوب بدلتے جاتے تھے۔ ایک دفعہ ایرانی ہاتھیوں کے ریلے سے قریب تھا کہ سواروں کے پاؤں اکھڑ جائیں۔ سیدنا سعد رضی اللہ عنہ نے یہ رنگ دیکھ کر فوراً قبیلہ تمیم کو جو نیزہ بازی اور تیر اندازی میں کمال رکھتے تھے کہلا بھیجا کہ تمہارا کمال ہاتھیوں کے مقابلہ میں کیا ہوا؟ یہ سن کر انہوں نے اس جوش سے تیر برسائے کہ دفعتہً جنگ کا نقشہ بدل گیا۔ غرض تمام دن اسی زور کا رن ہوا۔ شام ہوئی تو دونوں فریق اپنے اپنے

پڑاؤ میں واپس آئے، قادسیہ کا یہ پہلا معرکہ تھا جس کو عربی میں یوم الارماث کہتے ہیں۔
دوسری روز پھر جنگ شروع ہوئی۔ عین ہنگامہ کارزار میں شام کی امدادی فوجیں بھی پہنچ گئیں۔اس تائید غیبی سے مسلمانوں کا جوش دوبالا ہوگیا اور اس زور وشور سے تیغ وسنان کا بازار گرم ہوا کہ دور سے دیکھنے والوں کی رگ شجاعت میں ہیجان پیدا ہو رہا تھا۔ ابو محجن ثقفی جن کو سیدنا سعد رضی اللہ عنہ نے شراب خواری کے جرم میں اپنے قصد میں مقید کر دیا تھا۔ اس ولولہ انگیز منظر کو دیکھ کر بے تاب ہو رہے تھے، ضبط نہ کر سکے تو سعد رضی اللہ عنہ کی بیوی سلمٰی سے درخواست کی کہ اس وقت مجھ کو چھوڑ دو۔ لڑائی سے بچا تو پھر خود آ کر بیڑیاں پہن لوں گا۔ سلمٰی نے انکار کیا تو حسرت کے ساتھ اشعار پڑھے جن کا مطلب تھا۔

''اس سے بڑھ کر کیا غم ہوگا کہ سوار نیزہ بازیاں کر رہے ہیں اور میں زنجیر میں بندھا پڑا ہوں۔''

جب میں کھڑا ہونا چاہتا ہوں تو زنجیر باگ کھینچ لیتی ہے اور دروازے اس طرح سامنے بند کر دیئے جاتے ہیں کہ پکارنے والا پکار کے تھک جاتا ہے۔

ان اشعار سے متاثر ہو کر سلمٰی نے ان کی بیڑیاں کاٹ دیں اور وہ سیدنا سعد رضی اللہ عنہ کے گھوڑے پر سوار ہو کر جنگ کی دہکتی ہوئی آگ میں کود پڑے اور ان لوگوں کو اپنی شجاعت و جانبازی سے متحیر کر دیا۔ سیدنا سعد رضی اللہ عنہ بھی حیران تھے کہ یہ کون بہادر ہے؟ شام کو جنگ ختم ہوئی تو ابو محجن نے خود آ کر بیڑیاں پہن لیں۔ سلمٰی نے یہ حالات سعد رضی اللہ عنہ سے بیان کیے تو انہوں نے کہا ''اللہ کی قسم! میں ایسے فدائی اسلام کو سزا نہیں دے سکتا۔'' اور اسی وقت رہا کر دیا۔ ابو محجن پر بھی اس قدر دانی کا یہ اثر ہوا کہ آئندہ شراب سے توبہ کر لی۔

تیسرے روز حسب معمول پھر معرکہ شروع ہوا۔ سیدنا سعد رضی اللہ عنہ نے آج آخری فیصلہ کا ارادہ کر لیا تھا، لیکن شام ہوگئی اور جنگ کے زور وشور میں کچھ فرق نہ آیا۔ زیادہ دقت ہاتھیوں کی وجہ سے تھی، وہ جس طرف جھک پڑتے تھے صفیں کی صفیں درہم برہم کر دیتے تھے۔ سیدنا سعد رضی اللہ عنہ نے قعقاع رضی اللہ عنہ اور چند دوسرے بہادر سپاہیوں کو بلا کر کہا کہ تم ہاتھیوں کو مار دو تو پھر میدان تمہارے ہاتھ میں ہے۔ انہوں نے نہایت جانبازی کے ساتھ اس حکم کی تعمیل کی

اور نرغہ کر کے بڑے بڑے ہاتھیوں کو مار ڈالا تو دوسرے ہاتھی خود بخود بھاگ کھڑے ہوئے۔ ہاتھیوں سے میدان صاف ہونا تھا کہ سیدنا سعد رضی اللہ عنہ نے اپنی فوج کو سمیٹ کر پھر نئے سرے سے ترتیب دیا اور حکم دیا کہ جب میں تیسرا نعرہ بلند کروں تو غنیم پر حملہ کر دیا جائے، لیکن ابھی پہلا ہی نعرہ بلند ہوا تھا کہ قعقاع رضی اللہ عنہ نے جوش سے بے تاب ہو کر حملہ کر دیا۔

سیدنا سعد رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے اللہ قعقاع رضی اللہ عنہ کو معاف کرنا اور اس کا مددگار رہنا۔ قعقاع رضی اللہ عنہ کو دیکھ کر دوسرے قبائل بھی ٹوٹ پڑے۔ سیدنا سعد رضی اللہ عنہ ہر قبیلے پر کہتے جاتے تھے کہ اے اللہ اس کو معاف کرنا اور اس کا معین و مددگر رہنا۔ غرض دن ختم ہونے کے بعد تمام رات ہنگامہ کارزار گرم رہا لیکن بالاخر مسلمان کے ثبات و استقلال نے ایرانیوں کے پاؤں اکھاڑ دیئے۔ رستم کو بھی مجبوراً بھاگنا پڑا، مگر ہلال نامی ایک مسلمان سپاہی نے تعاقب کر کے اس کا کام تمام کر دیا۔

سیدنا سعد رضی اللہ عنہ نے بارگاہ خلافت میں نامہ فتح روانہ کر کے مقتولین اور مجروحین کی تجہیز و تدفین اور مرہم پٹی کا اہتمام کیا۔

سیدنا سعد رضی اللہ عنہ نے معرکۂ قادسیہ کے بعد ۱۵ ہجری میں تمام عراق عرب کو زیر نگین کر لینے کا تہیہ کر لیا۔ ایرانی بابل میں پناہ گزین تھے، اس لیے سب سے پہلے اسی طرف بڑھے۔ انہوں نے خود عجمیوں پر اس قدر رعب بٹھا دیا تھا کہ راہ میں بڑے بڑے سرداروں نے پیشوائی کر کے صلح کر لی اور بابل تک موقع بموقع پل تیار کروا دیئے کہ اسلامی فوجیں آسانی کے ساتھ گزر جائیں۔ بابل پہنچ کر سیدنا سعد رضی اللہ عنہ نے ایک ہی حملہ میں اس کو فتح کر لیا اور خود یہاں قیام کر کے زہرہ کی افسری میں کچھ فوجیں آگے روانہ کر دیں۔ انہوں نے کوثی پہنچ کر دم لیا اور وہاں کے رئیس شہریار کو قتل کر کے شہر پر قبضہ کر لیا۔

کوثی سے آگے بڑھ کر پایہ تخت کے قریب ایک مستحکم مقام بہرہ شیر تھا، اس نام کی وجہ یہ تھی کہ یہاں خاص کسریٰ کا شکاری شیر رہتا تھا۔ سیدنا سعد رضی اللہ عنہ کا لشکر جب اس شہر کے قریب پہنچا تو شیر مقابلہ کے لیے چھوڑا گیا۔ اس نے تڑپ کر اسلامی شیروں پر حملہ کیا۔ لیکن سیدنا سعد رضی اللہ عنہ کے بھائی ہاشم رضی اللہ عنہ نے جو ہراول کے افسر تھے۔ اس صفائی سے تلوار ماری کہ

شیر وہیں ڈھیر ہو گیا۔

بہرہ شیر کا دو ماہ تک محاصرہ رہا اور اس اثنا میں متعدد ہولناک جنگیں ہوئیں، لیکن کچھ نہ ہو سکا، ایک روز خود ایرانی فوجیں تنگ آ کر جوش وخروش کے ساتھ قلعہ سے باہر نکلیں اور دیر تک شجاعانہ لڑتی رہیں۔ اسی حالت میں ان کا سپہ سالار شہر براز جو نہایت بہادر افسر تھا۔ ایک مسلمان کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس کا قتل ہونا تھا کہ عجمی فوجیں بھاگ کھڑی ہوئیں اور شہر والوں نے صلح کا پھریرا اڑا دیا۔

بہرہ شیر اور مدائن (پایہ تخت عراق) کے درمیان صرف دجلہ حائل تھا، ایرانیوں نے مسلمانوں کے خوف سے جہاں جہاں پل تھے سب توڑ کر بیکار کر دیئے تھے لیکن سیدنا سعد رضی اللہ عنہ کی اولعزمی کے آگے دنیا کی کون سی چیز حائل ہو سکتی تھی؟ انہوں نے اہل فوج کو مخاطب کر کے کہا ''برادران اسلام! دشمن نے ہر طرف سے مجبور ہو کر دریا کے دامن میں پناہ لی ہے۔ آ ؤ اس کو بھی تیر جائیں تو پھر مطلع صاف ہے۔'' یہ کہہ کر گھوڑا دریا میں ڈال دیا۔ سپہ سالار اعظم کی جانبازی دیکھ کر تمام فوج نے بھی جوش کے ساتھ گھوڑے ڈال دیئے اور باہم باتیں کرتے ہوئے دوسرے کنارے پر جا پہنچے۔ ایرانی اس عجیب وغریب جوش واستقلال کا منظر دیکھ کر ''دیو آمدند'' کہتے ہوئے بھاگے۔ تاہم سپہ سالار حرزاد تھوڑی سی فوج کے ساتھ جما رہا اور دریا سے نکلنے پر مزاحم ہوا۔ لیکن مسلمانوں نے ان کو کاٹ کر ڈھیر کر دیا اور مدائن پہنچ کر شاہی محلات پر قبضہ کر لیا۔ یزدگرد شاہ ایران پہلے ہی بھاگ چکا تھا۔ البتہ تمام اسباب وسامان موجود تھا، جو بجنسہ مدینہ روانہ کیا گیا۔

مدائن کی فتح کے ساتھ تمام عراق عرب پر تسلط قائم ہو گیا، بڑے بڑے رؤسا اور جاگیرداروں نے صلح کر لی اور تمام ملک میں امن وامان کی منادی ہو گئی جو لوگ گھر بار چھوڑ کر بھاگ گئے تھے پھر واپس آ گئے اور حاکم ومحکوم میں اس قدر ارتباط پیدا ہوا کہ باہم ازدواج ومناکحت کا سلسلہ جاری ہو گیا۔

عراق عرب کے مفتوح ہونے کے بعد سیدنا سعد رضی اللہ عنہ کے اہتمام سے جلولا اور تکریت پر فوج کشی ہوئی اور نہایت کامیابی وفیروزمندی کے ساتھ ان مقامات پر اسلامی پھریرا نصب

کر دیا گیا۔ اس کے بعد سیدنا سعد رضی اللہ عنہ نے دربار خلافت سے آگے بڑھنے کی اجازت طلب کی تو جواب آیا کہ ''دولت و حکمرانی کے مقابلہ میں مجھے ایک ایک سپاہی کا خون زیادہ محبوب ہے۔ کاش! ہمارے اور عجمیوں کے درمیان سد سکندری حائل ہوتی کہ نہ ہم ان کی طرف بڑھتے اور نہ وہ ہم پر حملہ آور ہوتے۔ غرض سر دست اسی پر اکتفا کر کے ممالک مفتوحہ کا نظم ونسق اپنے ہاتھ میں لو۔''

اس فرمان کے مطابق سیدنا سعد رضی اللہ عنہ کی والی ملک کی حیثیت سے مدائن کو صوبہ کا مرکز بنا کر نظم ونسق میں مصروف ہو گئے۔ اصل یہ ہے کہ کسی غیر قوم پر حکمرانی اور ملکی نظام کو بہترین اصول پر مرتب کرنا بھی اسی قدر مشکل ہے جس قدر کسی ملک کو فتح کرنا۔ سیدنا سعد رضی اللہ عنہ اپنی فطری قابلیت کے باعث ان دونوں مشکلات پر غالب آئے۔ انہوں نے جس خوبی وعمدگی کے ساتھ اپنے عہدۂ جلیلہ کے فرائض انجام دیئے اس سے زیادہ اس زمانہ میں ممکن نہ تھا۔ دربار خلافت کے ایماء سے تمام عراق کی مردم شماری اور پیمائش کرائی، اراضی مفتوحہ کو ملک کے اصلی باشندوں کے ہاتھ رہنے دیا۔ البتہ جس زمین کا کوئی وارث نہ تھا، اس کا پھر نئے سرے سے بندوبست کیا، اسی طرح لگان اور جزیہ کے اصول بنائے اور رعایا کے امن وآسائش کا انتظام کیا۔ عجمیوں کے ساتھ اس قدر خلق وشفقت سے پیش آئے کہ ان کے دل پر قبضہ کر لیا۔ چنانچہ بڑے بڑے امراء اور رؤسا، اسی اثر سے متاثر ہو کر مسلمان ہو گئے۔ جمیل ابن بصبہری، بسطان بن نرسی، رفیل اور فیروز وغیرہ جو عراق کے مشہور روساء تھے خود بخود مسلمان ہو گئے۔ اسی طرح ویلم کی چار ہزار فوج جو شاہی رسالہ کے نام سے موسوم تھی حلقہ بگوش اسلام ہوئی۔

سیدنا سعد رضی اللہ عنہ نے ایک عرصہ تک مدائن میں قیام کرنے کے بعد محسوس کیا کہ یہاں کی آب وہوا نے اہل عرب کا رنگ روپ بدل دیا ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو اس سے مطلع کیا تو حکم آیا کہ عرب کی سرحد میں کوئی مناسب سرزمین تلاش کر کے ایک نیا شہر بسائیں اور عربی قبائل کو آباد کر کے اس کو مرکز حکومت قرار دیں۔ سیدنا سعد رضی اللہ عنہ نے اس حکم کے مطابق مدائن سے نکل کر ایک موزوں جگہ منتخب کر کے کوفہ کے نام سے ایک وسیع شہر کی بنیاد ڈالی۔ عرب کے جدا جدا قبیلوں کو جدا جدا محلوں میں آباد کیا۔ وسط شہر میں ایک عظیم الشان مسجد بنوائی، جس میں تقریباً

چالیس ہزار نمازیوں کی گنجائش رکھی گئی۔ مسجد کے قریب ہی بیت المال کی عمارت اور اپنا محل تعمیر کرایا جو قصر سعد رضی اللہ عنہ کے نام سے مشہور تھا۔

کچھ دنوں کے بعد بیت المال میں چوری ہوگئی۔ سیدنا سعد رضی اللہ عنہ نے اس کی رپورٹ دارالخلافت میں بھیجی تو حکم آیا کہ بیت المال کو مسجد سے ملا دیا جائے تاکہ ہر وقت نمازیوں کی آمد و رفت سے خزانہ محفوظ رہے۔ چنانچہ انہوں نے روزبہ نامی ایک مشہور پارسی معمار کو بلا کر یہ خدمت سپرد کی۔ اس نے نہایت خوبی و موزونی کے ساتھ بیت المال کی عمارت کو بڑھا کر مسجد سے ملا دیا۔ سیدنا سعد رضی اللہ عنہ نے اس کی کاریگری کی بڑی قدر کی اور خوش ہو کر اس کو دارالخلافت بھیج دیا۔ جہاں ہمیشہ کے لیے اس کا روزینہ مقرر ہو گیا۔

سیدنا سعد رضی اللہ عنہ کا قصر چونکہ وسط بازار میں تھا اس لیے شور و شغب کے ساتھ باہم گفتگو کرنا بھی دشوار تھا۔ انہوں نے اس سے بچنے کے لیے قصر کے سامنے ایک ڈیوڑھی بنوائی اور اس میں پھاٹک لگوایا۔ بارگاہ خلافت میں اس ڈیوڑھی کی اطلاع پہنچی تو اس خیال سے کہ اہل حاجت کے لیے یہ سدراہ نہ ہو جائے۔ سیدنا محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کو حکم ہوا کہ کوفہ جا کر اس میں آگ لگا دیں، چنانچہ اس حکم کی تعمیل ہوئی اور سیدنا سعد رضی اللہ عنہ اطاعت شعاری کے ساتھ خاموشی سے دیکھتے رہے۔

شام کی اسلامی فوجوں نے حمص پر چڑھائی کی تو اہل جزیرہ ایک لشکر عظیم کے ساتھ رومیوں کی مدد کے لیے روانہ ہوئے۔ لیکن سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے جو ملک کے اندرونی و سرحدی واقعات سے ہر وقت باخبر رہتے تھے ایک فوج گراں بھیج کر ان کو وہیں روک دیا اور آگے نہ بڑھنے دیا۔

۲۱ ہجری میں ایرانیوں نے عراق عجم میں نہایت عظیم الشان جنگی تیاریاں کیں اور مسلمانوں کو ان کے مفتوحہ ممالک سے نکال دینا چاہا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ان تیاریوں کا حال سنا تو تمام فوجی مرکزوں میں اسلامی فوج کو بھی آراستہ کرنے کے احکام صادر کیے۔ کوفہ سب سے بڑا مرکز تھا۔ سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے یہاں نہایت اہتمام کے ساتھ تیاریاں شروع کیں اور دربار خلافت کے ایما سے نعمان بن مقرن کو جو پہلے ان کی ماتحتی میں

تھے، اس فوج کا امیر مقرر کیا۔ لیکن یہاں ایک جماعت ایسی پیدا ہوگئی تھی جو قصداً جنگ سے جی چراتی تھی اور کہتی تھی کہ بصرہ والوں نے خواہ مخواہ فارس پہ حملہ کر کے یہ لڑائی مول لی ہے۔ سیدنا سعد رضی اللہ عنہ نے بارگاہ خلافت میں ان لوگوں کی شکایت لکھی تو ان میں سراج بن سنان اور اس کے چند ساتھیوں کو ان سے شدید عداوت پیدا ہوگئی اور انہوں نے مدینہ پہنچ کر شکایت کی کہ وہ نماز اچھی طرح نہیں پڑھاتے۔ ظاہر ہے کہ سیدنا سعد رضی اللہ عنہ جیسے عالی مرتب و بلند پایہ صحابی کی نسبت یہ شکایت کس قدر مہمل تھی۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو بھی اس کے لغو ہونے کا یقین تھا۔ تاہم رفع حجت کے خیال سے سیدنا محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کو تحقیقات کے لیے روانہ فرمایا۔ انہوں نے کوفہ کی ہر ایک مسجد میں گشت کر کے اس شکایت کی حقیقت دریافت کی تو ہر جگہ سب نے یک زبان ہو کر اس کی تکذیب کی۔ محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ تحقیقات سے فارغ ہو کر دونوں فریقوں کو ساتھ لیے ہوئے مدینہ پہنچے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے دیکھنے کے ساتھ پوچھا ''سعد رضی اللہ عنہ! تم کیسی نماز پڑھاتے ہو کہ لوگ شکایت کرتے ہیں؟'' انہوں نے جواب دیا کہ پہلی دو رکعتوں میں لمبی سورتیں پڑھتا ہوں اور دونوں آخری میں صرف فاتحہ پر اکتفا کرتا ہوں۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا بے شک تمہاری نسبت یہی گمان ہو سکتا ہے۔

گو الزام بے بنیاد ثابت ہوا، تاہم سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس خیال سے کہ ایک جماعت مخالفت پر آمادہ ہوگئی تھی ان کو اس عہدہ سے سبکدوش ہی کر دینا مناسب سمجھا۔ چنانچہ سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ جن کو اپنا جانشین بنا آئے تھے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو ہی مستقل کر دیا اور ان کو دوبارہ واپس جانے کی زحمت نہ دی۔

سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو اپنے اوپر اس بے ہودہ الزام کے قائم ہونے کا نہایت افسوس تھا۔ فرمایا کرتے تھے کہ عرب میں سب سے پہلا شخص ہوں جس نے راہ خدا میں تیر اندازی کی ہے۔ ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ درخت کے سوکھے پتے کھا کر لڑے تھے، لیکن اللہ کی شان آج یہ بنو اسد پیدا ہوئے ہیں جو مجھے مذہب سکھاتے ہیں کہ میں نماز اچھی نہیں پڑھاتا۔

۲۳ ہجری میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مجوسی غلام کے ہاتھ سے شہادت پائی۔ حالت

نزاع میں لوگوں نے خلفیہ نامزد کرنے کی طرف توجہ دلائی تو انہوں نے اس منصب کے لیے چھ آدمیوں کے نام پیش کیے ان میں ایک سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بھی تھے اور فرمایا کہ اگر وہ خلافت کے لیے منتخب نہ ہو سکیں تو جو منتخب ہو اسے چاہیئے کہ ان کی خدمات سے فائدہ اٹھائے کیونکہ میں نے انہیں کسی کمزوری یا خیانت کی وجہ سے معطل نہیں کیا تھا۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی تجہیز و تکفین کے بعد مجلس شوریٰ نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے سر پر دستار خلافت باندھی اور انہوں نے حسب وصیت سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو دوبارہ کوفہ کا والی مقرر کیا، لیکن اس تقرری کے تین سال بعد ۲۶ ہجری میں سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ مہتمم بیت المال سے اختلاف پیدا ہو جانے کے باعث پھر معزول ہو گئے۔

سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے معزول ہونے کے بعد مدینہ میں عزلت نشینی اختیار کر لی، یہاں تک کہ جب خلیفہ ثالث کے آخری عہد حکومت میں فتنہ وفساد کا بازار گرم ہوا تو یہ ہنگامہ بھی ان کی گوشہ گیری میں مخل نہ ہوا۔ البتہ جب مفسدین نے کاشانۂ خلافت کا محاصرہ کر لیا تو ان کو سمجھانے کی کوشش کی، مگر ناکام رہے۔

سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کی، لیکن معاملات ملکی سے بے تعلق رہنے کی روش پر اس وقت بھی قائم رہے، چنانچہ علی جب طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہم کے مقابلہ میں اپنی فوج کے ساتھ روانہ ہوئے تو لوگوں نے ان کو بھی ساتھ چلنے کی دعوت دی، لیکن انہوں نے معذرت کی اور کہا ''مجھے ایسی تلوار بتاؤ جو مسلم و کافر میں امتیاز رکھے۔''

جناب علی رضی اللہ عنہ اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے تنازعات کا فیصلہ کرنے کے لیے جب پنچایت مقرر ہوئی، تو سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بھی اس خوشی میں کہ اب خانہ جنگی اور خونریزیوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ فیصلہ سننے کے لیے دومۃ الجندل تشریف لائے۔ لیکن جب یہ بے نتیجہ ثابت ہوئی تو پھر اپنے عزلت کدہ میں واپس آ گئے اور تمام جھگڑوں سے قطعی طور پر کنارہ کش رہے۔

سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے مدینہ سے دس میل کے فاصلہ پر مقام عقیق میں اپنے لیے ایک قصر تعمیر کرایا تھا، چنانچہ عزلت نشینی کی زندگی اسی میں بسر ہوئی۔ آخر عمر میں قویٰ مضمحل

ہو گئے تھے اور آنکھوں کی بصارت بھی جاتی رہی تھی، یہاں تک کہ ۵۵ ہجری میں طائر روح نے قفس عنصری کو خیر آباد کہا۔ سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے وصیت کی تھی کہ جنگ بدر میں جو اونی کپڑا میرے جسم پر تھا اس سے کفن کا کام لیا جائے۔ چنانچہ اس پر عمل کیا گیا اور لاش مدینہ لائی گئی۔ بعض امہات المومنین اس وقت زندہ تھیں۔ انہوں نے حکم دیا کہ اس جانثار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جنازہ مسجد میں لایا جائے، چنانچہ مسجد میں ان کے حجروں کے سامنے نماز ادا کی گئی۔ امہات المومنین بھی نماز میں شریک تھیں۔

عمرو بن العاص رض



عقل و دانش اور تدبیر سیاست کے لحاظ سے آپ کا شمار عرب کے مخصوص اشخاص میں ہوتا تھا رسول اللہ ﷺ نے آپ کے بارے میں ارشاد فرمایا تھا "تم اسلام میں صائب الرائے ہو"

مصر کو فتح کرنے والے عظیم صحابی رسول

لشکر اسلام کو شہر کا محاصرہ کیے کئی دن ہو چکے تھے لیکن قلعہ نما یہ شہر شدید محاصرے کے باوجود فتح نہیں ہو رہا تھا۔ سپہ سالار اسلام نے قلعے کی اندرونی حالت معلوم کرنے کے لیے کئی قاصد بھیجے لیکن کوئی بھی تسلی بخش رپورٹ نہ لا سکا۔ سپہ سالار اسلام کے لیے پریشانی کی دو باتیں تھیں۔ پہلی یہ کہ اگر محاصرہ طویل ہو گیا تو کہیں اسلامی فوج کا مورال نہ گر جائے اور دوسری بات یہ تھی کہ اس صورت دشمن کو پیچھے سے امداد پہنچ سکتی ہے لہٰذا وہ جلد از جلد قلعے کو فتح کرنا چاہتے تھے۔

کافی غور و فکر کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ قلعے کی اندرونی صورتحال کا جائزہ لینے کے لیے انہیں خود کسی نہ کسی صورت اندر جانا چاہیے۔

وہ انتہا درجہ کے عقلمند، ذہین، فطین، جری و بہادر اور صورتحال کو فوراً پرکھنے والے عظیم انسان تھے۔ لہٰذا ایک دن خود انہوں نے قاصد کا بھیس بدلا اور قلعے کا جائزہ لینے کے لیے بطور قاصد قلعے کے گورنر کے پاس جا پہنچے۔

ان کے انداز گفتگو سے قلعے کے گورنر کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ میرے ساتھ محو گفتگو

کوئی عام سپاہی نہیں ہوسکتا ممکن ہے کہ یہ شخص لشکر اسلام کا جرنیل ہی ہو۔ دل میں اس خیال کے پیدا ہوتے ہی قلعے کے گورنر نے مرکزی دروازے پر متعین اپنے فوجیوں کو پیغام بھیج دیا کہ لشکر اسلام کے اس قاصد کو دروازے پر آتے ہی فوراً قتل کر دیا جائے۔

جرنیل لشکر گورنر سے اجازت لے کر واپس لوٹے تو وہ آہستہ آہستہ قدم بڑھاتے ہوئے قلعے کی اندرونی صورت کا بغور جائزہ لے رہے تھے جب وہ مرکزی دروازے سے چند گز دور تھے تو ان کی عقابی نگاہیں دروازے پر متعین سپاہیوں پر پڑیں۔ ایک خیال بجلی کی سی تیزی سے ان کے دل میں پیدا ہوا کہ معاملہ کچھ گڑبڑ دکھائی دیتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے مجھے قتل کر دینے کا منصوبہ ترتیب دیا جا چکا ہے۔ وہ موت سے نہیں ڈرتے تھے بلکہ موت کی تلاش تو انہیں قتال کے لیے ابھارتی تھی لیکن یہاں مسئلہ لشکر اسلام کے نفع و نقصان کا تھا لہٰذا صورت حال کو پرکھتے ہی وہ انہی قدموں پہ واپس لوٹے اور دوبارہ گورنر سے ملے اور مسکراتے ہوئے یوں گویا ہوئے جناب! مجھے آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے میں ذاتی طور پر آپ سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ جاتے جاتے میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ میرے لشکر میں بیس افراد ایسے ہیں جو جنگی اعتبار سے انتہائی تجربہ کار ہیں اور امیر المومنین نے یہ حکم دیا کہ ان سے مشورہ کے بغیر کوئی اقدام نہ کیا جائے۔ اگر آپ چاہیں تو ان کی ملاقات بھی آپ سے کرادی جائے۔ میرا خیال ہے کہ وہ بھی آپ سے مل کر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں گے۔ یہ تجویز سنتے ہی گورنر کے دل میں خیال آیا کہ ایک کی بجائے بیس کو تہہ تیغ کرنے کا سنہری موقع ہاتھ آ رہا ہے۔ اس سے لشکر اسلام کی کمر ٹوٹ جائے گی۔

اس نے مسکراتے ہوئے کہا ''بہت خوب انہیں لائیں چشم ماروشن دل ماشاد'' اور ساتھ ہی مرکزی دروازہ پہ متعین فوجی دستے کو پیغام بھیج دیا کہ قاصد کو دروازے سے صحیح سالم گزرنے دیا جائے۔ اس طرح لشکر اسلام کے یہ عظیم سپہ سالار قلعے کا مکمل جائزہ لینے کے بعد کامیاب واپس لوٹ آئے۔

قلعے کے گورنر کو جس وقت پتہ چلا کہ لشکر اسلام کے جرنیل نے میرے ساتھ داؤ کھیلا ہے تو وہ بھی اس عظیم جرنیل کی اعلیٰ صلاحیتوں اور بیدار مغزی کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا۔

اور اپنے سالار کے اس عظیم کارنامے کی خبر جب خلیفہ وقت کو ہوئی تو انہوں نے انتہائی مسرت کا اظہار کیا اور اپنے عظیم جرنیل کو داد دی۔

اور پھر اپنے سالار کی اعلیٰ صلاحیتوں اور نصرف خداوندی سے لشکر اسلام نے چند ہی روز میں شہر فتح کر لیا اور پھر اس مرکزی شہر کے فتح ہوتے ہی فلسطین کے تمام شہر اسلام کے زیر نگیں آ گئے یوں کفر و الحاد کا خاتمہ ہوا اور لا الہ الا اللہ کے نغمے ہر سو گونجنے لگے۔

یہ عظیم اور قابل فخر جرنیل صحابی رسول فاتح مصر عمر بن عاص رضی اللہ عنہ تھے جنہوں نے اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر بے شمار عظیم کارنامے سرانجام دیئے۔

عمرو بن العاص کے قبول اسلام کا واقعہ کچھ یوں ہے کہ غزوہ خندق ختم ہو چکا تھا۔ اسلام اور داعی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن منہ کی کھا کر راہ فرار اختیار کر چکے تھے۔ اس غزوہ میں مسلمانوں کی فتح و نصرت نے سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو بے حد متاثر کیا تھا۔ دنیا کی چندروزہ زندگی اور اسلام کی تعلیمات پر جس قدر غور و خوض کرتے حق اتنا ہی روشن ہوتا جا رہا تھا۔ بعثت کے وقت آپ کے باپ عاص نے جس شد و مد سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی تھی بیٹا اس کا صحیح جانشین ثابت ہوا تھا۔ اسلام کے خلاف ہر سازش میں دیگر زعماء قریش کی طرح پیش پیش رہتے تھے۔ مسلمانوں کا جو پہلا قافلہ ملک حبشہ کی طرف ہجرت کر کے گیا تھا تو قریش نے جو وفد مسلمانوں کو حبشہ سے نکلوانے کے لیے نجاشی کے پاس بھیجا تھا تو آپ اس کے سرگرم رکن تھے۔ وہاں پہنچ کر درباریوں اور دوسرے لوگوں کو تحائف دے کر اپنا ہمنوا بنا لیا تھا اور پھر بادشاہ سے گزارش کی کہ وہ مسلمانوں کو اپنے ملک سے نکال دے لیکن اس نے انکار کر دیا۔ لیکن اب آپ مسلمانوں کی مخالفت سے رفتہ رفتہ کنارہ کش ہوتے جا رہے تھے۔ وہ جوش و خروش اور عزم و ولولہ سرد ہوتا جا رہا تھا جس کا وہ اظہار کیا کرتے تھے۔

آپ کے رویئے نے اہل قریش کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اب عمرو بن العاص وہ عمرو بن العاص نہیں رہا ہے جو کبھی ہوا کرتا تھا۔ لیکن پھر بھی حقیقت حال کا جائزہ لینے کے لیے ایک شخص کو آپ کے پاس بھیجا اور طرح طرح کے سوالات کرنے لگا۔

''اچھا بتاؤ کہ حق پر ہم ہیں یا فارس و روم والے؟''

آپ نے اس شخص سے دریافت کیا:

''ہم'' اس نے بڑے وثوق سے جواب دیا۔

''اگر ایسا ہے تو عیش وعشرت کسے حاصل ہے ہمیں یا ان کو۔''

''اہل فارس وروم کو'' اس نے کہا۔

''اگر اس عالم کے بعد دوسرا عالم نہیں تو پھر ہماری حق پرستی کس کام آئے گی۔ اگر ہم اس دنیا میں باطل پرستوں کے مقابل تنگدست مفلوک الحال اور مصائب وآلام کا شکار رہیں اور دوسرے عالم میں بھی جزا کی امید نہ ہو تو پھر بات کیا بنی۔''

آپ نے پوچھا تو اس شخص کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ خاموش کھڑا منہ تکتا رہا۔ آپ پھر گویا ہوئے۔

''محمد بن عبداللہ ﷺ کی یہ تعلیم کہ مرنے کے بعد دوسرا عالم ہے جہاں ہر شخص کو اس کے اعمال کے مطابق جزا وسزا ملے گی۔ کس قدر درست اور قابل فہم ہے۔''

قریش کا فرسودہ شخص واپس لوٹ گیا۔

وقت گزرتا رہا۔ ایک دن آپ ان آدمیوں سے ملے جو آپ کی باتیں بڑے دھیان سے سنا کرتے اور انہیں تسلیم کیا کرتے تھے۔ آپ نے ان سے کہا۔

''حالات کی نبض کا جائزہ لینے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ محمد ﷺ ضرور بضرور کامیاب وکامران ہوں گے اور ان کو کوئی شخص جھٹلا نہیں سکتا۔''

آپ نے تھوڑی دیر سکوت فرمایا اور پھر بولے۔

''میری ایک تجویز ہے۔''

''کیا؟''

بہت سی آوازیں فضا میں ابھریں۔

''کیوں نہ ہم لوگ نجاشی کے پاس چل کر قیام کریں۔ اگر محمد بن عبداللہ ﷺ ہماری قوم پر غالب آ گئے تو ہم وہیں مقیم رہیں گے اور اگر ہماری قوم ان پر غالب آ گئی تو ہم ممتاز لوگ ہیں۔ ہمارے ساتھ ان کا طرزِ عمل بہتر ہوگا۔''

رائے کو تمام حاضرین نے بہت پسند کیا اور شاہ حبشہ کے لیے تحفے اور چمڑا جو بہترین تحفہ تصور کیا جاتا تھا لیا اور سوئے حبشہ چل پڑے۔

جب آپ اور آپ کے ساتھی شاہ حبشہ نجاشی سے ملنے جارہے تھے تو انہوں نے عمر بن امیہ ضمری کو بادشاہ کے محل میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ انہیں رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا جعفر طیار رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کی کسی ضرورت کے سلسلہ میں بھیجا تھا۔ تھوڑی دیر بادشاہ کے پاس رہنے کے بعد سیدنا عمرو بن امیہ رضی اللہ عنہ واپس لوٹ گئے۔ یہ واقعہ دیکھنے کے بعد سیدنا عمر بن العاص رضی اللہ عنہ نے اپنے رفیقوں سے کہا ''میں نجاشی سے کہوں گا کہ وہ سیدنا عمر بن امیہ رضی اللہ عنہ کو میرے حوالے کردے اور اگر اس نے انہیں مجھے دے دیا تو ان کی گردن ماردیں گے تاکہ قریش کو علم ہو جائے کہ ہم نے سفیر رسول کو قتل کر کے ان کا انتقام لے لیا ہے۔''

یہ سوچ کر آپ بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بادشاہ نے آپ کو دیکھ کر پوچھا ''ہمارے لیے آپ ملک سے کیا تحفہ لائے ہو۔؟''

سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے چمڑہ پیش کیا۔ جسے بادشاہ نے بڑا پسند کیا۔ جب واپس جانے لگے تو عرض کی۔

''اے بادشاہ سلامت! ابھی میں نے ایک شخص کو آپ کے پاس سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ ہمارے دشمن کا بھیجا ہوا تھا۔ آپ اسے ہمارے حوالے کردیں تاکہ ہم اسے قتل کردیں۔ اس نے ہمارے معززین واکابرین کو بہت تکالیف دی ہیں۔''

جب نجاشی نے سنا تو اس کے غضب و غصے کی انتہا نہ رہی۔ اسی حالت میں اس نے بے اختیار ہوکر اپنا ہاتھ زور سے اپنے منہ پر مارا۔ حاضرین کو یوں لگا جیسے بادشاہ کی ناک ٹوٹ گئی ہو۔

یہ منظر دیکھ کر سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ بے حد نادم و شرمندہ ہوئے۔ دل چاہتا تھا کہ ابھی زمین پھٹ جائے تاکہ اس کے اندر سما جائیں۔ بڑی شرمندگی و لجاجت سے عرض کی۔

''عالی جاہ! میں اپنے الفاظ پر بے حد شرمسار و خجل ہوں اگر پتہ ہوتا کہ میری بات آپ کو اس قدر ناگوار محسوس ہوگی تو کبھی نہ کرتا۔''

''تم کہتے ہو کہ میں اس عظیم ہستی کے ایلچی کو قتل کے لیے تمہارے حوالے کردوں جن کے پاس ناموس اکبر آتا ہے جو سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا کرتا تھا۔''

بادشاہ نے شاہانہ رعب و دبدبہ سے کہا۔

''اے شاہا! کیا واقعی۔''

سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے ازراہ حیرت پوچھا۔

''اے عمرو! تمہاری حالت پر صد افسوس۔ اللہ کی قسم وہ حق پر ہیں۔ اپنے دشمنوں اور مخالفوں پر غالب آئیں گے جس طرح سیدنا موسیٰ علیہ السلام فرعون اور اس کے لشکر پر غالب آئے تھے۔ میرا کہا مانو اور فوراً ان کی پیروی کرلو اسی میں بھلا ہے۔''

سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے سنا تو عرض کی۔

''پھر ان کی طرف سے آپ مجھ سے اسلام کی بیعت لے لیں۔''

بادشاہ یہ سن کر بڑا خوش ہوا اور اپنا ہاتھ پھیلا دیا اور سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے اسلام کی بیعت کرلی۔

جب آپ بادشاہ کے دربار سے لوٹ کر واپس گئے تو دل و دماغ میں انقلاب عظیم برپا ہوچکا تھا۔ لیکن اس کا ذکر اپنے ساتھیوں سے نہیں کیا۔ اب حبشہ میں قیام کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ جسم سے پہلے ذہن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ عالیہ میں پہنچ چکا تھا۔ مکہ پہنچے اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست اقدس پر اسلام کے دامن سے وابستہ ہونے کے لیے روانہ ہوئے۔ یہ فتح مکہ سے قبل کا واقعہ ہے۔

راستے میں سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے ملے۔ وہ بھی ابھی تک حلقۂ بگوش اسلام نہیں ہوئے تھے۔

''ابا سلیمان! کہاں کا ارادہ ہے؟''

سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے پوچھا۔

''بخدا محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نبی برحق ہیں۔ اب جلد اسلام قبول کرلینا چاہیے۔'' سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے جواب دیا۔

”واللہ میں بھی اسی غرض سے چلا ہوں۔“

آپ دونوں حضرات بارگاہ رسالت مآب ﷺ میں حاضر ہوئے۔ پہلے سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے غلامی مصطفیٰ ﷺ کا طوق گلے میں ڈالا اور پھر سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ حاضر خدمت ہوئے اور عرض کی۔

”یارسول اللہ ﷺ! میں بیعت کروں گا۔ اسی لیے حاضر خدمت ہوا ہوں لیکن آپ اگلے اور پچھلے سارے گناہوں کو معاف فرمادیں گے۔“

”عمرو! بیعت کرلو۔ اسلام اپنے پچھلے کیے گناہوں کو معاف کر دیتا ہے۔“

چنانچہ آپ نے اپنا ہاتھ رسول ﷺ کے ہاتھ مبارک میں دے دیا اور پھر مکہ لوٹ گئے اور پھر چند دنوں کے بعد ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے آئے۔

آپ کے والد عاص بن وائل کا تعلق بنوسہم کے خاندان سے تھا جو دورِ جاہلیت میں بڑا معزز و ممتاز تھا اور قریش کے سیاسی نظام میں مقدمات کے فیصلے کیا کرتا تھا۔ آپ نے جس ماحول میں آنکھ کھولی تھی اس کی بدولت آپ کے اندر سیاسی سوجھ بوجھ پیدا ہوگئی۔ اصابت رائے جو ہر حکمرانی اور تدبر ودانش نکھرنے لگی۔ اسی لیے مؤرخین نے آپ کو قریش کے حکام میں شمار کیا ہے۔ آپ کی کنیت ابوعبداللہ اور ابومحمد تھی۔ جب ہادی برحق ﷺ نے اعلان نبوت فرمایا تو اس وقت آپ کی عمر چونتیس سال تھی اور شعور وخیالات میں پختگی آ چکی تھی۔

آپ میں امارت وقیادت کی تمام صفات موجود تھیں۔ سرور کونین ﷺ کی چشم بینا سے یہ چیز اوجھل نہ تھی۔ فتح مکہ کے بعد جمادی الآخر ۸ ہجری میں رسول اللہ ﷺ نے آپ کا سریہ ذات السلاسل کی طرف روانہ فرمایا جو وادی القریٰ کی طرف ہے۔ بروایت ابن سعد اطلاع ملی کہ قضاعہ کے ایک گروہ کا ارادہ ہے کہ اکٹھے ہو کر مسلمانوں پر حملہ آور ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو طلب فرمایا۔ ان کے لیے سفید جھنڈا باندھا اور ایک سیاہ جھنڈا بھی ساتھ کر دیا۔ تین سو مہاجرین و انصار پر آپ کو امیر مقرر فرمایا جن میں تیس گھوڑ سوار بھی تھے۔ روانگی سے قبل حبیب کبریا ﷺ نے حکم دیا۔

”عمرو! بلی و عذرہ و بلقین میں سے جس پر گزر ہو اس سے مدد حاصل کرنا۔“

آپ نے ارشاد نبوی سنا تو سر تسلیم خم کر دیا اور پھر منزل کی طرف چل پڑے۔ منزل مقصود دس دن کی مسافت پر تھی۔ آپ دن کے وقت چھپے رہتے اور رات کو سفر کرتے تاکہ اچانک ان لوگوں پر حملہ آور ہوں۔ جب آپ ان لوگوں کے قریب پہنچے تو پتہ چلا کہ وہ تعداد میں بہت زیادہ ہیں۔ آپ نے سیدنا رافع بن مکیث الجہنی کو دربار محمدی ﷺ میں بھیجا اور مزید امداد کی درخواست کی۔ نبی اکرم ﷺ نے سیدنا عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کی معیت میں دو سو منتخب انصار و مہاجرین بھیجے۔ جن میں سیدنا ابوبکر صدیق اور سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنھم بھی شامل تھے۔

کمک پہنچنے کے بعد آپ روانہ ہوئے۔ بلی کی آبادی میں داخل ہو کر تمام راستوں کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور پھر عذرہ و بلقین کی آبادی تک آ گئے۔ آخر کار انہیں ایک مجمع ملا۔ مسلمانوں نے جاتے ہی ان پر حملہ کر دیا۔ وہ اس اچانک حملے کے لیے تیار نہ تھے۔ لہٰذا بھاگے اور منتشر ہو گئے۔

رمضان المبارک ۸ ہجری میں آپ کا دوسرا سریہ سواع کی جانب تھا۔ یہ ہذیل کا بت تھا۔ جسے منہدم کرنا تھا۔ اس بت کی شکل عورت جیسی تھی جو سیدنا شیث علیہ السلام کے بیٹے کے نام پر بنایا گیا تھا۔ فتح مکہ سے قبل یہاں ہر سال میلہ لگتا تھا۔ جب سیدنا عمرو العاص رضی اللہ عنہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ وہاں پہنچے تو وہاں اس کا مجاور ملا۔ اس نے آپ سے مخاطب ہو کر کہا۔

''آپ کیا چاہتے ہیں؟''

''مجھے اللہ کے رسول ﷺ نے حکم دیا ہے کہ سواع کو توڑ دوں۔'' آپ نے جواب دیا۔

''مگر تم اس پر قادر نہ ہو سکو گے۔'' مجاور پھر بولا۔

''کیوں۔؟'' آپ نے دریافت فرمایا۔

''وہ محفوظ ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''اب تک تو باطل ہی میں ہے تیری خرابی ہو۔ کیا وہ سنتا ہے یا وہ دیکھتا ہے۔'' یہ کہہ کر آپ بت کے پاس گئے اور ایک ہی ضرب میں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے ''تم نے کیا دیکھا۔؟''

بت توڑنے کے بعد آپ نے مجاور سے پوچھا تو گویا ہوا۔

''میں اللہ کے لیے اسلام قبول کرتا ہوں۔''

نبی رحمت ﷺ آپ کو مختلف ذمہ داریاں سونپتے رہتے تھے۔ جنہیں آپ بڑی محبت، لگن، شوق اور خوش اسلوبی سے سرانجام دیتے تھے۔ دعوت اسلام کا خط دے کر آپ کو عمان کی طرف بھیجا گیا تو وہاں کے حاکم اور اس کے بھائی عبید وجیفر نے اسلام قبول کر لیا۔ اپنے امراء کی پیروی میں اور بھی بہت سے لوگ دامن اسلام سے وابستہ ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ کو جب اطلاع ملی تو بے حد مسرور ہوئے اور لوگوں کو اسلامی تعلیم اور درس قرآن کے لیے وہاں کے عامل مقرر کر دیئے گئے۔ آپ دو سال تک وہاں فریضہ تبلیغ ادا کرتے رہے کہ خلیفۃ الرسول سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا گرامی نامہ ملا لکھا تھا۔

''سید الانبیاء ہمیں داغ مفارقت دے کر آپ رفیق اعلیٰ کے پاس تشریف لے گئے ہیں۔ میرے آقا ﷺ نے جو کام آپ کے سپرد کیا تھا اسے بجا لاتے رہیں۔''

عہد صدیقی میں جب فتنہ ارتداد اٹھا تو ان دنوں آپ عمان میں ہی تھے چنانچہ ان فتنوں کو دبانے کے لیے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آپ کو مناسب ہدایات بھیجیں تو آپ بحرین کے راستے آگے بڑھے۔ راستے میں قبیلہ بنی عامر میں قرہ بن ہبیرہ کے ہاں قیام فرمایا۔

اس نے آپ کی بڑی خاطر و مدارت کی۔ جب آپ وہاں سے روانہ ہونے لگے تو قرہ بن ہبیرہ آپ کو علیحدگی میں لے گیا اور کہا ''اگر عربوں سے زکوٰۃ لی گئی تو کسی کی امارت قبول نہ کرے گا اگر زکوٰۃ کا طریقہ بند کر دیا گیا تو مطیع و فرمانبردار ہوں گا۔''

آپ نے سنا تو بڑے جوش سے بولے۔

''قرہ! کیا تم کافر ہو گئے ہو، مجھ کو عربوں سے ڈراتے ہو۔ اللہ کی قسم! میں ایسے لوگوں کو گھوڑوں کے ٹاپوں سے مسل ڈالوں گا۔''

آپ مدینہ منورہ پہنچے تو خلیفۃ الرسول نے آپ کو بنو قضاعہ کے مرتدین کی سرکوبی کے لیے روانہ فرمایا۔ وہاں پہنچے تو خوب گھمسان کا رن پڑا۔ بالآخر بنو قضاعہ کو شکست فاش ہوئی اور ان سے زکوٰۃ وصول کی۔ انہیں دوبارہ اسلام پر قائم کیا اور پھر عمان لوٹ گئے۔

جب ملک شام کی طرف اسلامی افواج روانہ کی گئیں تو آپ کو سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا خط مبارک ملا مرقوم تھا۔

''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو عمان کا والی مقرر کیا تھا۔اس لیے میں نے تم کو واپس بھیج دیا تھا لیکن اب میں تم کو ایسے کام پر لگانا چاہتا ہوں جو تمہاری دنیا و آخرت دونوں کے لیے مفید ہے۔''

خط مبارک پڑھ کر آپ نے جواباً لکھا۔

''یاخلیفۃ الرسول! میں اللہ کا ایک تیر ہوں اوراب اللہ کے بعد آپ اس کے تیر انداز ہیں،آپ کو اختیار ہے جدھر چاہیں پھینکیں۔''

خط کا جواب پڑھ کر خلیفہ ثانی رضی اللہ عنہ بہت خوش ہوئے اور پھر آپ کو فلسطین کی مہم پر روانہ فرما دیا۔

اجنادین،دمشق،فحل،یرموک، بیت المقدس اور دوسرے کئی محاذوں پر خوب داد شجاعت دی اوراپنی قائدانہ صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ فرمایا۔جب سیدنا عبیدہ بن الجراع رضی اللہ عنہ طاعون عمواس میں داعی حق کو لبیک کہہ گئے تو انہوں نے آپ کو اپنا جانشین مقرر فرمایا اورآپ نے پیش قدمی روک کر طاعون زدہ مقامات سے فوجیں ہٹالیں۔

عہد فاروقی میں فتوحات کا سلسلہ عروج پر تھا۔سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے حوصلے بلند تھے۔چاہتے تھے کہ کسی جگہ تنہا اپنی تلوار کے جوہر دکھائیں۔لہٰذا خلیفہ دوئم امیر المومنین سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مصر پرحملہ کرنے کی اجازت طلب کی۔لیکن آپ کو دو وجہوں سے اجازت مرحمت فرمانے میں پس وپیش تھی۔اولاً شام کی مہم سرکرنے کے بعد اسلامی فوجوں نے ابھی دم نہ لیا تھا اور ثانیاً شاہ مصر مقوقس کا تھوڑی فوج سے مقابلہ کرنا دشوار تھا۔لیکن سیدنا عمر بن العاص رضی اللہ عنہ کے جذبہ وحوصلہ مندی اوراصرار کے بعد اجازت دے دی گئی اور سیدنا زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کو ایک جمیت کے ساتھ امداد کے لیے بھی روانہ فرمادیا۔معرکہ ہوا اور باطل کو ہر محاذ پر شکست سے دوچار ہونا پڑا اورآپ فاتح مصر کی حیثیت سے وہاں داخل ہوئے۔سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے آپ کو وہاں کا گورنر مقرر فرما دیا۔کچھ دنوں بعد عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد سیدنا

عثمان غنی ذوالنورین رضی اللہ عنہ مسند خلافت پر فائز ہوئے۔ انہوں نے آپ کو ۲۸ ہجری میں گورنری سے معزول کر دیا۔ لیکن اطاعت خلیفہ فرض تھی لہٰذا فلسطین میں رہائش اختیار کر لی۔ جب کبھی آپ کے سپرد کوئی کام کیا جاتا آپ بسروچشم بجا لاتے۔ سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو بھی آپ پر بڑا اعتماد و بھروسہ تھا۔ کبھی کبھی مدینہ منورہ بھی تشریف لاتے اور حاضر خدمت ہوتے۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے عہد میں جب جنگ جمل ہوئی تو آپ نے گوشہ تنہائی سے قدم باہر نہ رکھا۔ سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو بڑی بے دردی سے جب شہید کر دیا گیا تو قصاص کے سلسلہ میں آپ نے سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا ساتھ دیا۔

نہروان میں خارجیوں کی شکست اور قتل عام کے بعد ان کے بقیہ افراد نے فیصلہ کیا کہ سارا فساد سیدنا علی رضی اللہ عنہ و سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی وجہ سے ہے۔ لہٰذا ان کا کام تمام کر دینا چاہیے۔ ۱۷ ہجری رمضان المبارک ۴۰ ہجری کی شب ابن ملجم نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ پر برک بن عبداللہ نے سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ پر اور عمرو بن بکر تمیمی نے سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ پر قاتلانہ حملہ کا پروگرام بنایا۔ اس حملے میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے۔ سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ پر حملہ کرنے کی قاتل کو ہمت و جرأت نہ ہوئی اور سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی جگہ قاضی مصر شہید ہو گیا جو آپ کی جگہ نماز پڑھا رہا تھا کیونکہ اس دن آپ کی طبیعت ناساز تھی۔

سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد مبارک میں آپ کو مصر کا گورنر بنا دیا گیا۔ عمر کافی ہو چکی تھی۔ ۲ رمضان ۴۳ ہجری میں بیمار پڑے اور عید الفطر کے دن نوے سال کی عمر میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ آپ کہا کرتے تھے کہ اس شخص پر تعجب ہے جو موت کے قریب ہو کر ہوش بجا رکھتا ہو مگر موت کی حقیقت بیان نہ کرے۔ چنانچہ جب آپ پر موت کی حالت طاری ہوئی تو آپ کے بیٹے عبداللہ نے باپ کو وہ بات یاد دلائی اور عرض کی ''آپ کی عقل آپ کے ساتھ ہے موت کا حال بیان کریں۔''

''بیٹا! موت اس سے برتر ہے کہ اسے بیان کیا جائے کچھ تم سے بیان کروں گا۔

میرے پیٹ میں کھجور کے کانٹے ہیں اور میری سانس سوئی کے ناکے سے نکلتی ہے۔"

نماز جنازہ آپ کے بیٹے نے پڑھائی اور پھر مقطم میں سپرد خاک کر دیئے گئے۔ آپ نے اپنے پیچھے دولڑکے عبداللہ اور محمد چھوڑے جو خولہ بنت حمزہ کے بطن سے تھے۔

سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا قد درمیانہ، اعضاء مضبوط و قوی، پیشانی کشادہ، آنکھیں سیاہ اور بڑی تھیں۔ قرآن سے خاص ذوق تھا۔ انتالیس احادیث مبارکہ آپ سے مروی ہیں جن میں تین متفق علیہ ہیں۔ تعلیم و تلقین بھی نومسلموں کو فرمایا کرتے تھے۔ تمام مسائل میں قرآن وحدیث سے کام لیتے تھے۔ حق پرست تھے۔ عقل و دانش اور تدبیر سیاست کے لحاظ سے آپ کا شمار عرب کے مخصوص اشخاص میں ہوتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے بارے میں ارشاد فرمایا تھا

"تم اسلام میں صائب الرائے ہو۔"



عقبہ بن نافع رض

چشم فلک نے یہ حیرت انگیز نظارہ دیکھا کہ تمام درندے اپنے بچوں کو اٹھائے جنگل سے بھاگ رہے ہیں اور سانپ بچھو وغیرہ بھی ان کے پیچھے پیچھے جا رہے ہیں اس طرح دیکھتے دیکھتے یہ علاقہ تمام وحوش اور حشرات الارض سے خالی ہو گیا

اسلام کے اولوالعزم، مستجاب الدعوات سپہ سالار

”یا الٰہی اگر یہ سمندر میرے راستے میں حائل نہ ہوتا تو جہاں تک زمین ملتی میں تیری راہ میں جہاد کرتا چلا جاتا۔“

یہ کہہ کر سوار نے اپنے صبا رفتار گھوڑے کو جست دے کر سمندر میں ڈال دیا اور جب پانی گھوڑے کی رانوں تک پہنچ گیا تو اس نے اسے روک لیا اور تلوار ہوا میں لہراتے ہوئے بڑے جوش اور جذبے سے یوں گویا ہوا۔

”اللہ ربّ العزت تو خوب جانتا ہے کہ تیرا یہ عاجز بندہ اس نیت سے گھر سے نکلا تھا کہ تیرے ولی ذوالقرنین کی طرح زمین کی آخری حدوں تک تیرا نام بلند کرے تاکہ تیرے سوا کوئی دوسرا نہ پوجا جائے لیکن آج اس سمندر نے اس کا راستہ روک لیا ہے۔“ اللہ کے دین کے غلبہ کی تڑپ اور اس کے لیے اپنی تمام تر توانائیاں صرف کر دینے والے اس سوار کو دنیا عقبہ بن نافع کے نام سے جانتی ہے۔

سیدنا عقبہؓ بن نافع کا شمار پہلی صدی ہجری کے نامور سپہ سالاروں میں ہوتا ہے۔ وہ مشہور صحابی سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فاتح مصر کے بھانجے تھے۔ ان کی ولادت عہد رسالت

کے آخری سالوں میں ہوئی۔ سیدنا عقبہ کی پرورش اور تعلیم و تربیت نہایت پاکیزہ ماحول میں ہوئی۔ وہ جوان ہوئے تو اپنے اعلیٰ کردار، شجاعت، مصالحت، ذوق عبادت اور شوق جہاد کی بناء پر نہ صرف بنوفہر بلکہ دوسرے لوگوں میں بھی نہایت عزت و احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ لوگ انہیں ایک مستجاب الدعوات جوان صالح سمجھتے تھے۔ عنفوان شباب میں وہ جہاد فی سبیل اللہ کی خاطر اپنے ماموں سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے پاس مصر چلے گئے اور وہاں دشمن کے خلاف کئی معرکوں میں داد شجاعت دی۔

''تاریخ مغرب'' میں سیدنا عقبہ کے قیام مصر کے زمانے کی ایک دلچسپ روایت بیان کی گئی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے زمانہ ولایت میں سیدنا عقبہ بن نافع مصر گئے اور وہاں کے کسی گاؤں میں قیام کیا، ان کے ساتھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چند صحابہ رضی اللہ عنہم بھی تھے۔ ان میں جلیل القدر صحابی سیدنا عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ ایک دن ان سب کے سامنے دستر خوان بچھا ہوا تھا کہ اچانک ایک چیل نے کھانے پر جھپٹا مارا اور ایک ہڈی لے اڑی۔ یہ دیکھ کر سیدنا عقبہؒ نے کہا ''اللہ کرے اس کی گردن ٹوٹ جائے۔'' یہ کہنا تھا کہ چیل سر کے بل گری اور اس کی گردن ٹوٹ گئی۔

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا۔ سیدنا عقبہ نے پوچھا ''اے ابوعبداللہ آپ کو کیا ہو گیا ہے؟'' سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''میں نے سنا ہے کہ اس جانب بعض لوگ لشکر کشی کریں گے اور سب کے سب شہید ہو جائیں گے۔'' سیدنا عقبہ نے فوراً ہاتھ اٹھائے اور دعا کی ''یا اللہ میں بھی ان میں سے ایک ہوں۔'' سیدنا عقبہ کی یہ دعا ان کے شوق شہادت کی مظہر تھی۔

سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے اپنی وفات 43 ہجری سے کچھ عرصہ پہلے سیدنا عقبہؒ کو عساکر افریقیہ کا سپہ سالار مقرر کیا۔ اسی زمانے میں انہوں نے سوڈان پر یلغار کی اور کئی علاقوں کو فتح کرتے ہوئے عذامس تک پہنچ گئے۔ وہ پہلے مسلمان سپہ سالار ہیں جنہوں نے سوڈان میں پرچم اسلام بلند کیا۔ 50 ہجری میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے انہیں شمالی افریقہ کی مہم کا قائد مقرر کیا تو انہوں نے دس ہزار سرفروشوں کے ساتھ ایسی زبردست یلغار کی کہ سارے بلاد

مغرب میں زلزلہ پڑ گیا۔ مجاہدین اسلام نے تیونس (قرطاجنہ) تک کا علاقہ فتح کرلیا اور رومیوں اوران کے ساتھی بربریوں کی سخت گوشمالی کی۔ اس مہم کے دوران میں ایک مرتبہ وہ اپنے لشکر کے ساتھ ایک لق ودق صحرا میں سے گزر رہے تھے کہ لشکر کے پاس پانی کا ذخیرہ ختم ہوگیا۔ دور دور تک پانی یا کسی آبادی کا نام ونشان تک نہ تھا، لوگ پانی کی تلاش میں ادھر ادھر بہت دوڑے لیکن ناکام واپس آئے۔ یہ بڑا نازک وقت تھا کیونکہ ہزاروں آدمیوں اور جانوروں کی زندگیاں خطرے میں تھیں۔ اس وقت سیدنا عقبہ بن نافع نے دو رکعت نماز پڑھ کر ایک طویل دعا کی۔ اللہ کی شان، اسی وقت سیدنا عقبہؒ کے گھوڑے نے اپنے سم سے زمین کو کریدنا شروع کیا۔ جب تھوڑی سی ریت ہٹ گئی تو ایک بڑا پتھر دکھائی دیا۔ سیدنا عقبہؒ کے حکم سے اس پتھر کو ہٹایا گیا تو اس کے نیچے سے ٹھنڈے اور میٹھے پانی کا ایک چشمہ نکل آیا۔ عقبہؒ نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور بلند آواز سے پکارے۔ ''اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے پانی بھیج دیا۔'' اہل لشکر جو پیاس سے نڈھال تھے، فرط مسرت سے بے خود ہوگئے۔ انہوں نے اس چشمے سے چھوٹی چھوٹی نالیاں مختلف سمتوں میں نکالیں اور مشکوں اور برتنوں میں پانی کا ذخیرہ کرلیا۔ اس کے بعد اس واقعہ کی نسبت سے اس مقام کا نام ''ماء الفرس'' (گھوڑے کا چشمہ) مشہور ہوگیا۔

بلاد مغرب کی مہم سے فارغ ہوکر سیدنا عقبہؒ نے سوچا کہ اس علاقے میں ایک ایسا شہر بسانا چاہیے جو اسلامی قوت کا مرکز ہو اور نہ صرف سرکش بربریوں کی شورشوں کی روک تھام کرسکے بلکہ رومیوں کے بحری حملوں کا موثر دفاع بھی کرسکے۔ چنانچہ انہوں نے صوبہ بیزاسین (Byzacene) کے وسط میں اقیروان کے مستحکم فوجی قلعے اور شہر کی بنیاد رکھی۔ سیدنا عقبہؒ نے جو جگہ شہر کی تعمیر کے لیے منتخب کی وہاں میلوں تک گھنا جنگل اور دلدلی علاقہ تھا جو حشرات الارض اور خونخوار درندوں کا مسکن تھا۔ جب انہوں نے ایسے خطرناک علاقے میں شہر کی تعمیر کا ارادہ ظاہر کیا تو ان کے ساتھیوں نے ان سے کہا

''اے امیر آپ نے ایسے گھنے جنگل اور دلدلوں میں شہر تعمیر کرنے کا حکم دیا ہے جس میں کوئی انسان قیام کرنا پسند نہیں کرسکتا۔ ہمیں ڈر ہے کہ سانپ اور خونخوار

درندے ہمیں نقصان پہنچائیں گے۔"

سیدنا عقبہؒ کے لشکر میں اٹھارہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور باقی سب لوگ تابعین تھے۔ عقبہؒ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ساتھ لے کر بارگاہ رب العزت میں بآواز بلند دعا کی "الٰہی تو ہمیں اپنے فضل وکرم سے نواز اور ہمیں یہ شہر آباد کرنے کی توفیق عطا فرما۔" دوسرے اہل لشکر نے بھی اس دعا میں نہایت خشوع وخضوع سے ان کا ساتھ دیا۔ پھر سیدنا عقبہؒ جنگل کے قریب گئے اور پکار کہا۔

"اے سانپو اور اے درندو! ہم رسول عربی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب اور تابعین ہیں۔ تم یہاں سے چلے جاؤ کیونکہ اس جگہ ہم اقامت اختیار کرنے والے ہیں۔ اگر تم یہاں سے نہ گئے تو ہم تمہیں ہلاک کرنے میں آزاد ہوں گے۔"

اس کے بعد چشم فلک نے یہ حیرت انگیز نظارہ دیکھا کہ تمام درندے اپنے بچوں کو اٹھائے جنگل سے بھاگ رہے ہیں اور سانپ بچھو وغیرہ بھی ان کے پیچھے پیچھے جا رہے ہیں۔ اس طرح دیکھتے دیکھتے یہ علاقہ تمام وحوش اور حشرات الارض سے خالی ہوگیا۔ اس کے بعد درخت کاٹ کر شہر کی تعمیر کا آغاز کر دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس واقعہ کے بعد چالیس برس تک اہل افریقہ نے اس علاقہ میں کسی بچھو، سانپ یا درندے کا نام ونشان تک نہ پایا۔

سیدنا عقبہؒ نے سب سے پہلے دارالامارۃ اور جامع مسجد کے لیے چار دیواری بنوائی۔ اس موقع پر قبلہ کی سمت کے بارے میں لوگوں میں اختلاف پیدا ہوگیا جس نے آہستہ آہستہ شدید صورت اختیار کر لی۔ سیدنا عقبہؒ کو اس سے بہت تشویش ہوئی اور انہوں نے اللہ تعالیٰ سے اس مشکل کے حل کی دعا مانگی۔ ایک دن اسی فکر میں سو گئے۔ خواب میں دیکھا کہ ایک نورانی صورت کے بزرگ آئے ہیں اور ان سے کہہ رہے ہیں "صبح جب اٹھو تو جھنڈا ہاتھ میں لے کر اس کو اپنی گردن پر رکھ لو، تم اپنے آگے تکبیر کی آواز سنو گے، دوسرا کوئی شخص اس آواز کو نہ سن سکے گا۔ اس جگہ کا خیال رکھو جہاں یہ تکبیر تم کو سنائی نہ دے بس وہی مقام تمہارا قبلہ اور محراب ہے......" اس کے بعد ان کی آنکھ کھل گئی۔ اسی وقت اٹھ کر وضو کیا اور نماز

پڑھی۔ پھر صبح کے انتظار میں بیٹھ گئے۔ جب پو پھٹی تو پھر دو رکعت نماز پڑھی۔ اس وقت انہوں نے اپنے سامنے تکبیر کی آواز سنی۔ لوگوں سے پوچھا کہ جو کچھ میں سن رہا ہوں کیا تمہیں بھی سنائی دے رہا ہے؟ انہوں نے کہا ''نہیں'' اب انہیں یقین ہو گیا کہ قبلہ کی سمت متعین کرنے میں ان کی راہنمائی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو رہی ہے۔ چنانچہ انہوں نے جھنڈا اٹھایا اور اس کو گردن پر رکھ کر تکبیر کی آواز کے پیچھے پیچھے چلے لوگوں کا ایک جم غفیر بھی ان کے ساتھ تھا۔ آخر اس محراب تک پہنچے جو جامع مسجد کی چار دیواری میں پہلے ہی موجود تھی۔ یہاں تکبیر کی آواز بند ہو گئی۔ اس پر انہوں نے اسی مقام پر جھنڈا گاڑ دیا اور لوگوں سے کہا کہ یہ تمہاری محراب اور سمت قبلہ ہے۔ چنانچہ جامع مسجد اور شہر کی دوسری مسجدوں میں بھی قبلہ کا رخ اسی کے مطابق رکھا گیا۔

یہ قضیہ طے ہو جانے کے بعد شہر کی تعمیر تیزی سے شروع ہو گئی اور جلد ہی ''اقیروان'' کا عظیم الشان شہر وجود میں آ گیا۔ اس کی جامع مسجد نہایت شاندار تھی۔ اس کا طول تین ہزار ذراع اور عرض چھ سو ذراع تھا۔ (ذراع نصف گز انگریزی کے برابر ہوتا ہے) اسی طول و عرض سے مسجد کی وسعت اور شان کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اقیروان کی تاسیس سے مسلمانوں کو ایک مضبوط فوجی ٹھکانہ مل گیا اور انہیں جمعیت خاطر بھی حاصل ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی افریقہ میں اشاعت اسلام کا راستہ صاف ہو گیا۔

سیدنا عقبہؒ کو نو تعمیر شہر میں زیادہ عرصہ قیام کرنا نصیب نہ ہوا۔ اقیروان کے آباد ہونے کے فوراً بعد 55 ہجری میں ہوا۔ سیدنا مسلمہ رضی اللہ عنہ نے سیدنا عقبہؒ کو معزول کر کے ان کی جگہ اپنے ایک غلام ابوالمہاجر کو افریقہ کا والی مقرر کیا۔ اور ابوالمہاجر نے قیروان پہنچ کر سیدنا عقبہؒ کے ساتھ ان کے شایان شان برتاؤ نہ کیا۔ اس سے ان کو سخت رنج ہوا اور انہوں نے دمشق جا کر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے ابوالمہاجر کی شکایت کی۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کو دوبارہ افریقہ کی ولایت پر بھیجنے کا وعدہ کیا لیکن اپنی زندگی میں انہیں یہ وعدہ پورا کرنے کا موقع نہ مل سکا کیونکہ ابوالمہاجر نے الجزائر کی طرف پیش قدمی شروع کر دی تھی۔ ابوالمہاجر الجزائر میں داخل ہو کر

تلمسان تک بڑھتے چلے گئے، اس دوران میں انہوں نے ایک ممتاز بربری سردار کسیلہ بر نسی کو شکست فاش دی۔ شکست کھانے کے بعد کسیلہ نے اسلام قبول کر لیا اور ابوالمہاجر نے اس کے مرتبے کا لحاظ کرتے ہوئے اسے اپنے مشیروں میں شامل کر لیا۔

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات 60 ہجری کے بعد یزید اوّل تخت حکومت پر بیٹھا۔ اس نے 62 ہجری میں اپنے والد ماجد کے وعدہ کو پورا کیا اور سیدنا عقبہؒ بن نافع کو دوبارہ افریقہ کا والی مقرر کیا۔ سیدنا عقبہؒ فوراً عازم قیروان ہو گئے اور وہاں پہنچ کر ابوالمہاجر سے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ چونکہ سرکش بربری اور رومی نت نئے فتنے اٹھاتے رہتے تھے۔ سیدنا عقبہؒ نے عزم بالجزم کر لیا کہ خواہ انہیں ساری عمر لڑنا پڑے وہ ان سرکش عناصر کی بیخ کنی کر کے رہیں گے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے لڑکوں کو بلایا اور ان سے مخاطب ہو کر کہا "میرے بچو! میں نے اپنی جان کو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ پر بیچ دیا ہے۔ لہٰذا جب تک زندہ رہوں گا، کفار سے جہاد کرتا رہوں گا۔" اس کے بعد وہ ایک مضبوط فوج کے ساتھ قیروان سے وسطی المغرب کی طرف بڑھے اور باغہ (یا باغایہ) پہنچ کر پڑاؤ ڈالا۔ وہاں بڑی تعداد میں رومی اور بربری جمع تھے۔ سیدنا عقبہؒ نے ایک خونریز معرکہ کے بعد ان کے متحدہ لشکر کو شکست دی۔ یہ لوگ شکست کھا کر شہر میں محصور ہو بیٹھے۔ اسلامی لشکر کچھ عرصہ محاصرہ کیے رہا لیکن محصورین نے شہر سے باہر نکلنے کی ہمت نہ کی۔ سیدنا عقبہؒ نے وہاں زیادہ ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اور زان کے علاقہ میں واقع رومیوں کے ایک بڑے مرکز لمیس پر دھاوا بول دیا۔ لمیس میں رومیوں کا ایک جرار لشکر موجود تھا لیکن اس نے بری طرح شکست کھائی۔ اب سیدنا عقبہؒ نے آگے بڑھ کر فزان کو جا گھیرا۔ وہاں کے حکمران کو مقابلہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی اور اس نے مسلمانوں کی اطاعت قبول کر لی۔ فزان کی تسخیر کے بعد سیدنا عقبہؒ نے ودان، قفصہ اور قسطیلہ پر پرچم اسلام بلند کیا اور تھوڑے وقفہ کے بعد اربہ کے مقام پر رومیوں کے ایک زبردست لشکر کو شکست دیتے ہوئے تاہرت کا رخ کیا۔ وہاں کے رومیوں کو مسلمانوں کی پیش قدمی کی اطلاع ملی تو انہوں نے اپنی مدد کے لیے بربریوں کو بلا لیا۔ اس طرح رومیوں اور بربریوں کا ایک بہت بڑا لشکر

جمع ہو گیا۔ ان کے مقابلے میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی لیکن انہوں نے اپنی جانیں راہ حق میں وقف کر رکھی تھیں۔ اس لیے دشمن کی کثرت تعداد کو مطلق خاصر میں نہ لائے اور سروں سے کفن باندھ کر کفار کی مہیب طاغوتی قوت پر ٹوٹ پڑے۔ رومی اور بربری جنگجو جان توڑ کر لڑے لیکن مسلمان سرفروشوں کے سامنے ان کی کچھ پیش نہ چلی اور بالآخر انہوں نے بری طرح شکست کھائی۔ تاہرت سے سیدنا عقبہؒ نے طنجہ کا رخ کیا جو بحر روم کے کنارے افریقہ کا آخری شہر اور رومیوں کا ایک مضبوط مرکز تھا۔ وہاں کا حکمران جولیان (Julian) بڑے اثر و اقتدار کا مالک تھا اور مغرب کے بیشتر حکمران اس کے باجگذار تھے۔ اس نے باختلاف راویت سیدنا عقبہؒ سے شکست کھا کر یا خود ہی برضاؤ رغبت مسلمانوں کی اطاعت قبول کر لی۔ سیدنا عقبہؒ کا ارادہ تھا کہ طنجہ سے آبنائے جبل الطارق کو عبور کر کے اندلس (Spain) پر حملہ آور ہوں۔ لیکن جولیان نے انہیں مشورہ دیا کہ ایسا کرنا مناسب نہ ہوگا کیونکہ کوہ اطلس کبیر اور سوس کے کافر بربروں سے کسی بھی وقت اسلامی اقتدار کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ چنانچہ سیدنا عقبہؒ نے طنجہ سے سوس ادنیٰ کا رخ کیا اور زرھون، یعلی نفیس، سوس اقصیٰ اور درعہ کو مسخر کرتے ہوئے صحرائے لمتونہ تک پہنچ گئے۔ وہاں سے بحر اوقیانوس کے شمالی ساحل کی طرف بڑھے اور بلاد آسفی میں جبل درن (اطلس کبیر) کے مصمودہ بربر قبائل اور پھر تارودانت تک مقابل اطلس (Antialtlas) کے بربروں کو مطیع و منقاد کرتے ہوئے بحر اوقیانوس کے شمالی ساحل پر پہنچ گئے۔ اب وہ سارا شمالی افریقہ فتح کر چکے تھے لیکن جذبۂ جہاد کا یہ عالم تھا کہ بحر اوقیانوس کی وسعتوں کو اپنے راستے میں حائل دیکھ کر بصد حسرت و یاس آسمان کی طرف نظر کی اور کہا

"یا الٰہی اگر یہ سمندر میرے راستے میں حائل نہ ہوتا تو جہاں تک زمین ملتی میں تیری راہ میں جہاد کرتا چلا جاتا۔"

پھر انہوں نے اپنے صبا رفتار گھوڑے کو جست دے کر سمندر میں ڈال دیا اور جب پانی گھوڑے کی رانوں تک پہنچ گیا تو انہوں نے اسے روک لیا اور تلوار ہوا میں لہراتے ہوئے بڑے جوش اور جذبے سے یوں گویا ہوئے۔

''اللہ ربّ العزت تو خوب جانتا ہے کہ تیرا یہ عاجز بندہ اس نیت سے گھر سے نکلا تھا کہ تیرے ولی ذوالقرنین کی طرح زمین کی آخری حدوں تک تیرا نام بلند کرے تاکہ تیرے سوا کوئی دوسرا نہ پوجا جائے لیکن آج اس سمندر نے اس کا راستہ روک لیا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ ساحل سے بڑے بے دلی کے ساتھ واپس آئے۔

سیدنا عقبہؓ کی فتوحات نے تمام شمالی افریقہ پر مسلمانوں کا سکہ بٹھا دیا تھا اور بظاہر ان کی حریف کوئی بڑی قوت باقی نہ رہ گئی تھی لیکن دفعتہً کسیلہ برنسی کی غداری نے سارے افریقہ میں انقلاب برپا کر دیا۔

کسیلہ برنسی، سیدنا عقبہؓ کے پیشتر وابوالمہاجر سے شکست کھا کر مسلمان ہو گیا تھا اور ان کا مشیر بن گیا تھا۔ سیدنا عقبہؓ نے 62 ہجری میں دوسری مرتبہ افریقہ کی عنان حکومت سنبھالی تو ابوالمہاجر نے ان سے کسیلہ کی سفارش کی اور اس کے مرتبہ کا لحاظ رکھنے کا مشورہ دیا۔ سیدنا عقبہؓ ابوالمہاجر کو اپنا مخالف سمجھتے تھے۔ اس لیے اس سفارش اور مشورہ نے ان کے دل میں کسیلہ کے بارے میں بھی کھٹک پیدا کر دی۔ چند دن بعد انہوں نے بعض شکوک کی بناء پر یا انتظامی اور احتیاطی تدبیر کے پیش نظر ابوالمہاجر اور کسیلہ دونوں کو گرفتار کر لیا اور اپنی مہمات کے دوران میں انہیں پابہ زنجیر کر کے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھا۔ کسیلہ نے اسے اپنی توہین سمجھا اور بعد میں ایک موقعہ پر جب سیدنا عقبہؓ نے اسے جانور ذبح کرنے پر مجبور کیا تو وہ دل میں ان کا جانی دشمن بن گیا اور ان سے بدلہ لینے کے لیے موقع کی تلاش میں رہنے لگا۔ تاہم اس نے اپنے ظاہری رویہ میں کوئی فرق نہ آنے دیا۔

سیدنا عقبہؓ بحراوقیانوس کے شمالی ساحل سے واپس آتے ہوئے علاقہ زاب میں طنبہ کے مقام پر پہنچے تو اس اطمینان میں کہ اب کوئی مخالف و مزاحم باقی نہیں رہا اپنی فوج کو منتشر کر دیا۔ کہا جاتا کہ انہوں نے اپنے لشکر کو متعدد دستوں میں تقسیم کر کے قیروان کی جانب روانہ کر دیا اور اپنے ساتھ ایک مختصر سی جمعیت رکھی۔ اس اثناء میں کسیلہ ان کے لشکر سے فرار ہو گیا اور مسلمانوں کے مقابلہ کے لیے فوج جمع کرنی شروع کر دی۔

سیدنا عقبہؒ اپنی مختصر جمعیت کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے کہ صحرا کے کنارے تہودا کے مقام پر کسیلہ نے ایک جرار لشکر کے ساتھ انہیں آ گھیرا۔ سیدنا عقبہؒ نے تہودا کے رومیوں کو اسلام کی دعوت دی لیکن وہ سیدنا عقبہؒ کے ساتھ اتنے کم آدمی دیکھ کر مقابلہ پر آمادہ ہو گئے۔ انہیں کسیلہ کی سیدنا عقبہؒ سے عداوت کا علم تھا۔ چنانچہ انہوں نے عین اس وقت جب مسلمانوں نے تہودا کا محاصرہ کر رکھا تھا، کسیلہ کو پیغام بھیجا کہ سیدنا عقبہؒ سے انتقام لینے کا یہ بہترین موقع ہے کیونکہ ان کے پاس مٹھی بھر آدمی ہیں۔ کسیلہ یہ پیغام ملتے ہی ایک بڑے لشکر کے ساتھ تہودا پہنچ گیا اور مسلمانوں پر ٹوٹ پڑا۔ مسلمانوں کی تعداد تین سو کے لگ بھگ تھی جبکہ کسیلہ کا لشکر چھ ہزار سے زیادہ بربری جنگجوؤں پر مشتمل تھا لیکن سیدنا عقبہؒ اور ان کے ساتھیوں کے دلوں میں تو شوق شہادت کے شعلے بھڑک رہے تھے...... اپنے سے بیس گنا بربریوں کو مطلق خاطر میں نہ لائے۔ ان غیور مردان حق نے اپنی ڈھالیں اور تلواروں کے نیام توڑ پھینکے اور سروں پر کفن باندھ کر دشمن کی صفوں میں گھس گئے۔ بربریوں کی کثیر تعداد ماری گئی لیکن سیدنا عقبہؒ اور ان کے تمام جانباز ساتھی بھی مردانہ وار لڑتے ہوئے ایک ایک کر کے شہید ہو گئے۔ یوں سیدنا عقبہؒ کے دل میں رتبہ شہادت پر فائز ہونے کی جو آرزو مدت سے مچل رہی تھی وہ پوری ہو گئی۔ اس موقع پر ابوالمہاجر نے جو پابہ زنجیر سیدنا عقبہؒ کے ساتھ تھے، عجیب مومنانہ کردار کا مظاہرہ کیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ لڑائی شروع ہونے سے پہلے سیدنا عقبہؒ نے انہیں آزاد کر دیا اور کہا کہ تم قیروان جا کر مسلمانوں کو منظم کرو، میں شہادت حاصل کرتا ہوں لیکن ابوالمہاجر نے کہا کہ میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گا کیونکہ میرا مطلوب ومقصود بھی جام شہادت پینا ہے۔ چنانچہ انہوں نے بھی سیدنا عقبہؒ اور دوسرے مسلمانوں کے پہلو بہ پہلو نہایت بہادری سے لڑ کر شہادت پائی۔ ان تمام شہیدان راہ حق کی قبریں آج بھی اس مقام پر موجود ہیں۔ یہ گاؤں سیدنا عقبہؒ کے نام پر "سیدی عقبہ" کہلاتا ہے اور تہودا کی قدیم جائے وقوع کے قریب بسکرہ کے جنوب مشرق میں چند میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

سیدنا عقبہؒ کی شہادت کے بعد کسیلہ نے قیروان پر قبضہ کر لیا لیکن پانچ سال بعد

عبدالملک بن مروان کے عہد حکومت میں زہیر بن قیس بلوی نے اس کو قیروان سے نکلنے پر مجبور کر دیا اور پھر ممش کے مقام پر ایک خونریز جنگ کے بعد اس کو عبرتناک شکست دی۔ اس لڑائی میں کسیلہ اور اس کے ساتھ بڑے بڑے بربری اور رومی سردار مارے گئے اور یوں سیدنا عقبہؓ کا قاتل اپنے انجام کو پہنچ گیا۔

❁❁❁

قتیبہ بن مسلم رض



"اللہ کی قسم! اگر قتیبہؒ جیسا فاتح ہم (اہل عجم) میں ہوتا تو ہم اس کی لاش کو محفوظ رکھتے اور دشمنوں سے نبرد آزما ہوتے وقت اس تابوت کی برکت سے فتح طلب کرتے۔" ایک خراسانی کا خراج عقیدت

تاریخ اسلام کے نازش روزگار سپہ سالار اور فاتح

"الٰہی تو جانتا ہے کہ میری غرض تیری راہ میں جہاد کرنا اور تیرے دین کو سربلند کرنا ہے تو مجھے اور میرے ساتھیوں کو اس دریا میں غرق نہ کرنا اور اگر میری نیت اس کے سوا کچھ اور ہے تو مجھے اس دریا میں غرق کر دینا۔"

یہ دعا کر کے سپہ سالار نے اپنا گھوڑا دریا میں ڈال دیا اور ان کے ساتھ ہی پورا لشکر پیادہ سوار دریا میں اتر گیا۔ اللہ کی شان کسی مجاہد کو ذرا سا بھی نقصان نہیں پہنچا اور سارے مجاہدین دریا کو اس طرح عبور کر گئے جیسے خشک زمین پر چل رہے ہوں۔ مسلمانوں کے یہ مستجاب الدعوات سپہ سالار جن کا اللہ تعالیٰ کی شان رحیمی پر اس قدر پختہ ایمان تھا کہ ہر قسم کے مادی اسباب سے بے نیاز ہو کر محض دین حق کی خاطر حد نظر تک پھیلے ہوئے دریائے زخار میں کود پڑے، قتیبہ بن مسلم باہلی تھے۔

ابوحفص قتیبہ بن مسلم باہلی کا شمار تاریخ اسلام کے نازش روزگار سپہ سالاروں اور فاتحین میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے جوش ایمان، عزم و ہمت، شجاعت و بسالت اور عظمت کردار کے جو نقوش صفحۂ تاریخ پر ثبت کیے وہ قیامت تک نہ مٹ سکتے ہیں اور نہ ماند پڑ سکتے

ہیں۔ پوری دنیا کی تاریخ ہو یا صرف مسلمانوں کی، کوئی بھی مورخ اس کو احاطۂ تحریر میں لاتے وقت قتیبہ بن مسلم کے نام اور کارناموں سے صرف نظر نہیں کرسکتا۔ فی الحقیقت ایسا کرنا ممکن ہی نہیں۔ وہ بلاشبہ قرن اول کی ایسی تابندہ شخصیت ہیں، جن پر ملت اسلامیہ بجا طور پر ناز کرسکتی ہے۔

قتیبہ ایک فوجی گھرانے کے چشم وچراغ تھے۔ کنیت باختلافِ روایت ابوالحفص یا ابوالحارث تھی۔ ان کے والد مسلم قبیلہ باہلہ کے سردار اور خلیفہ عبدالملک بن مروان کی فوج میں افسر تھے۔ ''دائرہ معارف اسلامیہ'' کے مطابق قتیبہ 49ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے ابتدائی تعلیم وتربیت کی تفصیل کسی کتاب میں نہیں ہے۔ لیکن قرآئن سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بہت عمدہ تعلیم وتربیت پائی کیونکہ عنفوانِ شاب میں جب وہ منظر عام پر آئے تو ان کی شہرت ایک نڈر سپاہی اور صاحب کردار نوجوان کی تھی۔ انہوں نے خلیفہ عبدالملک کے عہد میں حجاج بن یوسف کی فوج میں شامل ہوکر عبدالرحمٰن بن محمد بن اشعث کے خلاف کئی معرکوں میں بھرپور حصہ لیا اور اپنی شجاعت اور بے خوفی کی دھاک بٹھادی۔ حجاج بن یوسف ان کی عسکری صلاحیتوں سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے خلیفہ سے منظوری لے کر ۸۵ھ (اور بروایت دیگر ۸۶ھ) میں قتیبہ کو خراسان کا والی مقرر کیا۔ اس منصب پر فائز ہونے کے بعد قتیبہ کی اس شاندار زندگی کا آغاز ہوا جس نے انہیں دنیا کے عظیم ترین فاتحین میں لاکھڑا کیا۔

قتیبہ نے خراسان کے دارالحکومت مرو (MERV) پہنچ کر سب سے پہلے اپنی فوج کو خاص قسم کی تربیت دینے کا اہتمام کیا کیونکہ ان کے نزدیک کامیابی کے لیے جذبۂ ایمان کے ساتھ اعلیٰ حربی صلاحیت بھی بہت ضروری تھی۔ انہوں نے اپنی زندگی کے اچھے نمونے سے پوری فوج میں اولوالعزمی اور شجاعت و جرأت کا بے پناہ جذبہ پیدا کردیا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ فوج کی تنظیم نو اور تربیت تسلی بخش طور پر ہوچکی ہے تو ایک دن ساری فوج کو جمع کرکے اس کے سامنے جہاد کی اہمیت اور فضیلت پر ایک ولولہ انگیز خطبہ دیا۔ اس خطبہ نے سپاہیوں کے دلوں میں شوق شہادت کے شعلے بھڑکا دیئے اور وہ راہِ حق میں سردھڑ کی بازی

لگانے کے لیے تیار ہوگئے۔ اب وقت آ گیا تھا کہ جوش جہاد سے سرشار ان مجاہدین کو میدان جہاد میں سرگرم عمل کر دیا جائے۔ چنانچہ ۸۶ھ میں قتیبہؒ نے ترکستان پر یلغار کر دی۔ ترکستان کے بعض حصوں پر اگرچہ پہلے ہی مسلمانوں کا تسلط قائم ہو چکا تھا لیکن وہاں کے حکمران وقتاً فوقتاً علم بغاوت بلند کرتے رہتے تھے اور اس زمانے میں بھی ان کا رویہ باغیانہ تھا۔ اس کے علاوہ بعض علاقوں نے ابھی تک اسلامی حکومت کی اطاعت قبول نہ کی تھی۔ حسن اتفاق سے اس وقت ترکستان کے حکمرانوں میں باہم منافست تھی۔ قتیبہؒ طالقان پہنچے تو بلخ کے سردار بھی اطاعت قبول کر کے ان سے آ ملے۔ اس کے بعد قتیبہؒ نے دریائے جیحوں کے چکر کاٹ کر عبور کیا اور صغانیاں کی طرف بڑھے۔ شاہ صغانیاں کو مقابلہ کی ہمت نہ پڑی۔ اس نے تحائف و ہدایا کے ساتھ ان کا استقبال کیا اور سونے کی کنجی ان کی خدمت میں پیش کر کے اپنا مہمان بنایا۔ صغانیاں سے قتیبہؒ نے طخارستان (علاقۂ بدخشاں) کا رخ کیا۔ شاہ اخرون وشومان (طخارستان) کو جب اپنے حریب شاہ صغانیاں کی اطاعت کا حال معلوم ہوا تو اس نے بھی ایک کثیر رقم خراج کے طور پر دے کر اطاعت قبول کر لی۔ ان دونوں کو مطیع کرنے کے بعد قتیبہؒ اپنے بھائی صالح بن مسلم کو مفتوحہ علاقوں کے انتظام کی نگرانی کے لیے چھوڑ کر مرو واپس آ گئے۔ ان کی واپسی کے بعد صالح نے اپنے ساتھی، آزمودہ کار جرنیل نصر بن سیار کی مدد سے کاشان اور فرغانہ کے علاقے میں واقع شہر خشک (اخسیکت) بنجر اور رشت فتح کیے۔

مرو واپس پہنچ کر قتیبہؒ کو معلوم ہوا کہ بادغیس کے تورانی حکمران نیزک کے پاس عرصہ سے مسلمان قید ہیں۔ قتیبہؒ نے نیزک کو ان مسلمانوں کی رہائی کے لیے لکھا اس نے انہیں فوراً رہا کر دیا اور اس شرط پر اطاعت قبول کر لی کہ مسلمان بادغیس پر حملہ نہیں کریں گے۔ اس کے بعد وہ ترکستان کے معرکوں میں قتیبہؒ کا معاون و مددگار بن گیا۔

۸۷ھ میں قتیبہؒ نے اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت کے بھروسے پر دریائے جیحوں کو عبور کیا اور ماوراء النہر (یا بلادِ بخارا) کے اہم شہر بیکند کی طرف پیش قدمی کی۔ بیکند بت پرستوں کا نہایت مضبوط گڑھ تھا اور وہاں ایشیا بھر میں سب سے عمدہ اسلحہ تیار ہوتا تھا۔ اہل بیکند کو قتیبہؒ کی پیش قدمی کی خبر ملی تو انہوں نے صغد اور قرب و جوار کے دوسرے باشندوں سے مدد مانگی۔ ان

باشندوں نے ہر طرف سے مسلمانوں کو گھیرے میں لے لیا اور سارے راستے روک لیے۔ دو مہینے تک یہ کیفیت رہی کہ نہ قتیبہؒ کا کوئی قاصد اسلامی علاقے میں جا سکتا تھا اور نہ اسلامی حکومت کا کوئی قاصد ان سے رابطہ قائم کر سکتا تھا۔ حجاج بن یوسف والی بصرہ اس صورتحال سے بہت پریشان ہوا اور اس نے تمام مسجدوں میں قتیبہؒ اور ان کے لشکر کی سلامتی کی دعائیں کرائیں۔ ادھر قتیبہؒ نے اس خطرناک صورتحال کا بڑے عزم اور حوصلے کے ساتھ مقابلہ کیا۔ نہ دشمن کی کثرت تعداد نے ان کو ہراساں کیا اور نہ دشمن کی اڑائی ہوئی اس جھوٹی افواہ نے کہ حجاج فوت ہو گیا۔ ان کے پائے استقلال میں لغزش نہ آنے دی۔ ایک دن مسلمان سروں پر کفن باندھ کر دشمنوں پر اس طرح ٹوٹ پڑے کہ ان کا گھیرا ٹوٹ گیا اب وہ شہر کی طرف بھاگے۔ مسلمانوں نے ان کا تعاقب کیا اور ایک کثیر تعداد کو موت کے گھاٹ اتار ڈالا۔ پھر بھی بہت سے بھگوڑے شہر میں داخل ہو گئے اور دروازے بند کر لیے۔ قتیبہؒ نے نہایت سختی سے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ ایک روایت کے مطابق یہ محاصرہ پچاس دن تک جاری رہا۔ اس اثناء میں قتیبہؒ نے فصیلِ شہر کو گرانے کے لیے اس پر کاری ضربیں لگانی شروع کر دیں۔ اہل بیکند کو جب یقین ہو گیا کہ فصیل ٹوٹنے کی صورت میں ان کا زیادہ نقصان ہو گا تو انہوں نے اطاعت قبول کر لی اور شہر کے دروازے کھول دیئے۔ قتیبہؒ نے شہر میں داخل ہو کر چند دن وہاں قیام کیا اور پھر ورقہ بن نصر کو بیکند کا عامل مقرر کر کے مرو کو واپسی کا عزم کیا۔ ابھی وہ پانچ فرسخ ہی گئے تھے کہ اہل بیکند نے بغاوت کر دی اور ورقہ بن نصر کو شہید کر ڈالا۔ قتیبہؒ کو ان لوگوں کی غداری کی اطلاع ملی تو وہ غضب ناک شیر کی طرح واپس آئے اور شہر کو بزور شمشیر مسخر کر کے تمام فتنہ پردازوں کا قلع قمع کر ڈالا۔ ساتھ ہی شہر پناہ کو منہدم کرا کے زمین کے برابر کر دیا۔ ایک یک چشم بیکندی جو بغاوت کا سرغنہ تھا جب گرفتار ہو کر قتیبہؒ کے سامنے پیش ہوا تو اس نے اپنی جان کے فدیہ میں ریشمی کپڑے کے پانچ ہزار تھان دینے کی پیشکش کی۔ ان کی قیمت دس لاکھ درہم بنتی تھی۔ لیکن قتیبہؒ نے اس کی پیشکش کو ٹھکرا دیا اور یہ کہہ کر اس کو قتل کر دیا کہ مومن ایک سوراخ سے دوبارہ نہیں ڈسا جا سکتا۔ بیکند سے مسلمانوں کو کثیر مال غنیمت ہاتھ آیا۔ اس میں ہیرے جواہرات، اسلحہ اور سونے چاندی کے لاتعداد برتن بھی شامل تھے۔ مؤرخین نے

بیکند کے ایک بت کدے کا ذکر کیا ہے جس میں کئی بت ٹھوس خالص سونے کے تھے اور چالیس ہزار درہم کی چاندی تھی۔ ایک بت کی آنکھوں کی جگہ دو ہیرے تھے جو کبوتر کے انڈوں جتنے تھے۔قتیبہؒ نے یہ دونوں ہیرے مع دیگر سامان حجاج بن یوسف کو بھیج دیئے۔اس نے ایک خط میں ان کا شکریہ ادا کیا اور ان کی شجاعت و بسالت کی تعریف کی۔ بیکند نہ صرف ایک بارونق اور متمول شہر تھا بلکہ فوجی نقطۂ نظر سے بھی بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ اسے ماوراء النہر (وسط ایشیا) کا جنوبی دروازہ سمجھا جاتا تھا۔ بیکند میں تیار ہونے والے اسلحہ کی بھی سارے ایشیا میں بڑی دھوم تھی۔ کہا جاتا ہے، کہ وہاں سے مال غنیمت میں حاصل ہونے والے ہتھیار اگرچہ سپاہیوں میں بانٹ دیئے گئے تھے پھر بھی ان کی اس قدر مانگ تھی کہ ایک نیزہ ستر درہم میں بکا۔تلوار دوسو درہم اور سپر اس سے بھی زیادہ قیمت پر فروخت ہوئی۔ بیکند پر مکمل تسلط جمانے کے بعد قتیبہؒ واپس مرو آ گئے۔

۸۸ ہجری کو موسم بہار میں قتیبہؒ پھر مناسب تیاریوں کے ساتھ مرو سے بلاد بخارا کی جانب روانہ ہوئے اور نومشکث کو فتح کرتے ہوئے رامینہ (یا رامثنہ) پہنچے۔ وہاں کے باشندوں نے صلح کی درخواست کی جو قتیبہؒ نے منظور کر لی۔ان مہمات سے فارغ ہو کر انہوں نے مرو کو واپسی کا ارادہ کیا۔ راستے میں صغدی، ترکی، فرغانی اور چینی فوجوں نے متحد ہو کر اسلامی لشکر کے پچھلے حصے (ساقہ) پر حملہ کر دیا۔دشمنوں کے متحدہ لشکر کی قیادت خاقانِ چین کا بھتیجا (یا بروایت دیگر بھانجا) کر رہا تھا۔قتیبہؒ اپنے لشکر کے سے آگے نکل چکے تھے۔امیر ساقہ عبدالرحمٰن بن مسلم نے اپنی مختصر جمعیت کے ساتھ بڑی بہادری سے دشمن کے لشکر عظیم کو روکا اور اپنے بھائی قتیبہؒ کو اس حملہ کی اطلاع دی۔قتیبہؒ یہ ملتے ہی پلٹ پڑے اور دشمنوں کے ٹڈی دل پر قہر الٰہی بن کر ٹوٹ پڑے۔ دو لاکھ دشمن جنگجوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی لیکن انہوں نے اپنے جوش ایمانی کی بدولت دشمن کے متحدہ لشکر کو شکست فاش دی۔

ابن اثیرؒ کا بیان ہے کہ اس لڑائی میں بادغیس کے حکمران نیزک نے مسلمانوں کو قابل قدر امدادی اور خود بھی اسلامی لشکر میں شامل ہو کر بڑی بہادری سے لڑا۔ اس معرکے سے فارغ

۸۹ ہجری میں قتیبہؒ نے پھر بخارا کے قصد سے دریائے جیحوں کو عبور کیا۔ خرقانہ سفلی کے مقام پر پہنچے تو دشمن کا ایک بڑا لشکر ان کے مزاحم ہوا۔ قتیبہؒ نے اس لشکر کو شکست دی اور بخارا کے قریب پہنچ گئے۔ علامہ بلاذری کا بیان ہے کہ شاہ بخارا نے صلح کر کے اطاعت قبول کر لی لیکن ابن اثیر کہتے ہیں کہ بعض مشکلات کی بناء پر قتیبہؒ بخارا پر قبضہ نہ کر سکے۔ انہوں نے حجاج بن یوسف کو سارے حالات لکھ بھیجے۔ اس نے بخارا کا نقشہ مانگ بھیجا اور اسے دیکھ کر پیش قدمی اور جنگ کے متعلق مفصل ہدایات بھیجیں یہاں تک کہ بخارا پر یلغار کرنے کی سمت بھی متعین کر دی اور راستہ میں پڑاؤ ڈالنے کے مقامات بھی مقرر کر دیئے۔ قتیبہؒ نے حجاج کی ہدایات کے مطابق تیاری کی اور 90 ہجری میں دوبارہ بخارا پر حملہ آور ہونے کے لیے مرو سے چل پڑے۔ اگر بلاذریؒ کا یہ بیان درست تسلیم کر لیا جائے کہ شاہ بخارا نے ۸۹ ہجری میں مسلمانوں کی اطاعت قبول کر لی تھی تو 90 ہجری میں بخارا پر قتیبہؒ کی لشکر کشی کی یہ توجیہہ کی جا سکتی ہے کہ شاہِ بخارا نے بغاوت کر دی تھی اور مسلمانوں کے حلقۂ اطاعت کو توڑ ڈالا تھا۔

شاہِ بخارا کو قتیبہؒ کی پیش قدمی کی اطلاع ملی تو اس نے بڑے زور شور سے مقابلے کی تیاری کی اور اپنی مدد کے لیے ترکوں اور اہل صغد کو بھی بلا بھیجا لیکن ابھی یہ مدد پہنچنے نہ پائی تھی کہ قتیبہؒ نے بخارا کا محاصرہ کر لیا۔ جب ترکوں اور صغدیوں کا لشکر مدد کے لیے پہنچا تو اہل بخارا کی ہمت قوی ہوئی اور وہ بڑے جوش وخروش سے مقابلہ کے لیے نکلے۔ اس طرح اسلامی فوجیں دونوں طرف سے دشمنوں کے بیچ میں گھر گئیں۔ ترکوں نے مسلمانوں پر اس زور کا حملہ کیا کہ ان کا ایک حصہ پیچھے ہٹتا ہٹتا عورتوں کے خیموں تک پہنچ گیا۔ یہ دیکھ کر عورتوں نے للکارا اور اپنے مردوں کے گھوڑوں کو مار مار کر میدان جنگ کی طرف دھکیل دیا۔ عورتوں کے اس اقدام سے مردوں کو بڑی غیرت آئی انہوں نے سنبھل کر ایسا تند و تیز حملہ کیا کہ ترکوں اور صغدیوں کو دھکیل کر قریبی نہر کے پار پہنچا دیا۔ جہاں انہوں نے ایک اونچے ٹیلے پر پناہ لی۔ اس موقع پر قتیبہؒ نے للکار کر کہا'' آج کون سا قبیلہ ہے کہ جو دشمن کو اس ٹیلہ سے ہٹا دے۔'' ان کی للکار سن کر بنو تمیم کے دو سرداروں وکیع بن الاسود اور ہریم نے اپنے قبیلہ کے جوانوں کو ساتھ لے کر مردانہ وار نہر کو عبور کیا اور دشمن پر جا پڑے۔ وکیع نے حملہ کے وقت کہہ

دیا تھا کہ جو شہادت کا آرزو مند ہے وہی میرے ساتھ چلے، دوسرا کوئی شخص ہرگز میرا ساتھ نہ دے۔ کہا جاتا ہے کہ آٹھ سو جانبازوں نے وکیع کے ہاتھ پر موت کی بیعت کی اور نہر عبور کرنے کے بعد دشمنوں پر برق بے امان بن کر گرے۔ یہاں تک کہ ان کے قدم اکھڑ گئے۔ شاہِ بخارا نے بھی راہ فرار اختیار کی اور قتیبہؒ نے فوراً بخارا پر پرچم اسلام بلند کر دیا۔ مسلمانوں کی اس شاندار فتح نے صغد یانہ (Soghdiana) کے حکمران کو دہشت زدہ کر دیا اور اس نے صلح کر کے اطاعت قبول کر لی۔ پروفیسر آرمینس ویمبرے نے ''تاریخ بخارا'' میں لکھا ہے کہ قتیبہؒ نے عین لڑائی کے دوران میں صغد یانہ کے حکمران کو ایک قاصد کے ذریعے خفیہ پیغام بھیجا جس میں اس کو اس کے اتحادیوں سے بدظن کر دیا اور اس نے قتیبہؒ سے خفیہ صلح کر لی اور بیس لاکھ درہم ہر سال بطور خراج دینا منظور کر لیا۔ چونکہ اتحادی لشکر میں اس کے آدمیوں کی تعداد سب سے زیادہ تھی اس لیے اس کے میدان جنگ سے ہٹ جانے پر اہل بخارا اور ترک بھی پسپا ہونے پر مجبور ہو گئے۔ حقیقت حال کچھ بھی ہو، قتیبہؒ نے مظفر و منصور مرو کو مراجعت کی اور وہاں سے حجاج کو تسخیر بخارا کی خوشخبری بھیجی۔

قتیبہؒ کو مرو واپس آئے زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ انہیں بادغیس کے حکمران نیزک کی بغاوت کی اطلاع ملی۔ نیزک نے اب تک ہر معرکے میں مسلمانوں کا ساتھ دیا تھا لیکن ترکستان میں ان کی بڑھتی ہوئی قوت کو دیکھ کر اس کو قتیبہؒ کی طرف سے خوف پیدا ہو گیا اور وہ ان سے خار کھانے لگا۔ مہم بخارا کے بعد وہ قتیبہؒ سے اجازت لے کر بادغیس آ گیا۔ یہاں پہنچتے ہی اس نے کابل، بلخ، طالقان، فاریاب، جوزجان وغیرہ کے تمام حکمرانوں کو اپنے ساتھ ملا کر علم بغاوت بلند کر دیا اور طخارستان سے مسلمان حاکم کو نکال دیا۔ اس وقت موسم سرما کی آمد آمد تھی۔ اس لیے کسی بڑی مہم کا بھیجنا ممکن نہیں تھا۔ تاہم قتیبہؒ نے اپنے بھائی عبدالرحمٰن بن مسلم کو بارہ ہزار فوج دے کر طخارستان (بروایت دیگر بلخ یا بروقان) روانہ کیا اور ہدایت کی کہ وہاں پہنچ کر ان کا انتظار کیا جائے۔ جاڑے کا موسم ختم ہوتے ہی 91 ہجری میں قتیبہؒ خود اپنے لشکر کے ساتھ باغیوں کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوئے۔ سب سے پہلے طالقان کو ایک خونریز لڑائی کے بعد مسخر کیا اور باغیوں کو قرار واقعی سزا دی۔ ایک اور روایت کے مطابق اہل طالقان

نے مقابلہ کے بغیر ہی ہتھیار ڈال دیئے۔ اس لیے قتیبہؒ نے ان کو معاف کر دیا۔ اس کے بعد وہ فاریاب کی طرف بڑھے، وہاں کے فرمانروا نے بھی اطاعت قبول کر لی۔ اس لیے قتیبہؒ نے درگزر سے کام لیا۔ فاریاب سے انہوں نے جوزجان کا رخ کیا۔ وہاں کا حکمران پہاڑوں کی طرف بھاگ گیا اور اہل شہر نے اطاعت قبول کر لی۔ قتیبہؒ نے عامر بن مالک کو جوزجان چھوڑا اور خود نیزک کی تلاش میں بلخ سے ہوتے ہوئے خلم کی گھاٹی میں اپنے بھائی عبدالرحمٰن سے جا ملے جو وہاں قتیبہؒ کے انتظار میں خیمہ زن تھے۔ یہ ایک پر پیچ اور دشوار گزار گھاٹی تھی اور نیزک نے اسی کے اندر اپنا اڈا قائم کر رکھا تھا۔ گھاٹی کے دہانہ پر بہت سے مسلح جنگجو اس کی حفاظت پر متعین تھے اور پشت پر ایک مستحکم قلعہ تھا، جس تک پہنچنے کا بظاہر کوئی راستہ نہیں تھا۔ حسن اتفاق سے قتیبہؒ کو وہاں کے ایک پہاڑی باشندے نے وہ پوشیدہ راستہ بتا دیا جو پہاڑ کی پشت پر جا کر قلعہ میں نکلتا تھا۔ قتیبہؒ نے ایک دستہ فوج اس پہاڑی باشندے کے ساتھ روانہ کر دیا۔ ان لوگوں نے یکا یک اہل قلعہ کو جا لیا۔ بہت سے مارے گئے اور جو زندہ بچ گئے وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ نیزک وہاں سے بھاگ کر وادیٔ فرغانہ کے قلعہ الکرز میں قلعہ بند ہو گیا۔ یہ قلعہ بہت محفوظ تھا اور کسی فوجی دستے کا اس کے اندر داخل ہونا سخت محال تھا۔ قتیبہؒ نے دو ماہ تک اس قلعے کا محاصرہ کیے رکھا لیکن اس کی تسخیر کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی۔ ادھر موسم سرما قریب آ رہا تھا اور مسلمانوں کا سامان رسد بھی تیزی سے ختم ہو رہا تھا۔ آخر قتیبہؒ کو ایک تدبیر سوجھی۔ انہوں نے نیزک کے ایک پرانے بااعتماد ساتھی سلیم نامی کو اس کے پاس روانہ کیا کہ جیسے بھی بن پڑے نیزک کو سمجھا بجھا کر ان کے پاس لے آئے۔ سلیم نیزک کو جاں بخشی کی امید دلا کر قتیبہؒ کے پاس لے آیا۔ قتیبہؒ نے اس کو قید کر دیا اور پھر اس کے بارے میں اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا۔ ایک روایت میں ہے کہ انہوں نے حجاج بن یوسف سے بھی اس کے بارے میں استصواب کیا۔ سب نے اس کے قتل کا مشورہ دیا کیونکہ اس نے مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچایا تھا۔ چنانچہ انہوں نے نیزک کو اس کے سات سو ساتھیوں سمیت قتل کر دیا۔

نیزک کے فتنہ کے خاتمہ کے بعد قتیبہؒ نے شومان کا رخ کیا۔ جہاں کے حکمران نے کش

اور نسف کے لوگوں کو اپنے ساتھ ملا کر ان کے خلاف بغاوت کی تھی۔ ابن اثیر کا بیان ہے کہ قتیبہؒ نے پہلے دو قاصد بھیج کر فرمانروائے شومان کو اطاعت قبول کرنے کی ترغیب دی لیکن اسے اپنی طاقت پر بڑا ناز تھا۔ اس نے ایک قاصد کو قتل کر دیا اور دوسرا جان بچا کر بھاگ آیا۔ اب قتیبہؒ کو مجبور ہو کر اس پر چڑھائی کرنی پڑی۔ قریب پہنچ کر قتیبہؒ کے بھائی صالح بن مسلم نے ایک مرتبہ پھر اس کو سمجھایا لیکن وہ ہتھیار ڈالنے پر آمادہ نہ ہوا اور قلعہ بند ہو کر بیٹھ گیا۔ قتیبہؒ نے منجنیقوں سے پتھر برسا کر قلعہ کی دیواروں میں شگاف ڈال دیئے۔ فرمانروائے شومان نے قلعہ سے باہر نکل کر مقابلہ کیا لیکن مسلمانوں نے ایک ہی جھڑپ میں اسے اور اس کے ساتھیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ شومان پر قبضہ کرنے کے بعد قتیبہؒ نے کش اور نسف کو تسخیر کیا اور اپنے بھائی صالح کو بھیج کر صغدیانہ کے حکمران سے خراج وصول کیا۔ ان مہمات سے فارغ ہو کر قتیبہؒ نے مرو کو مراجعت کی۔ 92ہجری میں انہوں نے بجستان پر لشکر کشی کی لیکن وہاں کے فرمانروا نے کسی مزاحمت کے بغیر اطاعت قبول کر لی اور قتیبہؒ واپس مرو آ گئے۔

۹۳ ہجری میں خوارزم (خیوا) کے فرمانروا ''خوارزم شاہ'' نے قتیبہؒ کی اطاعت قبول کی۔ اس کی صورت یہ ہوئی کہ اس زمانے کا خوارزم شاہ ایک کمزور حکمران تھا۔ اس کا بھائی خرزاد اس کو عضو معطل بنا کر تمام امور سلطنت پر حاوی ہو گیا تھا۔ وہ ایک سفاک اور بدکردار آدمی تھا اور ساری رعیت کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ خوارزم شاہ اس کے مقابلے میں بے بس تھا اور مطلق دم نہ مار سکتا تھا۔ تاہم اس کو خرزاد سے دلی نفرت تھی اور وہ اس کے پنجۂ ستم سے نجات حاصل کرنے کے لیے موقع کا منتظر تھا۔ جب ترکستان میں قتیبہؒ کی فتوحات اور قوت کا شہرہ ہوا تو خوارزم نے شاہ نے ان کو خفیہ پیغام بھیجا کہ اگر وہ اس کو خرزاد کے پنجۂ ستم سے نجات دلا دیں تو وہ ان کی اطاعت قبول کر لے گا۔ قتیبہؒ نے اس کی درخواست قبول کر لی اور خرزاد پر لشکر کشی کر کے اس کو شکست دی اور پھر قتل کرا دیا۔ ایک روایت کے مطابق انہوں نے خرزاد اور اس کے حواریوں کو گرفتار کر کے خوارزم شاہ کے حوالے کر دیا جس نے سب کو قتل کرا دیا۔ قتیبہؒ نے وعدہ کے مطابق سلطنت خوارزم شاہ کے حوالے کر دی۔ اس نے اپنے عہد کے مطابق قتیبہؒ کی اطاعت قبول کر لی اور بہت سا نقد و جنس ان کی نذر کیا۔ علامہ بلاذری نے

''فتوح البلدان'' میں لکھا ہے کہ اس واقعہ کے بعد خوارزم شاہ کو بھی زیادہ عرصہ حکومت کرنا نصیب نہ ہوا کیونکہ اس کی کمزوری اور نااہلی کی وجہ سے رعایا اس سے جلد ہی بیزار ہوگئی اور شورش برپا کر کے اس کو قتل کر دیا۔ قتیبہؒ کو اس کے قتل کی خبر ملی تو انہوں نے اپنے بھائی عبیداللہ بن مسلم کو خوارزم کا حاکم مقرر کر دیا۔

خوارزم (خیوا `Khewa) پر استیلا کے بعد قتیبہؒ سمرقند کی تسخیر کے ارادہ سے روانہ ہوئے۔ سمرقند جس کا قدیم نام مارکنڈا تھا۔ اس زمانے میں وسط ایشیا میں تجارت کا بہت بڑا مرکز تھا۔ اس کی تجارت تبت، چین اور ہندوستان تک پھیلی ہوئی تھی اور اس وجہ سے یہ دور دور تک مشہور تھا۔ اسی تجارت کے سبب سمرقند اپنے دور کا نہایت پر رونق شہر تھا۔ اہل سمرقند یعنی صغد نے مسلمانوں کی اطاعت قبول کر لی تھی لیکن پھر اپنے عہد سے منحرف ہو گئے تھے اور مسلمانوں کے خلاف ترکستان کے باغی حکمرانوں کی مدد کی تھی۔ سمرقند پر قتیبہؒ کی لشکر کشی کا مقصد یہ تھا کہ صغد کی فتنہ پردازیوں کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا جائے۔ پہلے انہوں نے اپنے بھائی صالح (یا بروایت دیگر عبدالرحمٰن) کو ایک دستہ فوج کے ساتھ سمرقند کی طرف روانہ کیا اور تین چار دن بعد خود بھی ایک جرار لشکر کے ساتھ اس کے پیچھے روانہ ہوئے۔ اس لشکر میں بخارا اور خوارزم کے بیس ہزار سپاہی بھی شامل تھے۔ سمرقند کے قریب پہنچ کر دونوں لشکر یکجا ہو گئے۔ اہل سمرقند کو کھلے میدان میں مسلمانوں کے مقابل ہونے کی ہمت نہ پڑی اور وہ قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے۔ قتیبہؒ نے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ جب محاصرے کو ایک مہینہ گزر گیا تو اہل سمرقند نے اپنے پڑوسی حکمرانوں، بادشاہ شاش، حاکم فرغانہ اور خاقانِ چین وغیرہ کو لکھا اگر آج عربوں نے ہمیں مغلوب کر لیا تو کل تم بھی اس انجام سے نہ بچ سکو گے اس لیے ہماری جو مدد بھی کر سکتے ہو کرو...... یہ حکمران پہلے ہی قتیبہؒ کی روز افزوں قوت سے خطرہ محسوس کر رہے تھے انہوں نے اہل سمرقند کا پیغام ملتے ہی اپنی فوجیں ان کی مدد کے لیے روانہ کر دیں۔ ان میں شاہی خاندانوں کے افراد، بڑے بڑے امراء اور نامور بہادر شامل تھے اور ان سب کی قیادت خاقانِ چین کا بیٹا کر رہا تھا۔ قتیبہؒ کو اس امدادی لشکر کے آنے کی خبر تو انہوں نے صالح کو چھ سو منتخب شہسوار دے کر اس امدادی لشکر کو روکنے پر مامور کیا۔ صالح نے

آگے بڑھ کر اپنی فوج کے تین حصے کیے۔ دو حصوں کو دائیں بائیں گھاٹیوں کے اندر گھات میں بٹھا دیا اور خود امدادی فوج کے راستے میں پڑاؤ ڈال دیا۔ رات گئے جونہی دشمن کا لشکر ادھر سے گزرا صلاح نے اس پر حملہ کر دیا اور دوسرے مجاہدین بھی کمین گاہوں سے نکل کر دشمنوں پر ٹوٹ پڑے۔ اس ناگہانی حملہ نے دشمنوں کو حواس باختہ کر دیا۔ انہوں نے کچھ دیر مقابلہ کیا لیکن بری طرح شکست کھائی۔ ان کے بہت سے نامور بہادر اور شہزادے مارے گئے جو زندہ بچ گئے وہ بھاگ نکلے یا مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے۔

امدادی فوج کی شکست کی خبر سمرقند کو پہنچی تو صغد کو سخت دھچکا لگا تاہم انہوں نے مقابلہ جاری رکھا۔ ادھر قتیبہؒ نے محاصرہ کو اور سخت کر دیا اور منجنیقوں سے فصیل شہر پر لگاتار پتھر برسانے شروع کر دیئے یہاں تک کہ اس میں شگاف پڑ گیا۔ مسلمان سرفروشوں کی ایک جماعت تیروں کی بارش میں ڈھالوں کو اپنے چہروں کی آڑ بناتے ہوئے اس شگاف کے سامنے پہنچ کر جم گئی۔ اب اہل سمرقند کی ہمت بالکل جواب دے گئی اور انہوں نے ان شرائط پر صلح کر کے شہر مسلمانوں کے حوالے کر دیا۔

1- اہل سمرقند بارہ لاکھ (بروایت دیگر بائیس لاکھ) درہم سالانہ خراج ادا کریں گے۔

2- تین دن تک مسلمانوں کی دعوت کریں گے۔

3- بت خانوں پر مسلمانوں کو اختیار حاصل ہوگا۔

4- مسلمان شہر میں فاتحانہ داخل ہوں گے اور ان کے داخلہ کے وقت مسلح آبادی شہر سے نکل جائے گی۔

5- مسلمان شہر میں مسجد بنا کر نماز پڑھا کریں گے اور خطبہ دیا کریں گے۔

اس معاہدہ کے مطابق مسلمان شہر میں فاتحانہ داخل ہوئے لیکن مقررہ خراج کے علاوہ انہوں نے کسی چیز کو ہاتھ تک نہ لگایا اور ہر شخص کو اپنے مال اور جائیداد پر قابض رہنے دیا البتہ قتیبہؒ بتوں کو برداشت نہ کر سکتے تھے۔ انہوں نے ان بتوں کو نذر آتش کرنے کا ارادہ کیا تو اہل سمرقند نے ان سے کہا کہ یہ ہمارے دیوتا ہیں ہم آپ کو خیر خواہانہ مشورہ دیتے ہیں کہ انہیں ہاتھ نہ لگائیں ورنہ یہ آپ کو برباد کر دیں گے۔ قتیبہؒ ان کی توہم پرستی اور مشرکانہ عقیدے

پر ہنس پڑے اور انہیں بڑی نرمی سے سمجھایا کہ یہ بت کسی کو نفع یا نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ یہ کہہ کر اپنے ہاتھ سے ان بتوں کو آگ لگادی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب یہ بت پگھل گئے تو ان میں سے 50 ہزار مثقال سونا نکلا۔ علامہ بلاذری نے ''فتوح البلدان'' میں لکھا ہے کہ جب اہل سمرقند نے دیکھا کہ بتوں کو نذر آتش کرنے کے بعد قتیبہؒ کا بال بھی بیکا نہیں ہوا تو ان کی ایک بڑی تعداد اسی وقت مشرف باسلام ہوگئی۔ اس کے بعد قتیبہؒ نے شہر میں مسجد تعمیر کر کے اس میں باجماعت نماز ادا کی اور خطبہ دیا۔

بعض مؤرخین نے فتح سمرقند کے سلسلے میں ایک عجیب کہانی بیان کی ہے۔ اس کہانی کا خلاصہ یہ ہے کہ قتیبہؒ نے کسی حیلہ سے چار ہزار بند صندوق شہر کے اندر پہنچا دیئے۔ ان صندوقوں میں مسلح آدمی بٹھا دیئے گئے تھے۔ رات کو ان زرہ پوش مسلح جنگجوؤں نے صندوقوں سے نکل کر تہلکہ برپا کر دیا اور محافظوں کو ہلاک کر کے شہر کے دروازے کھول دیئے، اس کے ساتھ ہی قتیبہؒ اپنے لشکر کے ساتھ شہر میں داخل ہو گئے اور اہل سمرقند کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ بظاہر یہ کہانی لغو معلوم ہوتی ہے۔

سمرقند کی تسخیر کے بعد قتیبہؒ نے عبداللہ بن مسلم کو وہاں کا حاکم مقرر کیا اور کچھ فوج اس کے پاس چھوڑ کر مرو، واپس آ گئے۔

94 ہجری میں قتیبہؒ نے ان حکمرانوں کی گوشمالی کا ارادہ کیا جنہوں نے اہل سمرقند کی مدد کی تھی۔ سب سے پہلے انہوں نے ایک لشکر الشاش کی طرف روانہ کیا جس نے اس کو چند دن کے اندر فتح کر لیا پھر وہ خود فرغانہ کی طرف بڑھے۔ راستے میں خوجندی ان کے مزاحم ہوئے، قتیبہؒ نے انہیں عبرتناک شکست دی اور یلغار کرتے ہوئے بڑھتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ چین کی سرحد پر پہنچ گئے۔ اسی زمانے میں حجاج بن یوسف فوت ہو گیا۔ قتیبہؒ کو اس کی وفات کی خبر ملی تو وہ سرحد چین سے واپس مرو آ گئے۔

96 ہجری میں قتیبہؒ نے بڑے اہتمام سے چین پر فوج کشی کی تیاری کی کیونکہ خاقان چین نے اہل سمرقند کی مدد کے لیے اپنا بیٹا بھیجا تھا اور اس سے پہلے بھی وہ مسلمانوں کے دشمنوں کی مدد کر چکا تھا۔ قتیبہؒ نے مجاہدین کے اہل و عیال کی حفاظت کے خیال سے ایک

مضبوط فوج کی نگرانی میں سمرقند چھوڑ دیا اور خود پیش قدمی کرتے ہوئے فرغانہ پہنچ گئے۔ وہاں سے انہوں نے ایک لشکر چین روانہ کیا جو کاشغر کو تسخیر کرتا ہوا چین کے علاقے میں دور تک بڑھتا چلا گیا۔ قتیبہؒ بھی آگے بڑھ کر شغر میں خیمہ زن ہو گئے۔

خاقان چین کو مسلمانوں کی یلغار کی خبر ہوئی تو وہ گھبرا گیا کیونکہ یلغار کرنے والی وہ قوم تھی جس نے سارے وسط ایشیا کو زیر و زبر کر ڈالا تھا۔ خاقان چین نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ مسلمانوں کے سپہ سالار سے گفت و شنید کرے۔ چنانچہ اس نے ایک قاصد یہ پیغام دے کر قتیبہؒ کے پاس بھیجا کہ میرے پاس اپنے کسی معتبر آدمی کو سفیر بنا کر بھیجو تاکہ میں اس سے تمہارے مقاصد کے بارے میں معلومات حاصل کروں۔

خاقان چین کا سفیر قتیبہؒ کے پاس آیا تو وہ کاشغر سے باہر اپنے پڑاؤ کے کھلے میدان میں زمین پر چادر بچھائے دوسرے مسلمانوں کے شانہ بشانہ نمازِ عصر پڑھ رہے تھے۔ جب سفیر کو اشارہ کر کے بتایا گیا کہ مسلمانوں کا سپہ سالار وہ شخص ہے تو وہ ورطۂ حیرت میں پڑ گیا کیونکہ قتیبہؒ اور دوسرے مسلمانوں کے لباس میں کوئی فرق نہ تھا وہ تو اپنے فرمانروا کے دربار کی شان و شوکت اور جاہ و جلال دیکھنے کا عادی تھا۔ اس کے تصور میں خاقان کے عظیم الشان محلات، سنہری مرصع تخت اور زرق برق لباس پہنے ہوئے چوبدار آنے لگے۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ آ سکتی تھی کہ مسلمانوں کا سپہ سالار اور حاکم اعلیٰ اس قدر سادگی پسند ہوگا۔ وہ بے ساختہ پکار اٹھا

''جس فوج کا امیر ایسا ہو وہ کبھی مات نہیں کھا سکتی۔''

سفیر نے خاقان کا پیغام قتیبہؒ کو دیا تو انہوں نے ہبیرہ بن مشرج (یا مشمرج) کلابی کی قیادت میں دس عقلمند اور خوش بیان آدمیوں کی ایک سفارت خاقان چین کے دربار میں بھیجی اور اسے خاقان کے نام یہ پیغام دیا کہ میں جب تک سرزمین چین کو پامال کر کے تم سے خراج وصول نہ کر لوں گا واپس نہ جاؤں گا۔

یہ سفارت خاقانِ چین کے دربار میں پہنچی اور وہاں کئی روز تک قیام کیا۔ اس دوران میں اراکین سفارت کی خاقان سے بار بار ملاقاتیں ہوئیں۔ آخری ملاقات میں خاقان نے

ہبیرہ سے کہا

''تم معقول آدمی نظر آتے ہو، جاؤ اور اپنے سردار سے کہہ دو کہ اس کی خیر لوٹ جانے ہی میں ہے۔ مجھے تمہارے لشکر کی قلت تعداد کا علم ہو چکا ہے اگر تم لڑنے پر اصرار کرتے رہے تو میں ایسی فوج گراں تمہارے مقابلے پر بھیجوں گا جو تمہارا نام ونشاں تک مٹا دے گی۔''

ہبیرہ نے جواب دیا

''اے بادشاہ! اس لشکر کو تھوڑا کون کہہ سکتا ہے جس کا ایک سرا چین میں ہو اور دوسرا ملک شام میں۔ ہم موت کو کھیل سمجھتے ہیں۔ اس سے ہرگز نہیں ڈرتے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ موت کا ایک دن مقرر ہے اور میدان جنگ میں تو موت کو ہم سعادت سمجھتے ہیں۔''

ہبیرہ کے بے باکانہ جواب سے خاقان مرعوب ہو گیا اور اس نے پوچھا ''تمہارا سپہ سالار کن شرائط پر صلح کر سکتا ہے۔''

ہبیرہ نے کہا ''وہ قسم کھا چکا ہے کہ جب تک وہ تمہاری زمین کو روند کر تم سے خراج وصول نہ کر لے، واپس نہیں جائے گا۔''

خاقان کو مسلمانوں کی قوت کا پورا پورا اندازہ تھا اور وہ ان سے جنگ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے کہا، ہم تمہارے سردار کی قسم پوری کر دیں گے پھر اس نے چند طشتوں میں کچھ مٹی اور بہت سے قیمتی ہدایا وتحائف قتیبہؒ کے پاس بھیجے۔ ساتھ ہی ایک خطیر رقم خراج کے طور پر بھی بھیجی اور صلح کی درخواست کی۔ قتیبہؒ نے مٹی کو اپنے پاؤں تلے روند ڈالا اور صلح کی پیشکش منظور کر کے مرو کو مراجعت کی ابن اثیرؒ کا بیان ہے کہ قتیبہؒ کا مقصد چین پر قبضہ کرنا نہ تھا بلکہ وہ صرف خاقانِ چین کے خطرے کا انسداد کرنا چاہتے تھے۔ چونکہ خاقان نے صلح جویانہ رویہ اختیار کیا اس لیے انہوں نے اس سے خراج وصول کرنے پر اکتفا کیا اور واپس مرو چلے گئے۔

جس زمانے میں قتیبہؒ چین کی مہم میں مصروف تھے۔ خلیفہ ولید بن عبدالملک نے وفات

پائی اور سلیمان بن عبدالملک مسند خلافت پر بیٹھا۔ سلیمان ولید کے دور کے تمام عمال بالخصوص حجاج بن یوسف اور اس کے ماتحت حکام سخت خلاف تھا۔ قتیبہؒ بھی ان میں شامل تھے۔ ابن اثیرؒ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ ولید نے کسی بات پر ناراض ہوکر سلیمان کی ولی عہدی منسوخ کرنی چاہی تھی تو حجاج اور قتیبہؒ دونوں نے اس کی تائید کی تھی۔ اس بناء پر سلیمان کے دل میں ان دونوں کے خلاف کھٹک تھی۔ حجاج تو ولید کی زندگی ہی میں فوت ہوگیا تھا۔ اب صرف قتیبہؒ باقی تھے۔ تاہم سلیمان نے عنان حکومت ہاتھ میں لینے کے بعد قتیبہؒ سے مطلق کوئی تعرض نہ کیا اور انہیں خراسان کی حکومت پر بحال رکھا۔ لیکن خود قتیبہ کو سلیمان کی جانب سے سخت بدگمانی تھی اور انہیں یقین تھا کہ سلیمان جلد ہی ان کے حریف یزید بن مہلب کو خراسان کا گورنر مقرر کردے گا۔ چنانچہ انہوں نے سلیمان کو اپنے خطوں میں جہاں اپنی وفاداری کا یقین دلایا وہاں وسط ایشیا میں اپنی خدمات کا ذکر کرکے یہ دھمکی بھی دی کہ اگر ان کی جگہ یزید بن مہلب کو خراسان کی ولایت پر مامور کیا گیا تو وہ سلیمان کے حلقۂ اطاعت سے نکل جائیں گے۔ سلیمان نے ابھی ان کے دھمکی والے خط کا جواب نہیں بھیجا تھا کہ قتیبہؒ کا پیمانہ صبر لبریز ہوگیا اور انہوں نے سلیمان کی بیعت کرنے سے انکار کردیا۔

قتیبہؒ نے اپنے ماتحتوں کو بھی ایسا ہی طرز عمل اختیار کرنے کے لیے کہا۔ لیکن خلاف توقع انہوں نے ایسا کرنے میں تامل کیا۔ اس پر قتیبہؒ نے قبیلہ بنوتمیم کے بارے میں کچھ سخت الفاظ کہے کیونکہ وہی سلیمان کی سب سے بڑھ کر حمایت کررہے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وکیع بن الاسود تمیمی تمام بنوتمیم کو ساتھ لے کر قتیبہؒ کے مقابلہ پر آ گیا۔ ہزاروں عجمیوں نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ فریقین میں خونریز لڑائی ہوئی جس میں خلیفہ سلیمان کے حامیوں کا پلہ بھاری رہا اور قتیبہؒ اپنے بھائیوں اور لڑکوں سمیت مردانہ وار لڑتے ہوئے میدان جنگ میں کام آئے۔ کامیاب فریق نے ان کا سر کاٹ کر سلیمان کے پاس بھجوادیا۔ یہ واقعہ 96 ہجری کا ہے۔

قتیبہؒ بن مسلم جیسے عظیم فاتح کے اس انجام پر جس قدر بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔ ایک ایسا سپہ سالار جس کی عسکری صلاحیتوں نے بڑے بڑے طاقتور حکمرانوں کو اسلامی حکومت کی اطاعت قبول کرنے پر مجبور کردیا تھا اور جس نے خراسان سے لے کر چین تک سارے وسط

ایشیا کو ہلا ڈالا تھا، صرف آپس کی بدگمانی اور مخالفت کی نذر ہو گیا۔ ابن اثیرؒ نے لکھا ہے کہ ایک خراسانی نے ان کے قتل کی خبر سنی تو بے ساختہ اس کی زبان پر یہ الفاظ آ گئے۔

''اللہ کی قسم! اگر قتیبہؒ جیسا فاتح ہم (اہل عجم) میں ہوتا تو ہم اس کی لاش کو محفوظ رکھتے اور دشمنوں سے نبرد آزما ہوتے وقت اس تابوت کی برکت سے فتح طلب کرتے۔''



محمد بن قاسم رح

"میں کوئی ظالم و جابر فاتح نہیں۔ میں دکھیوں کا حامی ہوں اور انہیں ظالموں سے نجات دلانے کے لیے یہاں آیا ہوں، البتہ جو حق کا دشمن ہے ہم اس کے دشمن ہیں اور اس کے خلاف جہاد کرنا ہمارا فرض ہے"

سرزمین ہند کے فاتح اول کی ولولہ انگیز سرگزشت

نخلستان کے درمیان والی بصرہ کا ایک قلعہ نما مکان تھا۔ اس مکان کے وسیع کمرے میں ایک عمر رسیدہ لیکن قوی ہیکل شخص ٹہل رہا تھا۔ وہ چلتے چلتے رکتا اور دیواروں پر آویزاں نقشے دیکھنے میں منہمک ہو جاتا۔ اس کے چہرے سے غیر معمولی عزم و استقلال ٹپکتا تھا۔ آنکھوں میں ذکاوت اور ذکاوت سے زیادہ ہیبت تھی۔

یہ حجاج بن یوسف تھا جس کے آہنی پنجوں سے دشمن اور دوست یکساں طور پر پناہ مانگتے تھے۔ جس کی تلوار عرب و عجم پر صاعقہ بن کر کوندی اور بسا اوقات اپنی حدود سے تجاوز کر کے عالم اسلام کے ان درخشندہ ستاروں کو بھی خاک اور خون میں لٹا گئی جن کے سینے نور ایمان سے منور تھے۔

حجاج بن یوسف دیر تک دیواروں پر لٹکے ہوئے نقشے دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے ایک نقشہ اتارا اور اپنے سامنے رکھ کر ایرانی قالین پر بیٹھ گیا۔ دیر تک سوچنے کے بعد اس نے قلم اٹھا کر نقشے پر چند نشانات لگائے اور اسے لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیا۔ ایک سپاہی نے ڈرتے ڈرتے کمرے میں داخل ہو کر کہا "ترکستان سے ایک ایلچی آیا ہے"۔

حجاج بن یوسف نے کہا ”میں صبح سے انتظار کر رہا ہوں اسے یہاں لے آؤ“۔

سپاہی چلا گیا اور حجاج بن یوسف دوبارہ نقشہ کھول کر دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک زرہ پوش کمرے میں داخل ہوا۔ وہ قد و قامت کے لحاظ سے ایک نوجوان اور چہرے مہرے سے ایک پندرہ سولہ سالہ لڑکا معلوم ہوتا تھا۔ اس کے سر پر تانبے کا ایک خود چمک رہا تھا۔ تیکھے نقوش، چمکتی ہوئی آنکھیں، پتلے اور بھنچے ہوئے ہونٹ، ایک غیر معمولی عزم و استقلال کے آئینہ دار تھے۔

اس کے قد و قامت میں تناسب اور چہرے میں کچھ ایسی جاذبیت تھی کہ حجاج بن یوسف حیرت زدہ ہو کر اس کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے کرخت آواز میں پوچھا ”تم کون ہو؟“

لڑکے نے جواب دیا: میں نے ہی اطلاع بھجوائی تھی، میں ترکستان سے آیا ہوں۔

خوب ترکستان سے تم آئے ہو میں قتیبہ کی زندہ دلی کی داد دیتا ہوں میں نے قتیبہ کو لکھا تھا کہ وہ خود آئے یا اپنے کسی تجربہ کار جرنیل کو میرے پاس بھیجے اور اس نے ایک آٹھ سال کا بچہ میرے پاس بھیج دیا ہے۔

لڑکے نے اطمینان سے جواب دیا، میری عمر سولہ سال اور آٹھ مہینے ہے۔

حجاج بن یوسف نے گرج کر کہا، لیکن تم یہاں کیا لینے آئے ہو قتیبہ کو کیا ہو گیا ہے؟

لڑکے نے جواب دیئے بغیر آگے بڑھ کر ایک خط پیش کیا حجاج بن یوسف نے جلدی سے خط کھول کر پڑھا اور قدرے مطمئن ہو کر کہا۔ وہ خود سیدھا میرے پاس کیوں نہیں آیا تمہیں یہ خط دے کر کیوں بھیجا؟

لڑکے نے کہا: آپ کس کے متعلق پوچھ رہے ہیں؟

حجاج بن یوسف کی قوت برداشت جواب دے رہی تھی۔ اس نے چلا کر کہا، وہ بے وقوف جس کے متعلق قتیبہ نے لکھا ہے کہ میں اپنا بہترین سالار بھیج رہا ہوں۔

لڑکے نے پھر اطمینان سے کہا، قتیبہ نے اپنے مکتوب میں جس کا ذکر کیا ہے وہ تو میں ہی ہوں اگر آپ کسی بے وقوف سے ملنا چاہتے ہیں تو مجھے اجازت دیجیے۔

• تم اور قتیبہ کے بہترین سالار! اللہ ترکستان میں لڑنے والے بدنصیب مسلمانوں کو دشمنوں سے بچائے۔ قتیبہ کا تمہارے ساتھ کیا رشتہ ہے؟

''ہم دونوں مسلمان ہیں''۔

فوج میں تمہارا عہدہ کیا ہے؟

''میں ہراول دستہ کا سالار ہوں''۔

تم اور ہراول کے سالار؟ بلخ سے کترا کر بخارا اور سمرقند کی طرف جانے کے ارادے میں بھی غالباً تمہارے جیسے کسی ہونہار مجاہد کے مشورے کا دخل ہے۔

ہاں یہ مشورہ میرا ہے اور میرے یہاں آنے کی وجہ بھی یہی ہے۔ آپ اگر تھوڑی دیر ضبط سے کام لیں تو میں آپ کو ساری صورت حال سمجھا سکتا ہوں۔ حجاج بن یوسف کی اب ساری تلخی پریشانی میں تبدیل ہو رہی تھی۔ اس نے کہا ''اگر آج تم مجھے کوئی بات سمجھا سکے تو میں یہ کہوں گا کہ عرب ماؤں کے دودھ کی تاثیر زائل نہیں ہوئی۔ بیٹھ جاؤ! میں صبح سے نقشہ دیکھ رہا ہوں۔ مجھے بتاؤ جو فوج ہرات جیسے معمولی شہر کو فتح نہیں کر سکتی، وہ بخارا جیسے مضبوط اور مستحکم شہر پر فتح کے جھنڈے لہرانے کے متعلق اس قدر پر امید کیوں ہے۔ ہاں! پہلے یہ بتاؤ کہ تمہیں نقشہ پڑھنا آتا ہے؟

لڑکے نے کوئی جواب دیے بغیر حجاج بن یوسف کے سامنے بیٹھ کر نقشہ کھولا اور مختلف ومقامات پر انگلی رکھتے ہوئے حجاج بن یوسف کو تفصیلات بتانے لگا۔ اس کی باتیں اور سمجھانے کا انداز اتنا جاندار تھا کہ حجاج بن یوسف اب نقشے سے زیادہ اس کم سن اور نوجوان سالار کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے نقشہ لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیا اور کچھ دیر سوچنے کے بعد سوال کیا تم کس قبیلے سے ہو؟

لڑکے نے جواب دیا میں ثقفی ہوں۔

ثقفی.......تمہارا نام کیا ہے؟

محمد بن قاسم

حجاج بن یوسف نے چونک کر محمد بن قاسم کی طرف دیکھا اور کہا قاسم کے بیٹے سے مجھے

یہی توقع تھی

☆☆☆

محمد بن قاسم کا پورا نام عماد الدین محمد تھا۔ وہ ایک متوسط درجے کے گھرانے میں پیدا ہوا۔ ابھی بچہ ہی تھا کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ لیکن اس کی والدہ ایک نیک، سگھڑ اور قابل خاتون تھیں اس نے بچے کو اخلاقی تربیت خود دی اور مسجد میں پڑھنا لکھنا سکھلایا۔ محمد بن قاسم چھوٹی سی عمر ہی سے فن حرب میں ماہر ہو گیا تھا اور اس کے دل میں جوش جہاد موج زن تھا۔ جب قتیبہ بن مسلم جہاد کے لیے خراسان، خوارزم اور ترکستان روانہ ہوا تو محمد بن قاسم اس نامور سالار کے ساتھ چلا گیا۔

وہاں اس نے ذہانت، دلیری، بے باکی اور فن سپہ گری کا ایسا شاندار مظاہرہ کیا کہ قتیبہ بن مسلم نے اسے ترقی دے کر اپنا نائب مقرر کر لیا۔

۹۲ ہجری میں محمد بن قاسم کو قتیبہ نے حجاج کے پاس ایک ضروری مشورے کے لیے بھیجا۔ دراصل حجاج اور قتیبہ ایک منصوبے پر اتفاق کر چکے تھے۔ مگر میدان جہاد میں پہنچ کر محمد بن قاسم نے اپنے جاندار دلائل سے سپہ سالار قتیبہ بن مسلم کو اس قدر متاثر کر لیا کہ اس نے اس منصوبے میں تبدیلی کر لی۔ اس تبدیلی کے باعث دشمنوں کو زک ہوئی مگر یہ امر حجاج کو ناگوار گزرا کہ قتیبہ نے بلا اجازت ایسی تبدیلی کیوں کی اس نے قتیبہ سے جواب طلبی کی۔ اس کے جواب میں قتیبہ نے محمد بن قاسم کو حجاج کے پاس بھیجا کہ وہ حجاج کو تمام صورت حال سمجھا سکے۔ محمد بن قاسم نے حجاج کے سامنے ایسی مدلل باتیں رکھیں کہ حجاج محمد بن قاسم کی صلاحیتوں کا معترف ہو گیا۔

انہی دنوں حجاج کو خبر ملی کہ لنکا سے عرب تاجروں کا جو جہاز عراق آ رہا تھا۔ اسے سندھ کی بندرگاہ دیبل کے قریب سندھ کے راجہ داہر کے آدمیوں نے لوٹ لیا ہے اور عرب تاجر راجہ کی قید میں ہیں۔ عرب قیدیوں میں ایک لڑکی بھی تھی جس نے حجاج کو ایک درد بھرا خط لکھ کر اس سے مدد کی درخواست کی۔ حجاج یہ خط پڑھ کر جوش غضب سے کانپ اٹھا اور فوراً راجہ کو لکھا کہ مجرموں کو قرار واقعی سزا دے اور عرب کنبوں کو عزت و احترام کے ساتھ بصرہ روانہ

کرے۔

راجا داہر نے حجاج کا یہ مطالبہ رد کر دیا اور کہلا بھیجا کہ یہ حرکت بحری ڈاکوؤں کی ہے اور ان کو سزا دینا میرے بس میں نہیں اس پر حجاج نے راجہ کی سرکوبی کے لیے ایک مختصر سا لشکر بھیجا جسے سندھیوں نے آسانی سے شکست دے دی۔ اس کے بعد حجاج نے گورنر عمان کی سرکردگی میں ایک لشکر بھیجا مگر اس کا بھی وہی حشر ہوا جو پہلے کا ہوا تھا۔ اب حجاج کو معلوم ہوا کہ جس مہم کو اتنا آسان سمجھتا تھا وہ بہت مشکل ہے۔ اس نے بڑے پیمانے پر جنگی تیاریاں شروع کر دیں اور جب سپہ سالاری کا سوال اٹھا تو اس تجربہ کار اور جہاندیدہ جرنیل کی نگاہ انتخاب اپنے بھتیجے محمد بن قاسم پر پڑی جو اس وقت صرف سترہ سال کا تھا۔

اس زمانے میں مسند خلافت پر عبدالملک کا بیٹا ولید متمکن تھا۔ حجاج نے اس مہم کی منظوری کے لیے محمد بن قاسم کو دارالخلافہ بھیجا۔ محمد بن قاسم نے بڑی قابلیت سے خلیفہ کو اس مہم کی اہمیت سمجھائی۔ خلیفہ کے دل پر محمد بن قاسم کی شخصیت کا بہت گہرا اثر ہوا۔ اس نے مہم کی منظوری دے دی اور محمد بن قاسم کو دو ہزار مجاہدین کا ایک لشکر دیا۔ محمد بن قاسم بصرہ واپس آیا تو حجاج نے اپنی بیٹی کی شادی اس کے ساتھ کر دی اور پھر سندھ پر حملے کی تیاری میں ہمہ تن مصروف ہو گیا۔

جس زمانے میں محمد بن قاسم نے سندھ پر حملہ کیا اس وقت سندھ کا راجا داہر اور اس کے ماتحت راجے اور اکثر سردار ہندو تھے۔ دریائے سندھ کے حصہ ملتان وغیرہ میں بھی رعایا کی اکثریت ہندو تھی۔ بدھ مت بھی تھے مگر ان سے ہندوؤں کا سلوک بہت برا تھا۔ البتہ دریائے سندھ کے مغربی کنارے کا جو علاقہ جو آج کل دادو اور جیکب آباد کے شہروں اور بلوچستان مکران، فاران اور لس بیلہ کے علاقوں پر مشتمل ہے، وہاں زیادہ تر راجے اور رعایا بدھ مذہب کی پیرو تھی۔ راجہ داہر کی سلطنت کے چھے صوبے تھے اور اس کا پایہ تخت راور تھا۔ روج، ہتھیلو مود، سورائے، دیبل، نیرون، سیی، بہمن آباد، بیلہ، اسکلندہ اور ملتان مشہور قلعے تھے۔

☆☆☆

حجاج بن یوسف خوب سمجھ چکا تھا کہ پہلی ناکامیوں کے اسباب کیا ہیں۔ دمشق سے د

ہزار مجاہدین بصرہ آئے تھے۔ بصرہ کے گردونواح میں سے تقریباً دو ہزار مجاہد اور مل گئے تھے۔ اس کے بعد اس نے محمد بن قاسم کو شیراز جا کر قیام کرنے کا حکم دیا تاکہ وہاں شام اور عراق سے مزید مجاہدین بھیجے اور اس عرصے میں محمد بن قاسم اپنی فوج کا نظام بھی درست کر لے۔

محمد بن قاسم نے ان مجاہدین کو دستوں میں منظم کیا اور ان پر امیر مقرر کیے۔ اس دوران اس نے سندھ کے راستوں، قلعوں اور ملکی حالات سے پوری طرح واقفیت حاصل کر لی۔ پہلی مہموں میں ہندی قلعوں اور ہاتھیوں کے ریلے نے عربوں کو پریشان کیا تھا۔ اس کا تدارک بھی اس نے سوچ لیا اور تجویز کردہ اصولوں پر فوج کو مشق کروائی۔ اس کے علاوہ اس نے ہندوستان کی بیماریوں کے لیے ادویات وغیرہ کا بھی بندوبست کر لیا۔ اب اس کی فوج میں چھ ہزار کے لگ بھگ گھڑسوار چھ ہزار شتر سوار اور تین ہزار بار برداری کے اونٹ تھے۔

۷۱۱ء میں محمد بن قاسم خشکی کے راستے ایران سے مکران پہنچا۔ اس کے پیچھے حجاج نے بصرہ سے ایک طاقتور بحری بیڑے کے ذریعے پانچ منجنیقیں روانہ کیں جن میں عروس نامی منجنیق اتنی بڑی تھی کہ اسے پانچ سو آدمی چلاتے تھے۔ یہ منجنیق دیبل کی بجائے ایک غیر اہم بندرگاہ سومیانی پر اتاری گئی۔ قزپور حکمران کا پایہ تخت تھا۔ یہاں محمد بن قاسم نے چند ماہ قیام کیا اور پھر دیبل کی طرف بڑھا۔ درمیان میں کس بیلہ (لس بیلہ) کا خطرناک اور دشوار گزار علاقہ تھا جو چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں سے اٹا ہوا تھا۔

محمد بن قاسم کی فوج بیلہ کی طرف بڑھی تو مقامی لوگوں اور ہندی فوج نے مزاحمت شروع کر دی۔ محمد بن قاسم قزپور سے چلا تو اس نے اپنی پیش قدمی کو بالکل مخفی رکھا تھا اس لیے جب ہندی فوج نے حملہ کیا تو وہ بیلہ کے قریب پہنچ چکا تھا۔ ہندی گوریلے چھپ کر بار برداری کے جانوروں اور مجاہدین پر بڑے کاری حملے کر رہے تھے۔ محمد بن قاسم نے چال یہ چلی کہ اپنی فوج کے ہراول کے رخ کو سپاہی سنگھ کی چوکی کے قریب سے آگھور کی بندرگاہ کی طرف پھیر دیا۔ ایسا کرنے سے قبل یہ مشہور کرا دیا کہ عرب فوج اب ساحل کے ساتھ ساتھ آگے بڑھے گی۔ ہندی سپہ سالار اس جنگی چال میں مات کھا گیا اور اپنی فوج کو اکٹھا کرنے میں لگ گیا تاکہ وہ مسلمان لشکر کو کھلے میدان میں نکلنے سے پہلے ہی تباہ کر دے۔ اور اس کے لیے وہ قلعے

سے نکل کر اپنی گوریلا فوج کی طرف چلا گیا تا کہ ساری فوج کو یکجا کر سکے۔ محمد بن قاسم کے جاسوس اسے لمحہ لمحہ کی خبریں دے رہے تھے انہوں نے ہندو سپہ سالار کی قلعے سے نکلنے کی خبر بھی محمد بن قاسم کو پہنچا دی۔ محمد بن قاسم نے اس موقع سے پوری طرح فائدہ اٹھایا اور قلعہ پر حملہ کر دیا اور ہندی فوج کو شکست دے کر قلعہ فتح کر لیا۔

ہندی فوج کی شکست فاش کے بعد محمد بن قاسم نے اپنے زخمیوں اور شہیدوں کو جمع کرنے کا حکم دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ہندی فوج کے مجروحین کو بھی جمع کرایا جن میں ہندو فوج کا سپہ سالار بھی شامل تھا۔ محمد بن قاسم نے ہندو زخمیوں کی پوری پاسداری کی اور تمام قیدیوں کو نہتا کر کے رہا کر دیا۔ زخمیوں کو صحت یاب ہونے پر چھوڑ دیا گیا۔ ہندو سپہ سالار کو بھی محمد بن قاسم نے چھوڑ دیا۔ محمد بن قاسم کی مروت اور ہمدردی کا ہندی فوج پر گہرا اثر ہوا اور ان میں سے کئی اس کے ساتھ مل گئے۔

محمد بن قاسم بیلہ میں کئی ہفتے قیام کے بعد دیبل کی طرف اس وقت بڑھا جب اس کا بھاری سامان سومیانی کی بندرگاہ پر پہنچنے کو تھا۔ دیبل کے گرد بہت مضبوط فصیل تھی اور اس میں پانی بھرا ہوا تھا۔ اس شہر میں بدھ مت کا ایک مشہور مندر بھی تھا جس کا گنبد چالیس فٹ سے زیادہ بلند تھا اور اس پر سرخ جھنڈا لہراتا رہتا تھا۔ عوام اور پجاریوں کا اعتقاد تھا کہ جب تک یہ جھنڈا بلند رہے گا، شہر کو کوئی فتح نہیں کر سکتا۔ شہر کے اندر اتنا سامان رسد تھا کہ محصورین کئی ماہ آسانی سے گزار سکتے تھے۔ محاصرہ کرنے والوں کے لیے یہ دقت بھی تھی کہ شہر کے گرد ونواح میں زراعت کے قابل زمین بھی نہ تھی۔ اس لیے محاصرین کو سامان رسد کی فراہمی کا سامنا بھی تھا۔

جب سومیانی بندرگاہ سے بھاری اسلحہ اور سامان آ گیا تو محمد بن قاسم دیبل کے سامنے پہنچا اور اس کا چاروں طرف سے محاصرہ کر لیا۔ کئی ہفتے گزرنے پر بھی اہل دیبل نے باہر نکل کر عرب فوج کا مقابلہ نہ کیا البتہ جب کبھی عرب سپاہی دبابے کی آڑ میں فصیل کے قریب پہنچنے کی کوشش کرتے تو ہندی ان پر جلتی ہوئی مشعلیں پھینکتے۔ عربی منجنیق عروس بھی استعمال میں لائی گئی اور شہر میں بڑے بڑے پتھروں کی بارش کی گئی مگر محصورین پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔

آخر کار محمد بن قاسم نے گولہ اندازوں کے جرنیل کو حکم دیا کہ مندر کے گنبد کو نشانہ بنایا جائے تاکہ جھنڈا نیچے گر جائے۔ پہلا گولہ گنبد کے اوپر سے گزر گیا مگر دوسرا ٹھیک نشانے پر بیٹھا اور سرخ جھنڈا زمین پر آ رہا۔ محصورین نے اس سے نہایت برا شگون لیا اور قلعے سے باہر نکل کر مرنے مارنے کا فیصلہ کر لیا۔ ہندی فوج تلواریں سونت کر باہر نکلی تو محمد بن قاسم نے اپنے سالاروں کو ثابت قدمی سے پیچھے ہٹنے کا حکم دیا۔ ہندو اسے اپنی فتح سمجھے اور عربوں کے پیچھے بڑھتے چلے گئے۔ جب محمد بن قاسم نے دیکھا کہ یہ لوگ قلعے سے کافی دور نکلے آئے ہیں تو اس نے اپنے شہسواروں کو لے کر ان کے عقب پر حملہ کر دیا۔ اس طرح بہت سے ہندی سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ آخر کار ہندی فوج نے ہتھیار ڈال دیئے اور صلح کی درخواست کی۔ یہاں بھی محمد بن قاسم نے ایک مثالی مسلم سالار کا طرز عمل اختیار کیا اور اسلامی احکام پر عمل کرتے ہوئے فتح کے بعد دشمنوں کے ساتھ رحم دلی، مروت اور رواداری کا انتہائی اعلیٰ سلوک کیا۔

دیبل کی فتح کے بعد محمد بن قاسم نے تمام شہریوں کو جمع کیا اور ان سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

''میں کوئی ظالم و جابر فاتح نہیں۔ میں دکھیوں کا حامی ہوں اور انہیں ظالموں سے نجات دلانے کے لیے یہاں آیا ہوں۔ میں مسلمان ہوں اور اسلام کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ تمام مخلوق کا خالق اللہ ہے، جو ایک ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں۔ اسلام کی تعلیم کے مطابق ظلم کرنا ایک بہت بڑا جرم ہے ہم مسلمان کسی پر زیادتی نہیں کرتے، البتہ جو حق کا دشمن ہے، ہم اس کے دشمن ہیں اور اس کے خلاف جہاد کرنا ہمارا فرض ہے''۔

محمد بن قاسم کی تقریر کے بعد اس کے ایک سپہ سالار نے اہل دیبل کے جان و مال اور عزت و آبرو کی امان کا اعلان کیا اور کہا کہ تم اس وقت تک ہماری امان میں رہو گے جب تک جزیہ ادا کرتے رہو گے اور ہم اس وقت تک اپنا فرض ادا کرتے رہیں گے۔ بدھ مت کے پروہت، امراء اور ان کی خواتین مسلم فوج کے اعلیٰ اور پاکیزہ چلن، شرافت اور رواداری سے حیرت زدہ رہ گئے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ لوٹ مار سے بچیں گے، کیونکہ

زمانے کا یہی دستور تھا۔ فتح مند فوجیں مفتوح شہر میں قتل عام کرتیں اور لوگوں کے مال و آبرو لوٹ لیتی تھیں۔ لیکن محمد بن قاسم نے اس کے برعکس لوگوں کو امان دی، ان کی عزت و آبرو کی حفاظت کی اور جزیہ کے علاوہ ان سے کچھ طلب نہ کیا۔ جب کچھ سکون ہوا تو محمد بن قاسم نے شہر میں ایک خوب صورت مسجد بنوائی اور یہاں چار ہزار عرب آباد کیے ان میں وہ قیدی بھی تھے جنہیں داہر نے قید کر رکھا تھا عرب فوج کے نیک سلوک اور بہادری کا چرچا دور دور تک پھیل گیا۔ جب اس صورت حال کی خبر راجہ داہر کو پہنچی تو وہ بہت غضب ناک ہوا اور اس نے محمد بن قاسم کو اپنے خط میں پیغام بھیجا کہ وہ دیبل کی اس فتح کو اپنا کارنامہ نہ سمجھے یہ شہر تو ایک معمولی شہر تھا اور میں نے تمہاری جوانی اور نادانی پر رحم کھا کر اپنے جان نثار اور بہادروں کو نہیں بھیجا لہٰذا تمہاری سلامتی اسی میں ہے کہ اپنے وطن واپس چلے جاؤ تا کہ ہمارے غضب سے بچ سکو۔

محمد بن قاسم نے اس لمبے چوڑے خط کا جواب چند لفظوں میں دیا: ''میں ایسے بہادروں سے طاقت آزمائی کے لیے جلد آ رہا ہوں'' اس خط کے ساتھ ہی اس نے فوج کو نیرون کی طرف بڑھنے کا حکم دیا جو بلا مزاحمت محمد بن قاسم کے ہاتھ آ گیا۔ نیرون میں چند روز قیام کے بعد محمد بن قاسم سہوان کی طرف بڑھا تو شہر ہرج کے باشندوں نے بھی خوشی سے اطاعت قبول کر لی۔ یہاں کے ٹھاکر، جاٹ اور مید وغیرہ محمد بن قاسم کے معاون بن گئے۔ ان میں سے بعض اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے اس نوجوان عرب سالار کی اطاعت کا دم بھرتے رہے۔ ان ہندی معاونوں نے راجا داہر کو شکست دینے میں بڑا نمایاں کردار ادا کیا۔ سہوان کا حاکم راجا بجرا تھا۔ اس شہر کے گرد و نواح کی زمین زرخیز ہے۔ یہاں کے باشندے بدھ مت کے پیرو تھے۔ راجا بجرا شہر میں محصور ہو گیا مگر جب اسے اندیشہ ہوا کہ کہیں شہر کے باشندے ہی اس کو قتل نہ کر دیں۔ وہ چند ساتھیوں کو لے کر راجا کاکا کے پاس سبی چلا گیا۔ راجا کے فرار کے بعد رعایا نے قلعے کے دروازے کھول دیئے اور محمد بن قاسم سے صلح کر لی۔ یہاں سے محمد بن قاسم چنہ، نیرکوٹ اور خضدار سے ہوتا ہوا سبی کی طرف بڑھا۔ راجا کاکا بھی راجہ داہر کا باجگزار تھا۔

راجہ داہر نے ایک بہت بڑا لشکر بجرا کی مدد کے لیے بھیجا تا کہ محمد بن قاسم کے میمنہ اور عقب پر حملہ کرنے میں مدد دے۔ اس لشکر کی آمد پر بلیان کے علاقے کے لوگوں نے راجا کا کا سے درخواست کی کہ انہیں بھی محمد بن قاسم سے لڑنے کا موقع دیا جائے۔ راجا کا کا نے اسے بخوشی منظور کر لیا۔ اب یہ طے پایا کہ بجرا شاہی فوج کے ساتھ سبی چلا جائے اور راجا کا کا وہاں کے چھوٹے چھوٹے ٹھاکروں کی فوجوں کو جمع کر کے محمد بن قاسم سے لڑے۔ بلیان کے ٹھاکروں نے راجا کا کا سے کہا کہ وہ محمد بن قاسم کی فوج پر رات کے وقت شب خون ماریں گے اور صبح کے وقت جب وہ تھکی ہاری اور شکستہ حالت میں ہو تو راجا کا کا ان پر حملہ کر دے راجا نے اس تجویز کو مان لیا اور رات کے وقت بلیان کے ٹھاکروں کی فوج محمد بن قاسم پر حملہ کرنے کے لیے نکلی۔ مگر جب صبح نمودار ہوئی تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ بجائے عربی فوج کی طرف بڑھنے کے وہ غلط نالوں میں سفر کرنے کے باعث سبی کے قریب پہنچ گئے ہیں راجا کا کا کے مخبروں نے اسے یہ اطلاع دی تو وہ سوچنے لگا کہ یہ لوگ اسے دھوکہ دے کر مروانا چاہتے ہیں۔ ہو نہ ہو یہ نیرون کے لوگوں سے مل گئے ہیں اور میرے اس لیے خلاف ہیں کہ میں بجرا کے ڈر سے عربوں سے لڑوں گا۔ لہٰذا یہی بہتر ہے کہ بجرا کو ڈرا کر بھگا دیا جائے۔ ادھر ٹھاکروں کی فوج نے اتفاقاً راستہ بھول جانے سے بہت برا شگون لیا۔ یہ لوگ راجا کا کا کے پاس آئے اور یہ طے ہوا کہ مسلمانوں سے صلح کر لی جائے۔ محمد بن قاسم نے ان کی درخواست منظور کر لی اور بہت جلد صلح کی شرائط طے پا گئیں اور جزیہ دینا قبول کر لیا۔

راجا بجرا سبی میں قلعہ بند ہو گیا تھا۔ محمد بن قاسم نے اس قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ چند ہی دن کے بعد بجرا کے دل میں یہ ڈر پیدا ہوا کہ رعایا دل سے اس کے ساتھ نہیں ہے۔ لہٰذا وہ راجپوتوں کا لشکر لے کر جو بیس ہزار چیدہ سواروں پر مشتمل تھا، قلعے سے مخفی طور پر باہر نکلا اور محمد بن قاسم پر اچانک حملہ کر دیا۔ محمد بن قاسم کی فوج قلعے کے چاروں طرف بکھری ہوئی تھی۔ اس لیے ہندی فوج کا یہ زوردار اور اچانک حملہ مسلمان فوج کے لیے پریشان کن ثابت ہوا مگر محمد بن قاسم ایک بے باک اور دوربین سپہ سالار تھا اس نے اپنی فوجوں کو جمع ہونے کا حکم دیا اور سالاروں کو اپنے دفاعی منصوبے پر عمل کرنے کی تاکید کی۔ دراصل اس نے اپنے اسلاف

میں سے نامور کمانڈر سیف اللہ خالد بن ولید کی نقل کی تھی۔ اس نے اپنے لشکر کے قلب کو پیچھے مقدمہ کی طرف ہٹنے کا اور میمنہ اور میسرہ کو جم کر لڑنے کا حکم دیا۔ اب اس کی فوج ہلال کی شکل میں تھی۔

گھمسان کا رن تھا اور دست بدست لڑائی ہو رہی تھی۔ ہندی فوج اپنی کثرت کی وجہ سے عربوں کو خاصا نقصان پہنچا رہی تھی۔ محمد بن قاسم یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کے باقی ماندہ بکھرے ہوئے حصے منظم ہو کر دشمن کے عقب کی طرف بڑھ رہے ہیں تو اس نے تمام فوج کو یک بارگی حملے کا حکم دے دیا۔

ہندی فوج عقب پر حملہ ہونے سے گھبرا اٹھی، بجرا نے جب اپنی فوج کو چاروں طرف سے گھرتے ہوئے دیکھا تو میدان چھوڑ دیا اور بھاگ کھڑا ہوا، اس کے بھاگتے ہی ہندی فوج نے دل چھوڑ دیا اور بھاگ کھڑی ہوئی بہت کم ایسے تھے جو جان بچا سکے۔ بے شمار مال غنیمت محمد بن قاسم کے ہاتھ آیا۔ اب محمد بن قاسم سالوج اور قندھار کی طرف بڑھا۔ یہاں کے لوگ بھی بدھ مت کے پیروکار تھے۔ انہوں نے بخوشی اطاعت قبول کر لی۔

یہاں محمد بن قاسم کو حجاج بن یوسف کا پیغام ملا کہ وہ اب اپنی توجہ راجہ داہر پر کرے اور اسے شکست دے۔ محمد بن قاسم نیرون واپس آیا تا کہ دریائے سندھ کو موجودہ ٹھٹھہ کے قریب سے پار کرے۔ اس نے چند دستے دریا کے مغربی کنارے پر بھیجے تا کہ وہ چھوٹے موٹے راجاؤں کو زیر کریں۔ ان سب راجاؤں نے عربوں کی اطاعت قبول کر لی۔ البتہ بھٹو کا راجا راسل مخالفت پر قائم رہا اور اس نے راجا داہر سے مدد کی درخواست کی۔ بجرا راجا داہر کے پاس پہنچ چکا تھا۔ داہر نے ایک بہت بڑا لشکر اپنے بیٹے راجا جے سنگھ کے ماتحت دریائے گونگ کے ساتھ ساتھ قلعہ بیٹ کی طرف بھیجا اور خود ایک اور بڑا لشکر لے کر دریائے سندھ کے مشرقی کنارے کے ساتھ آگے بڑھا اور مسلم فوج کے مقابل ڈیرے ڈال دیئے تا کہ وہ دریا کے پار نہ اتر سکے۔ محمد بن قاسم نے راجا داہر کو پیغام بھیجا کہ:

"دعوت اسلام قبول کر لو ورنہ جزیہ ادا کرو اور انکار کی صورت میں جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ"

اس خط کا جواب راجا داہر نے بہت سختی سے دیا اور محمد بن قاسم کو کتے کی موت مارنے کا پیغام بھیجا۔ اس کے ساتھ ہی راجا داہر نے ایک بڑا لشکر دریا کے کنارے اس غرض سے بھیجا کہ وہ سوستان اور طوران میں انقلاب بپا کر دے اور اس کا سپہ سالار راجا گوپی کو مقرر کیا۔ محمد بن قاسم کو جیسے ہی یہ معلوم ہوا اس نے ایک معمولی دستہ راجا کی نگرانی پر چھوڑا اور رات کے وقت خفیہ طریقے سے بیٹ کی طرف بڑھا۔ محمد بن قاسم راجا جے سنگھ کے مقابلے کے لیے اس سرعت کے ساتھ بڑھا کہ وہ حیران رہ گیا چونکہ جے سنگھ کو خبر تھی کہ محمد بن قاسم راجا گوپی کے ساتھ مقابلے میں مصروف ہے جب کہ وہ اور راجا راسل اپنی کمکوں کے انتظار میں تھے تا کہ عظیم الشان لشکر کے ساتھ بیٹ فتح کر لیں لیکن جب ایک طرف سے محمد بن قاسم اور دوسری طرف سے راجا موکا نے پیش قدمی کی تو راجا جے سنگھ گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا اور راجا داہر کی فوج کے ساتھ جا ملا۔

انہی ایام میں محمد بن قاسم کی فوج میں وبا پھیل گئی جس کے لیے اسے حجاج بن یوسف سے کمک طلب کرنا پڑی۔ حجاج بن یوسف نے فوراً کمک اور ادویات وغیرہ بھیجیں۔ ادھر محمد بن قاسم نے بھی مقامی باشندوں کو فوج میں بھرتی کر لیا جن کو تنخواہ اور مال غنیمت میں سے حصہ ملتا تھا۔ راجا نے وبا کے متعلق سن کر محمد بن قاسم کو کہلا بھیجا کہ خیریت اسی میں ہے کہ اب بھی واپس چلے جاؤ میں تمہارا تعاقب نہیں کروں گا۔ محمد بن قاسم نے جواب دیا کہ میں بہت جلد میدان جنگ میں تم سے ملوں گا۔

محمد بن قاسم خاموشی سے اپنا کام کرتا رہا تا کہ راجا داہر کے جاسوسوں کو اس کے حالات کا صحیح اندازہ نہ ہو سکے اور اپنی افواج کو خاموشی کے ساتھ ساکرہ کے نواح میں منتقل کر دیا۔ یہاں پہنچ کر محمد بن قاسم نے تمام کشتیوں کو دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر جمع کر کے آپس میں مضبوطی سے بندھوا دیا۔

جب یہ کشتیاں دریا کے پاٹ کے برابر ہو گئیں تو ایک رات چند تیراکوں نے دریا کو پار کیا اور کشتیوں کے اس پل کے اگلے سرے کو جس پر مضبوط رسے بندھے ہوئے تھے، مشرقی کناروں کی طرف کھینچا۔ اس طرح یہ پل دریا کے بہاؤ سے اپنی جگہ پر پہنچ گیا اور اس کو

مضبوطی سے کنارے پر باندھ دیا گیا۔ پل کے بندھتے ہی محمد بن قاسم فوج کو لے کر دریا کے پار اتر گیا اور فوراً راجا داہر کی فوجوں کی طرف بڑھا۔

راجا داہر نے یہاں مقابلہ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اس نے اپنے پایہ تخت راور کے جنوب کی طرف ایک قلعے میں لڑنے کا فیصلہ کیا۔ اب براجا راسل ایک لشکر کو لے کر محمد بن قاسم کو روکنے کے لیے آگے بڑھا۔ محمد بن قاسم نے عبداللہ بن علی ثقفی کو اس کے مقابلے کے لیے بھیجا راجا راسل اس معرکے میں ہار گیا اور اس نے وفاداری کا حلف اٹھایا۔ راجا راسل کو چونکہ سب حالات کا علم تھا اس لیے اس نے محمد بن قاسم کو جلد سے جلد آگے بڑھنے کا مشورہ دیا۔ اس طرح راجا راسل کی راہنمائی میں مسلمان فوج بلا کسی مزاحمت کے جے پور پہنچ گئی۔ راجا داہر کو اس کا علم ہوا تو وہ قلعے سے نکل کر کھلے میدان میں لڑنے کے لیے نکلا۔ راجا کی فوج ڈیڑھ لاکھ سے زائد اور اعلیٰ سامان حرب سے لیس تھی اور اس کی مدد کے لیے ہندوستان کے دوسرے راجاؤں نے بھی لشکر بھیجے تھے۔ محمد بن قاسم کی مسلمان فوج پانچ ہزار گھڑ سوار، پانچ ہزار شتر سوار اور تقریباً پچاس ہزار ہندی ٹھاکر، جاٹ اور زمید سپاہیوں پر مشتمل تھی۔

لڑائی شروع ہوئی، محمد بن قاسم نے اپنی فوج کے سامنے خندق کھود لی تھی جس کی وجہ سے وہ محفوظ رہے ان خندقوں کی آڑ سے مسلمان تیر اندازوں نے دشمن کو بہت نقصان پہنچایا جس کی وجہ سے ان میں کچھ بدنظمی پیدا ہوئی۔ یہ دیکھ کر راجا داہر نے ساری فوج کو حملے کا حکم دے دیا۔ اس وقت ابو صابر اور راجا راسل چکر کاٹ کر ہندی فوج کے عقب میں پہنچ گئے اور ہاتھیوں کو نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ اتفاق سے ایک تیر راجا داہر کے ہاتھی کی سونڈ کے ریشمی غلاف میں جا پھنسا اور اس میں آگ لگ گئی۔ ہاتھی گھبرا کر بھاگا۔ فوج والوں نے سمجھا کہ راجا داہر جان بچا کر کھسک رہا ہے۔ راجا داہر ندی کے کنارے پہنچا ہی تھا کہ ایک عرب شہسوار نے، جو اس کا تعاقب کر رہا تھا، تلوار کا ایک ایسا وار کیا کہ اس کا سر تن سے جدا کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی سندھی فوج کو شکست ہوگئی۔ راجا جے سنگھ باپ کی موت کی خبر سن کر راور جا کر قلعہ بند ہو گیا۔ جہاں رانی بائی، جو راجا کی بیوی اور سگی بہن بھی تھی، پہلے موجود تھی۔ محمد بن قاسم راجا داہر کے پایہ تخت راور کی طرف بڑھا تو راجا جے سنگھ وہاں سے بھاگ گیا۔ راور کی

فتح کے بعد محمد بن قاسم نے بہمن آباد، دھلیلہ اور بہرور کے قلعوں کو فتح کیا۔

اس کے بعد محمد بن قاسم نے بابیہ کو فتح کیا۔ بابیہ سے وہ اسکلندہ کی طرف بڑھا اس شہر کو بھی آسانی سے فتح کرنے کے بعد محمد بن قاسم نے ملتان کا رخ کیا۔ راستے میں قلعہ سکہ ٹھہرا جس کے راجا بجرا نے محمد بن قاسم کا ڈٹ کر مقابلہ کیا مگر سترہ دن کی لڑائی کے بعد آخر کار ہتھیار ڈال دیئے۔ ملتان کے حاکم نے بھی اپنے آپ کو قلعے میں محصور کر لیا، کئی ہفتے گزر گئے مگر قلعہ فتح نہ ہوا اور محمد بن قاسم سامان رسد کی کمی کی وجہ سے پریشان ہو گیا۔ اس قلعے کی دیواروں نے منجنیق کا کامیابی سے مقابلہ کیا۔ آخر کار ایک نہر کا سراغ ملا جس کا پانی قلعے میں جاتا تھا۔ اس نہر کو بند کر دیا گیا جس پر لوگوں نے گھبرا کر قلعے کا پھاٹک کھول دیا۔ ملتان کے بعد عرب افواج نے بھلیمان بھی فتح کر لیا۔ اس طرح پورا سندھ مسلمانوں کے زیر نگیں ہو گیا- ملتان کی فتح کے فوراً بعد ہی حجاج بن یوسف کے انتقال کی خبر ملی۔ اس کے چھ ماہ بعد خلیفہ ولید بھی وفات پا گیا اور اس کی جگہ سلیمان بن عبدالملک خلیفہ بنا۔ حجاج نے سلیمان کی ولی عہدی کی مخالفت کی تھی اس لیے وہ اس کا سخت دشمن تھا اس نے خلیفہ بنتے ہی حجاج کا بدلہ اس کے دوستوں اور خاندان والوں سے لیا اور سب کو چن چن کر قتل کر دیا۔

محمد بن قاسم بھی خلیفہ کے عتاب سے نہ بچ سکا۔ سلیمان نے اسے معزول کر کے واپس آنے کا حکم دیا اور اس کی جگہ یزید بن ابی کبشہ کو سندھ کا حاکم مقرر کیا۔ یزید بن ابی کبشہ نے محمد بن قاسم کو یہ کہہ کر روکنا چاہا کہ سلیمان تمہارے خون کا پیاسا ہے لہٰذا تم یہیں رک جاؤ۔ اس کے جواب میں محمد بن قاسم نے کہا کہ میں نہیں چاہتا کہ میرے خون کے چند قطروں کے لیے عالم اسلام دو حصوں میں تقسیم ہو جائے۔ یزید نے کہا کہ میں خود جا کر سلیمان کو بتاؤں گا کہ سندھ میں ایک لاکھ سے زیادہ سپاہی آپ کے لیے اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دیں گے تو وہ آپ کے خلاف یقیناً اپنا فیصلہ واپس لے لے گا۔ محمد بن قاسم نے کہا اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ میں اور میرے ساتھ مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت مرکز سے کٹ کر علیحدہ ہو جائے گی اور ہم دنیا میں ایک اجتماعی جدوجہد کے انعام سے محروم ہو جائیں گے اور میں سمجھتا ہوں کہ لامرکزیت دنیا کی بڑی بڑی طاقتوں کو لے ڈوبتی ہے۔ یہ کہہ کر محمد بن قاسم نے بصرہ

جانے کی تیاری کی اور روانگی کے لیے تیار ہو گیا۔ محمد بن قاسم جانے لگا تو دروازے پر تل دھرنے کی جگہ نہ تھا۔ محمد بن قاسم دروازے سے باہر نکلا تو ہجوم نے ادھر ادھر سمٹ کر دروازے کے سامنے سیڑھیاں خالی کر دیں۔ فوج کے عہدیدار، معززین اور پروہت آگے بڑھ کر اس سے مصافحہ کرنے لگے۔ محمد بن قاسم نے گھوڑے پر سوار ہو کر چاروں طرف دیکھا تو اسے کوئی آنکھ آنسوؤں سے خالی نظر نہ آئی۔ سفید ریش بوڑھے یہ محسوس کر رہے تھے کہ ان کا عزیز ترین بیٹا ان سے رخصت ہو رہا ہے۔ بیوہ عورتیں اور یتیم بچے محسوس کر رہے تھے کہ قدرت ان کا زبردست سہارا چھین رہی ہے۔ نوجوان لڑکیاں یہ کہہ رہی تھیں کہ ان کی عزت وعفت کا نگہبان جا رہا ہے۔ ارور کے درودیوار پر حسرت برس رہی تھی۔

دیبل کے بازاروں سے سلیمان بن عبدالملک کے قیدی کا گھوڑا پھولوں کے ڈھیر روندتا ہوا نکلا۔ لوگوں کے ہاتھ ابھی تک دعا کے لیے اٹھے ہوئے تھے۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش جاری تھی۔ آہوں اور سسکیوں کی آوازیں آہ و بکا میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ ان کا سہارا محمد بن قاسم ان سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ کر جا چکا تھا۔ محمد بن قاسم عراق پہنچا جہاں کا حاکم صالح بن عبدالرحمٰن تھا جس کے بھائی آدم کو جو خارجی تھا حجاج بن یوسف نے قتل کیا تھا۔ اس نے اپنے بھائی کا بدلہ لینے کے لیے محمد بن قاسم کو قتل کر دیا۔ اس طرح یہ عظیم نوجوان سپہ سالار جس نے اپنے ایک لاکھ سے زائد جانبازوں کی موجودگی میں اطاعت امیر کی بیڑیاں پہنیں، جو چاہتا تو سندھ کے ہر گھر کو اپنا قلعہ بنا سکتا تھا لیکن اس کے باوجود وہ اطاعت امیر سے منحرف نہ ہوا، جس کے دل میں ملت اسلامیہ کا درد اور اس کے سامنے عالم اسلام کا مستقبل تھا۔ اس نے اپنی جان دے دی لیکن اسلامی اصولوں سے سرمو انحراف گوارا نہ کیا تھا۔ وہ عظیم سالار جس کو نہ تو فتوحات نے خودسر یا رعونت پسند بنایا نہ اسے مال و زر خرید سکا بلکہ جیسے جیسے کامیابیاں حاصل ہوتی گئیں، ویسے ویسے وہ ایمان وعمل میں ترقی کرتا گیا اور ایک مثالی مرد مومن ثابت ہوا۔

کہتے ہیں کہ جب محمد بن قاسم کو قید میں ڈالا گیا تو اس نے صبر و استقلال سے اس زبان کو سنا اور یہ شعر پڑھا: ''لوگوں نے مجھ کو ضائع کر دیا اور کس جوان کو ضائع کیا! اس کو

جوان کے آڑے وقت اور مصیبت میں کام آئے اور سرحدوں کی حفاظت کے لیے نہایت موزوں ہو"۔

❀❀❀



طارق بن زیادؒ

"اے مسلمانو! اعلائے کلمۃ اللہ اور غلبۂ دین کے لئے تم ذلت پر کبھی راضی نہ ہونا میدان جنگ میں میرا قدم تم سب سے آگے ہوگا اگر میں شہید ہو جاؤں تو کسی اور کو اپنا سردار بنا کر فتح و نصرت کا سفر جاری رکھنا"

تاریخ اسلام کے روایت ساز کمانڈر کی داستان شجاعت

''کشتیاں جلادیں جائیں۔''

کمانڈر نے کشتیوں سے اترنے کے بعد اپنے سپاہیوں کو حکم دیا۔

کمانڈر کا یہ حکم سن کر لشکر کے اندر حیرانگی اور بے چینی کی ءلہر دوڑ گئی۔ تمام سپاہی حیرت سے کمانڈر کی طرف دیکھنے لگے۔

کمانڈر نے بھی ان کی اس کیفیت کو محسوس کرلیا اور ان کو مخاطب کر کے گویا ہوا۔ ''اب ہماری واپسی کا کوئی راستہ نہیں۔ اب صرف دو ہی راستے ہیں کہ یا تو ہم اس ملک سے ظلم وستم کا خاتمہ کر کے سرخرو ٹھہریں یا پھر جام شہادت نوش کر کے اپنے رب کے سامنے سرخرو ہو کر اس کی جنتوں کے مکین بن جائیں۔''

تمام سپاہی کمانڈر کا مدعا سمجھ گئے اور انہوں نے آگے بڑھ کر کشتیوں کو آگ لگادی۔ چند لمحے قبل کمانڈر کا حکم سن کر سپاہیوں کے چہروں پر آنے والی حیرانی و پریشانی کی جگہ اب اطمینان وخوشی نے لے لی تھی۔

اپنے اللہ پر یقین کامل، اپنے بازوؤں پر بھروسہ اور ہمت وجرأت کا ایسا نمونہ تاریخ نے اس سے قبل نہ دیکھا تھا۔ یہ جانتے بوجھتے ہوئے کہ ان کے ساتھیوں کی تعداد محض سات ہزار

ہے اور سامنے ایک پورا ملک ہے۔ ڈھائی کروڑ نفوس سے بھرا ہوا پورا ملک' ناقابل عبور فصیلوں والے قلعے' ان گنت فوجیں اور ان گنت اسلحہ کا مقابلہ مٹھی بھر نوجوانوں سے کرنے والے یہ کمانڈر عالم اسلام کے عظیم جرنیل طارق بن زیاد تھے جو فتح یا شہادت کے جذبے سے سرشار اور ہر طرح کے وسائل سے بے نیاز راڈرک کے ایک لاکھ لشکر سے نبرد آزما ہونے جا رہے تھے۔ یہ مجاہدین ہسپانیہ کیوں پہنچے اور ہسپانیہ کے بادشاہ سے کیوں ٹکرائے؟ تاریخ اس کی تفصیل کچھ یوں بیان کرتی ہے۔

جس زمانے میں شمالی افریقہ میں رواداری اور خوشحالی کا دور دورہ تھا' اس کا ہمسایہ جزیرہ نما ہسپانیہ گوتھک بادشاہوں کے تشدد تلے دبا ہوا تھا اور ان بادشاہوں کے عہد حکومت میں ہسپانیہ کی حالت بدتر تھی۔ جس طرح رومیوں کے زمانہ میں امیروں سے ٹیکس نہیں لیا جاتا تھا۔ اسی طرح گوتھک بادشاہوں کے عہد میں ہسپانیہ کی حکومت کا سارا بوجھ نچلے طبقوں پر تھا۔

ہسپانیہ کے یہودی بھی ہسپانیہ کے بادشاہ' جاگیرداروں اور پادریوں کے ہاتھوں بڑی سختیاں جھیل چکے تھے۔ انہوں نے تنگ آ کر بغاوت کی جس کے ناکام ہونے کے بعد یہودیوں کا قتل عام کیا گیا اور جو بچ گئے ان کا مال واسباب لوٹ کر انہیں غلام بنالیا گیا۔ یہودیوں کو آپس میں شادی بیاہ کی اجازت نہیں تھی۔ ہسپانیہ کے طول وعرض میں جن پادریوں کو اقتدار حاصل تھا انہوں نے یہودیوں کی یہ گت بنائی تھی۔ تباہ حال شہری' برباد شدہ غلام اور مظلوم یہودی سب کے سب کسی آنے والی سعید گھڑی کے انتظار میں تھے۔ اسی انتظار میں انہیں غیر متوقع مقام سے امداد مل گئی۔ گوتھک راج کے مظلوم آبنائے کے اس پار امن وامان کو پاکر وہاں سے بھاگ جاتے۔ بہت سے ہسپانویوں نے اپنے پادریوں کے مظالم سے تنگ آ کر اسلامی افریقہ میں پناہ لی۔ جس زمانہ میں شمالی افریقہ پر موسیٰ بن نصیر حکمران تھا۔ اسی زمانہ میں ہسپانیہ کے تخت پر راڈرک قابض تھا۔

راڈرک نے ہسپانیہ کے سابق حکمران کو قتل کر کے تخت حاصل کیا تھا۔ ہسپانیہ کے پناہ گزینوں نے مسلمانوں سے درخواست کی کہ وہ ہسپانیہ پر حملہ کر کے وہاں کی آبادی کو دکھ درد سے نجات دلائیں۔ قیوط کا حکمران جولین بھی درخواست کرنے والوں میں شامل تھا۔

جولین شہر سبتہ کا حکمران تھا جو شمالی افریقہ کے ساحل پر واقع تھا اور ہسپانوی حکومت کے ماتحت تھا۔ اس نے موسیٰ بن نصیر سے ہسپانیہ پر حملہ کی درخواست اس لئے کی کہ اس لئے اپنی بیٹی فلوریڈا کو طلیطلہ کے دربار میں بھیج رکھا تھا تاکہ وہ وہاں شاہی محلوں میں رہ کر اپنے مرتبے کے مطابق تعلیم وتربیت حاصل کرے لیکن یہاں بادشاہ راڈرک کی نظر اس پر پڑی تو اس نے اس کے دامن عصمت کو داغدار کر دیا۔ جولین کو جب اس بات کا پتہ چلا تو وہ غصے میں آپے سے باہر ہوگیا اور وہ خواہش کرنے لگا کہ سبتہ کے دروازے مسلمانوں کے لئے کھول دے۔ لیکن پہلے اس نے مسلمانوں سے ایک وعدہ کرلیا اور پھر موسیٰ بن نصیر کو دعوت دی کہ وہ ہسپانیہ پر فوج کشی کرنے اور فوج کی روانگی کے لئے جولین نے جہازوں کے انتظام کا بھی وعدہ کیا کہ ضرورت کے وقت فوراً مہیا کر دیئے جائیں گے۔ ساتھ ساتھ اس نے وہاں کے بادشاہ کے ظلم وستم، غریبوں کے استحصال کا ذکر اور وہاں کی شادابی و دولت کی تعریف کر کے موسیٰ کو ترغیب دی اور یقین دلایا کہ "تمہیں یہی کرنا پڑے گا کہ جاؤ اور وہاں قبضہ کرلو۔"

موسیٰ بن نصیر نے اندلس کی اندرونی حالت اور ظالم بادشاہ کے ظلم کے واقعات سن کر خلیفہ وقت ولید بن عبدالمالک کی اجازت سے 91ھ میں اپنے ایک سردار طریف بن مالک کو پانچ سو مجاہدین کے ساتھ کاونٹ جولین کی رہنمائی میں اندلس روانہ کیا۔ یہ لشکر اندلس کے جنوبی راستے کے کنارے بندرگاہ الخضراء پر اترا۔ طریف بن مالک بعض جزائر اور ساحلی شہروں سے مال غنیمت حاصل کرتا ہوا واپس آیا۔ اس نے جولین کے بیان کی تصدیق کی اور بتایا کہ اندلس پر قابض ہونا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

طریف بن مالک کی واپسی کے بعد موسیٰ بن نصیر نے اپنے آزاد کردہ غلام طارق بن زیاد کو اندلس روانہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ موسیٰ نے اس اولوالعزم اور بلند ہمت سپہ سالار کو جو طنجہ کا گورنر تھا ۹۲ھ میں سات ہزار فوج دے کر کاونٹ جولین کے ہمراہ اندلس روانہ کیا۔ یہ لشکر جس میں اکثر بربری اور عربی مجاہد تھے۔ ساحل افریقہ سے روانہ ہو کر اندلس کی اس مشرقی ساحلی چٹان پر پہنچ گیا جسے جبل الطارق کہتے ہیں۔ (اب یورپین اسے اپنی روایتی تنگ نظری اور تعصب کی وجہ سے جبرالٹر کہتے ہیں۔ اس سے مقصود مسلمانوں کی تاریخ کو مسخ کرنا ہے)

اسلامی لشکر ابھی کشتیوں سے اترا ہی تھا کہ سالار لشکر طارق بن زیاد نے حکم دیا کہ ''تمام کشتیوں کو جلا دیا جائے۔'' طارق کا یہ فرمان بن کر فوج کے اندر حیرانگی اور بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔ تمام لوگوں کے دلوں میں خوف وہراس تھا۔ یہ سب متذبذب تھے کیونکہ اگر وہ یہاں جنگ ہار گئے تو ان کی واپسی کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

بہر حال حکم کی تعمیل کی گئی اور کشتیاں جلا دی گئیں۔ اب وہ اپنے سامنے کشتیوں کو جلتا اور ڈوبتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ طارق نے ایسا اس لئے کیا کہ مسلمانوں کے ذہن سے واپسی کا تصور نکل جائے۔ ان کے سامنے صرف میدان ہو اور وہ موت سے لاپرواہ ہو کر میدان میں کود جائیں۔ یقیناً تاریخ کے اس منفرد اور ایمان افروز واقعہ سے طارق کی بے مثل ہمت وجرأت کا ثبوت ملتا ہے۔ وہ دشمن پر جھپٹنا تو جانتا تھا مگر میدان سے پلٹنا نہیں جانتا تھا۔ طارق کو اس کی فوج کے سامنے اب فتح یا شہادت تھی اس کے علاوہ کوئی راستہ نہ تھا۔

اتفاق سے مسلمانوں کی آمد کے وقت گھاتھ قوم کا ایک جاگیردار تھیوڈومر زبردست فوج کے ساتھ اسی نواح کے علاقوں کی دیکھ بھال کے لئے آیا ہوا تھا۔ تھیوڈومر نے خبر ملتے ہی نو وارد حملہ آوروں پر حملہ کر دیا مگر شکست کھا کر بھاگ نکلا۔

اس نے راڈرک کو اطلاع دی کہ ''ہمارے ملک پر اچانک ایک ایسی قوم نے حملہ کر دیا ہے جس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کہ وہ کیا ہیں؟ اور کہاں سے آئے ہیں؟ آسمان سے گرے ہیں یا زمین سے نکلے ہیں۔''

راڈرک کو جب یہ پیغام ملا وہ شمالی اندلس کے شہر بسکے کی ایک بغاوت کو فرد کرنے میں مشغول تھا۔ یہ خبر سنتے ہی وہ وہاں سے الٹے پاؤں بھاگ کر قرطبہ آ پہنچا اور اطراف ملک سے فوجیں فراہم کرنی شروع کر دیں۔

ادھر طارق بن زیاد برابر پیش قدمی کرتا ہوا وادیٔ لکہ میں پہنچ گیا جو دریائے گراڈلٹ کے کنارے پر ہے۔ طارق کے جاسوس اور خبر رساں راڈرک کی چھاؤنی اور ارد گرد کے علاقوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ انہوں نے راڈرک کی بے پناہ تیاریوں کی خبریں پہنچائیں اور بتایا کہ راڈرک اپنی سپاہ کے ساتھ میدان میں نکل آیا ہے۔

یہ حال سن کر طارق نے اپنے سردار موسیٰ بن نصیر سے مزید مدد طلب کی۔ چنانچہ موسیٰ نے پانچ ہزار مجاہدین اور بھیج دیئے۔ اس طرح کل اسلامی لشکر بارہ ہزار ہو گیا۔

وادیٔ لکہ میں دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔ طارق بن زیاد نے جنگ سے پہلے مجاہدین اسلام کے سامنے ایک پر جوش اور ولولہ انگیز تقریر کی جس کا خلاصہ یہ ہے۔

''اے مسلمانو! میدان جنگ سے اب فرار کی کوئی صورت نہیں۔ تمہارے آگے دشمن کی فوج ہے اور پیچھے ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر۔ تمہاری کامیابی صداقت پر استقلال کے ساتھ جمے رہنے میں ہے۔ تعداد اور سامان جنگ کے لحاظ سے اس جزیرہ میں تمہاری کچھ حیثیت نہیں۔ اگر تم نے جرأت و ہمت دکھائی تو تعداد کی قلت ہرگز تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ آج دشمن کی فوج بزدلی، اختلاف اور غرور کی وجہ سے شکست کھائے گی۔ اگرچہ وہ تعداد اور وسائل میں تم سے زیادہ ہے۔ امیر المؤمنین نے تم پر اعتماد کر کے اعلائے کلمۃ اللہ اور غلبۂ دین کے لئے یہاں بھیجا ہے۔ تم ذلت پر کبھی راضی نہ ہونا۔ میدان جنگ میں میرا قدم تم سب سے آگے ہوگا۔ میں سردار قوم راڈرک پر حملہ کروں گا۔ تم بھی میرے ساتھ دشمن پر پل پڑنا۔ اگر میں شہید ہو جاؤں تو کسی اور کو اپنا سردار بنا کر فتح و نصرت کا سفر جاری رکھنا۔''

شاہ اندلس راڈرک بڑی شان و شوکت سے میدان میں آیا۔ وہ فوج کے آگے تخت رواں پر سوار تھا۔ سر پر چتر شاہی سایہ کئے ہوئے تھے۔ بادشاہ کے سر کا تاج اور جواہرات سے سجا ہوا لباس نگاہوں کو خیرہ کر رہا تھا۔ گاتھ قوم کے شہزادے اور اندلس کے امراء و رؤسا، اپنے اپنے لشکروں کے ساتھ جن کی مجموعی تعداد ایک لاکھ تھی اس لڑائی میں شریک تھے۔ دوسری طرف سروں پر سفید عمامے باندھے، چمکدار زرہ بکتر پہنے، تلوار حمائل کئے اور نیزہ ہاتھ میں لئے بارہ ہزار مسلمان تھے۔ ادھر فخر و ناز کے ساتھ گردنیں اکڑی ہوئیں تھی۔ ادھر عجز و انکاری کے ساتھ بارگاہ رب العزت میں سر جھکے ہوئے تھے۔ ادھر اپنی زبردست عسکری طاقت پر اعتماد تھا۔ ادھر صرف قوت ایمانی اور اللہ کی مدد پر بھروسہ تھا۔ وہ اپنے وطن کی سرزمین میں لڑ رہے تھے۔ جہاں انہیں ہر قسم کی مدد مل سکتی تھی۔ یہ اپنے وطن سے دور سمندر پار بے یار و مددگار تھے۔

جنگ کا آغاز اندلسیوں کی طرف سے ہوا۔ ادھر سے مسلمان آگے بڑھے اور جلد ہی گھمسان کا رن پڑ گیا۔ مسلمانوں نے سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق لشکر کے میمنہ اور میسرہ پر یلغار کی کیونکہ ان کی کمانڈ گھاتھ شہزادوں کے ہاتھ تھی جو زبردستی یا لالچ دے کر میدان میں لائے گئے تھے۔ یہ تثلیث پرست مسلمانوں کے حملوں کی تاب نہ لاتے ہوئے بری طرح پسپا ہوئے اور میدان سے فرار ہو گئے۔ ان کی بے سالار فوج نے بھی لڑائی سے ہاتھ روک لیا۔

تاہم راڈرک پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا اور وہ اپنے قلب کی فوج کے ساتھ جم کر لڑتا رہا۔ لڑائی ۲۷ رمضان سے ۵ شوال ۹۲ھ تک جاری رہی لیکن ان آٹھ دنوں میں عیسائی پوزیشنیں بدلتے بدلتے بیس میل تک پیچھے ہٹ گئیں۔ آٹھویں روز طارق نے قلب پر فیصلہ کن حملہ کیا۔ قلب کی سپاہ میں ابتری پھیل گئی اور وہ میدان سے بھاگنے لگی۔ راڈرک یہ صورتحال دیکھ کر اس تیزی سے فرار ہوا کہ مسلمان تعاقب کے باوجود اسے نہ پکڑ سکے۔ مگر وہ بدحواسی کے عالم میں بھاگتا ہوا دریا میں ڈوب کر مر گیا۔

اب میدان خالی تھا اور لاشوں سے پٹا پڑا تھا۔ تین ہزار مسلمان بھی شہید ہوئے ۔عیسائیوں کی لاشوں کا شمار نہ تھا۔ اس لڑائی میں مسلمانوں کے ہاتھ بے شمار مال غنیمت آیا۔ مسلمانوں نے اس اہم ترین جنگ میں فتح حاصل کی اور اپنے سے کئی گنا بڑی فوج کو شکست فاش دے دی۔ اس عظیم فتح نے مسلمانوں کے حوصلے مزید بلند کر دیئے اور اندلس کے لوگ اس شکست سے اس قدر پست ہمت اور بزدل ہو گئے کہ پھر وہ کسی مقام پر بھی مسلمانوں کا جم کر مقابلہ نہ کر سکے۔

دراصل اس لڑائی نے تاریخ اندلس کے اوراق بدل دیئے اور آٹھ دن کی اس مسلسل لڑائی نے آٹھ صدیوں کے لئے اندلس کی قسمت کا فیصلہ مسلمانوں کے حق میں کر دیا۔

اندلس کے لوگوں کا اب تک یہی خیال تھا کہ طارق بن زیاد بھی اپنی مہم سے فارغ ہو کر طریف بن مالک کی طرح مال غنیمت لے کر واپس چلا جائے گا اور مزید پیش قدمی نہیں کرے گا۔ لیکن طارق نے وادیٔ لکہ کی فتح کے بعد پورے اندلس میں فتوحات کا سلسلہ جاری رکھا اور دشمن کو کہیں بھی سنبھلنے کا موقع نہ دیا۔

طارق بن زیاد ابھی وادیٔ لکہ میں ہی تھا کہ معلوم ہوا کہ شکست خوردہ اندلسی فوج استجہ میں جمع ہو چکی ہے۔ طارق کو اس سے خطرہ لاحق ہوا۔ وہ فوراً انہیں کچلنے کے لئے استجہ پہنچ گیا۔ یہاں اندلسی فوج نے مجاہدین کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ لیکن یہ زیادہ دیر تک جم نہ سکے اور شکست تسلیم کر لی۔ انہوں نے شہر طارق بن زیاد کے قبضے میں دے دیا۔ طارق نے عسکری لحاظ سے اہمیت کے حامل اس شہر کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنالیا۔ طارق نے یہاں سے اسلامی لشکر کو چار حصوں میں تقسیم کر کے تمام اندلس کی فتح کے لئے مختلف سمتوں میں پھیلا دیا۔

اطراف ملک میں دستے بھیجنے کی تجویز کاونٹ جولین نے پیش کی۔ اس کا خیال تھا کہ اس وقت سارے ملک میں پریشانی اور بدحواسی پھیلی ہوئی ہے۔ عوام اور سپاہ دونوں مسلمانوں کی طاقت سے مرعوب ہیں۔ ایسے وقت میں مسلمانوں کے چھوٹے چھوٹے دستے ہی علاقوں کو فتح کر لیں گے۔ رعب کے مارے ہوئے لوگوں کی اگر دوبارہ شیرازہ بندی ہوگئی تو پھر ان کا مقابلہ کرنا آسان نہ ہوگا۔

طارق بن زیاد نے اس مہم کا آغاز کرتے ہوئے قرطبہ کی فتح کے لئے تجربہ کار سپہ سالار مغیث الرومی کو سات سو سواروں کے ساتھ بھیجا۔ قرطبہ کا حاکم شاہی خاندان کا ایک تجربہ کار سالار تھا۔ جب اسے مسلمانوں کے آنے کی خبر ہوئی تو وہ اپنے چار سو سپاہیوں اور تھوڑے سے شہریوں کے ساتھ حفاظت کے لئے قلعہ بند ہو کر بیٹھ گیا۔ شہر کی فصیل بے حد مستحکم اور بلند تھی۔ لیکن اس کی بیرونی دیوار ایک جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ اس سوراخ کے ساتھ انجیر کا ایک درخت لگا ہوا تھا۔ مسلمان سپاہیوں کو اس راستے کا علم ہو گیا۔ چنانچہ وہ اسی رات اندھیرے میں دریا پار کر آئے۔ اتفاق سے اسی رات طوفان بادوباراں آیا اور خوب اولے برسے۔ شہر پناہ کے محافظ پہرے چھوڑ کر کونوں کھدروں میں جا کر سو گئے۔ طوفان کے زور و شور نے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز کو دبا دیا اور وہ خاموشی کے ساتھ دیوار کے شکستہ حصہ کے نیچے پہنچ گئے۔ ایک فدائی مجاہد انجیر کے درخت پر چڑھ گیا اس نے اپنی پگڑی کی کمند بنا کر دوسرے ساتھیوں کو بھی فصیل پر کھینچ لیا۔ یہ مجاہدین فدائی کارروائی کرتے ہوئے شہر کے اندر داخل ہو گئے اور محافظین کو قتل کر کے شہر کا دروازہ کھول دیا۔ اسلامی لشکر اندر داخل ہو گیا اور بغیر کسی مزاحمت

کے شہر پر قابض ہو گیا۔

حاکم قرطبہ شہر کو چھوڑ کر سینٹ جارج کے گرجے میں جا چھپا۔ یہ گرجا ایک مضبوط قلعہ نما تھا۔ جس کے گرد ایک خندق بھی تھی۔ اس گرجا میں قریب ہی کے ایک پہاڑی چشمہ سے پانی پہنچتا تھا۔ مغیث الروی نے چشمہ کی نالی کو بند کروا دیا۔ محصورین نے مجبور ہو کر ہتھیار ڈال دیئے اور اس شہر کا حاکم مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا۔ اس کی گرفتاری کے بعد قرطبہ مکمل طور پر فتح ہو گیا۔

مغیث رومی نے اس کے بعد شہر کے نظم و نسق کو بحال کیا۔ یہودیوں کو ان کی لوٹی ہوئی جائیدادیں واپس کیں جو کہ عیسائیوں نے ان سے چھین رکھی تھیں۔

قرطبہ کے بعد مغیث رومی صوبہ تدمیر کی طرف بڑھا۔ یہاں کے گورنر تھیوڈومر نے مسلمانوں کا بڑی جانبازی کے مقابلہ کیا مگر مغیث رومی کی تلوار خارشگاف کے سامنے اس کی شجاعت کچھ کام نہ آ سکی۔ جب اس کی تمام فوج مسلمانوں کے مقابلے میں کام آ گئی تو وہ اریویلہ میں قلعہ بند ہو بیٹھا اور اس نے بڑی چالاکی سے مسلمانوں کو دھوکا دے دیا۔

وہ خود ایلچی کے لباس میں آیا اور ظاہر کیا کہ ان کے پاس بڑی فوج ہے۔ اس نے کہا کہ ہم شہر خالی کر دیتے ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ قلعے کا سارا اسباب و سامان اور خزانہ و دولت ہمارا ہوگا۔ اسلامی سپہ سالار نے شرط قبول کر کے صلح نامہ اپنی مہر ثبت کر دی۔ جب مسلمان قلعے میں داخل ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ عورتوں بچوں اور بوڑھوں کے سوا یہاں کوئی نہیں تھا۔

مسلمانوں کو یہ دیکھ کے بے حد پشیمانی ہوئی کہ دشمن اسلام تھیوڈومر خود قاصد کی شکل میں آ کر اپنی جان بھی بچا گیا اور ساز و سامان بھی اپنے نام کروا گیا۔ لیکن ایفائے عہد چونکہ اسلام کی تعلیمات میں ایک مومن مجاہد کے لئے لازمی شرط ہے۔ لہٰذا مسلمان اپنے وعدے پر قائم رہے اور اہل قلعہ کو جانے دیا۔

ادھر طارق بن زیاد نے خود دارالسلطنت طلیطلہ کی طرف پیش قدمی کی۔ اس شہر کو گھاتھ قوم کے فرمانرواؤں نے پایۂ تخت بنایا تھا۔ یہاں ان کا خزانہ ان کی دولت اور قیمتی شاہی ورثہ

تھا۔ اہل طلیطلہ کو جب معلوم ہوا کہ مسلمانوں کا لشکر ان کی طرف بڑھ رہا ہے تو انہوں نے اس کے آنے سے پہلے پہلے ہی یہاں کی تمام دولت و نوادرات دوسرے مقامات پر منتقل کر دیئے۔ وہ خود شہر چھوڑ کر جبل اشارات کے پار ایک شہر جلیقیہ (لیسٹریاس) چلے گئے۔

چنانچہ طارق بن زیاد جب طلیطلہ پہنچا تو اس نے شہر کو بالکل خالی پایا۔ اس طرح بغیر جنگ وجدل کے اندلس کا دارالسلطنت مسلمانوں کو مل گیا۔ طلیطلہ کی فتح کے بعد طارق بن زیاد اہل طلیطلہ کے تعاقب پر نکل پڑا۔ اسلامی لشکر اہل طلیطلہ کی پناہ جلیقیہ (اندلس کا شمال مغربی سرحدی صوبہ) میں پہنچ گئے۔ مسلمانوں نے اس صوبہ کو بھی فتح کیا اور بہت سا قیمتی مال غنیمت حاصل کیا۔ اس کے بعد طارق بن زیاد نے شمالی اندلس کے شہر استرقہ کو بھی فتح کیا۔ ابھی طارق بن زیاد کی پیش قدمی جاری تھی کہ موسیٰ بن نصیر بھی مہم کو سخت خیال کر کے پانچ ہزار فوج کے ہمراہ اندلس آ گئے۔ یہ رمضان المبارک ۹۳ھ میں ساحل اندلس پر لنگر انداز ہوئے یہاں ان کا استقبال کاونٹ جولین نے کیا۔

موسیٰ بن نصیر کو جب طارق بن زیاد کی شمالی علاقوں اور پایہ تخت کی فتوحات کا علم ہوا تو اس نے نئے میدان یعنی جنوبی علاقوں کی طرف بڑھنے کا فیصلہ کیا۔

موسیٰ نے پہلے ابن السلیم کو فتح کیا۔ وہاں سے کاونٹ جولین کی سرکردگی میں ایک دستہ قرمونہ کی طرف روانہ کیا۔ یہ شہر اپنی مضبوطی اور استحکام کے لحاظ سے اندلس بھر میں لاجواب تھا اور اس کا فتح کرنا آسان نہ تھا۔ کاونٹ جولین کے سپاہیوں نے اس مشکل کو اس طرح حل کیا کہ انہوں نے اپنے آپ کو شکست خوردہ اندلسی ظاہر کر کے اہل قرمونہ سے پناہ طلب کی جسے انہوں نے قبول کر لیا۔ جب رات کی تاریکی چھائی اور تمام لوگ سو گئے تو جولین نے شہر کے دروازے کھول دیئے۔ دروازے کھلتے ہی اسلامی فوج اندر داخل ہو گئی۔ اس طرح قرمونہ بلا مقابلہ مسلمانوں نے فتح کر لیا۔

قرمونہ کی فتح کے بعد موسیٰ بن نصیر نے اشبیلیہ (جنوب مغربی صوبہ) کو فتح کیا جو بڑا خوبصورت' دولت مند اور قدیم شہر تھا اور گھاتھ خاندان سے پہلے مدتوں عیسائی سلطنت کا مرکز رہا۔ اندلس کے تمام علماء فضلاء اور پیشوا یہیں رہتے تھے۔ فتح اشبیلیہ کے بعد موسیٰ بن نصیر

بطلیموس پہنچا اور اس کے تاریخی شہر ماردہ (میریڈا) کا محاصرہ کرلیا۔ اہل ماردہ شہر بند ہو کر لڑتے رہے۔ روزانہ ان کا لشکر لڑنے کے لئے نکلتا اور شام کو واپس جاتا۔ جب یہ سلسلہ طویل ہوا تو موسیٰ بن نصیر نے جنگی حکمت عملی سے کام لیا۔ رات کے وقت پہاڑی دروں میں مسلمان چھپا دیئے گئے صبح جونہی عیسائی فوج شہر سے نکلی مجاہدین نے دروں سے نکل کر پیچھے سے حملہ کر دیا۔ اکثر فوجی مارے گئے باقی بھاگ کر شہر میں گھس گئے اور پھر نہ نکلے۔

شہر کی فصیل اور برج بہت اونچے اور مضبوط تھے۔ مسلمانوں کو عرصہ تک محاصرہ رکھنا پڑا۔ آخری موسیٰ بن نصیر نے ایک قلعہ شکن آلہ دبابہ بنوایا۔ اس آلہ کو اس زمانے کا ٹینک کہا جاسکتا ہے۔ کچھ مجاہد دبابہ کے اندر بیٹھ کر فصیل کے نیچے پہنچ گئے اور دبابہ سے فصیل کو توڑ دیا۔ اہل شہر نے مجبور ہو کر صلح کی درخواست کی اور شہر پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ یہاں سے بے شمار مال و دولت مسلمانوں کو ملی۔ راڈرک کی بیگم اے جی لونا بھی ہیں مسلمانوں کے ہاتھ لگی۔ موسیٰ بن نصیر نے اسے شاہانہ عزت کے ساتھ رکھا اور اپنے بیٹے عبدالعزیز سے اس کی شادی کر دی۔

اسی دوران معلوم ہوا کہ اہل اشبیلیہ نے بغاوت کر دی ہے۔ اشبیلیہ کے لوگ جو شہر چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ واپس آ کر محافظ اسلامی فوج کے اسی (80) جوانوں کو شہید کر دیا۔ اس بغاوت کی سرکوبی کے لئے موسیٰ نے اپنے بیٹے عبدالعزیز کو روانہ کیا۔ اس نے آتے ہی شہر پر دوبارہ قبضہ کر کے قاتلوں اور باغیوں کو سرِ عام موت کی سزا دی۔ اس طرح سارے اندلس میں مسلمانوں کے جاہ و جلال، رعب اور طاقت کی دھاک بیٹھ گئی اور اہل اندلس نے پھر کبھی ایسی حرکت کی کوشش نہ کی۔

ماہ شوال ۹۴ھ میں موسیٰ بن نصیر ماردہ سے طیطلہ کی طرف روانہ ہوئے۔ طارق بن زیاد نے ان کا بڑی شان و شوکت سے استقبال کیا۔ موسیٰ اور طارق نے طلیطلہ میں اندلس کے باقی علاقوں کو فتح کرنے کے لئے ایک جامع اسکیم بنائی۔ موسیٰ بن نصیر نے تمام فوجی انتظامات مکمل کر کے طارق بن زیاد کو فوج کا سپہ سالار اعظم بنا دیا اور نئی مہموں کے لئے روانہ کرنے سے پہلے موسیٰ بن نصیر نے اسلامی اصول جہاد پر سختی سے کاربند رہنے کے لئے اسلامی سپاہ کو

چند احکامات جاری کیے۔

”ملک کو تاخت و تاراج نہ کیا جائے۔ حملے صرف علاقوں کی فتوحات کے لئے ہوں۔ ان حملوں میں عوام پر ظلم وستم اور لوٹ مار سے باز رہا جائے اور رعایا کے مذہبی جذبات کا پورا پورا احترام کیا جائے جو کوئی ان احکامات کی خلاف ورزی کرے گا اسے موت کی سزا ہوگی۔“

طارق بن زیاد نے نئی مہمات کا آغاز کرتے ہوئے ارغوان کو فتح کیا۔ پھر یہاں سے سرقسطہ روانہ ہوا۔ راستے میں جتنے صوبے آئے ان سب کو فتح کرتا گیا۔ سرقسطہ پہنچا تو شہر کے باشندوں نے صلح کی درخواست کردی۔ اس طرح شمال مشرقی اندلس کا ایک اہم شہر بھی فتح ہوگیا۔ طارق بن زیاد نے اسے یہاں کا دارالحکومت بنا کر آس پاس کے علاقوں کو فتح کے لئے فوجی دستے روانہ کردیئے۔

ان علاقوں میں قبضہ کرنے کے بعد مسلمان شمالی' مشرقی اور مغربی صوبوں کے ان شہروں کی طرف بڑھے جو ابھی فتح نہیں ہوئے تھے۔ ان شہروں کو زیر کرنے میں بھی زیادہ وقت نہ لگا کیونکہ یہاں کے بڑے بڑے شہروں اور صوبوں پر مسلمان پہلے ہی قابض ہو چکے تھے۔

ادھر موسیٰ بن نصیر نے اپنے سپاہیوں کے ساتھ جنوبی فرانس کا رخ کیا۔ انہوں نے یہاں سب سے پہلے نیربونہ Narbonna پر قبضہ کیا۔ اس شہر کو فوجی اڈا بنا کر مزید مجاہدین بلا لئے گئے۔ فرانس کے اس علاقے میں دو دریا رون Rhone اور سون Saone بہتے ہیں۔ مسلمانوں نے ان دریاؤں کے کناروں پر آباد تمام شہروں کو فتح کرلیا۔ یہ فتوحات اس لئے آسان رہیں کہ فرانس بھی داخلی انتشار کا شکار تھا۔ مسلمانوں نے اربونہ سمیت ان شہروں کو اسلامی اندلس کی حدود میں شامل کردیا۔

موسیٰ بن نصیر کی شدید خواہش تھی کہ وہ طارق بن زیاد کے ساتھ مل کر یورپ کے باقی تمام ملکوں کو بھی فتح کریں اور سارے براعظم یورپ میں اسلام کا جھنڈا گاڑیں اپنے اسی فکر عالی کی تکمیل کے لئے انہوں نے فرانس میں قدم رکھا۔ مگر دربارِ خلافت سے انہیں پیغام آ گیا کہ مزید فتوحات روک کر جلد خلیفہ سے ملاقات کریں۔ اس وجہ سے ان کا فتح یورپ کا خواب

شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔ موسیٰ بن نصیر نے بے پناہ مال غنیمت لے کر دارالحکومت دمشق روانہ ہو گئے۔ اپنے بعد انہوں نے حکومت اندلس کی باگ ڈور اپنے بیٹے عبدالعزیز کے سپرد کر دی۔

طارق بن زیاد نے بھی جب مفتوحہ علاقوں کے انتظام وانصرام کو مکمل کرلیا تو وہ بھی دربار خلافت میں چلے گئے۔

اس طرح موسیٰ خلیفہ ولید بن عبدالملک کے دور میں مسلمانوں نے والئی افریقہ موسیٰ بن نصیر کی زیرنگرانی اور طارق بن زیاد کی زیرکمان ظلمت کدۂ یورپ میں پہلی اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ یہ عظیم الشان سلطنت جو خلافت ہسپانیہ کہلاتی ہے۔ موجوداسپین' پرتگال اورفرانس کے جنوبی حصوں پر مشتمل تھی۔

یوسف بن تاشفین رح



یوسف نے جب مغرور و متکبر عیسائی بادشاہ کا توہین آمیز خط سنا تو اسی کے مراسلہ کی پشت پر صرف ایک سطری یہ جواب لکھ کر بھجوایا" جو کچھ ہونے والا ہے اسے تم خود دیکھ لو گے۔"

عالم اسلام کے عظیم جرنیل کی دل آویز داستان

طارق بن زیاد اور موسیٰ بن نصیر نے اندلس فتح کیا۔ اس فتح کے بعد مسلمان ایک عرصہ تک وہاں شان وشوکت سے حکومت کرتے رہے۔ انہوں نے وہاں بڑی شاندار عمارتیں بنوائیں، نئے شہر بسائے، خوبصورت باغات لگوائے، سکول اور کالج قائم کیے۔ غرض ملک کی بہتری کے لیے جو کچھ ہوسکتا تھا کیا۔ یہاں مسلمانوں نے علم وہنر میں اتنی شہرت حاصل کی کہ نہ صرف اسلامی بلکہ یورپ کے ملکوں سے بھی طلباء وہاں پڑھنے آتے تھے۔ یورپ نے وہاں سے بہت کچھ حاصل کیا اور بعد میں انہوں نے جو ترقی کی وہ اندلس کے مسلمانوں ہی کے طفیل کی۔

لیکن ایک عرصہ کے بعد ایسی صورتحال پیدا ہوگئی کہ مسلمانوں میں اتفاق نہ رہا۔ وہ آپس میں لڑنے جھگڑنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اندلس میں کئی حکومتیں قائم ہوگئیں۔ اگر ان علیحدہ حکومتوں کے بادشاہ اپنی اپنی رعایا اور اپنے ملک کی بھلائی میں لگے رہتے تو کوئی بری بات نہ تھی مگر آپس کی خونریز لڑائیوں میں وہ اندرون اور بیرون عوام کی نظروں میں نفرت وحقارت کا نشانہ بن گئے۔ اس وقت یہاں اندلسی مسلمانوں کی جو ریاستیں قائم ہوگئی تھیں ان میں غرناطہ، طلیطلہ اور اشبیلیہ کو بہت اہمیت حاصل تھی لیکن جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ان چھوٹے چھوٹے ملکوں کے حکمران ایک دوسرے کو برباد

کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ ان سب کا مشترکہ دشمن طلیطلہ کا عیسائی بادشاہ الفانسو ششم تھا۔ یہ نہایت چالاک اور عیار بادشاہ تھا۔ اس نے مسلمانوں کی خانہ جنگیوں سے خوب خوب فائدہ اٹھایا اور بڑی قوت حاصل کرلی یہاں تک کہ کئی مسلمان جہاں کہیں بھی آباد تھے قتل ہو رہے تھے۔ مسلمان بادشاہوں میں اتنی توفیق نہ تھی کہ مل کر دشمن کا مقابلہ کرتے مگر ابھی قدرت کو کچھ دنوں اور مسلمانوں کی لاج رکھنا منظور تھی۔ عین اس نازک حالت میں ایک مرد مجاہد اٹھا اور اس نے آگے بڑھ کر مسلمانوں کی گرتی ہوئی ساکھ کو سہارا دیا۔ یہ شخص افریقہ کا بادشاہ یوسف بن تاشفین تھا۔ اس بادشاہ میں بڑی خوبیاں تھیں۔ وہ بڑا پرہیز گار اور نیک تھا اور ساتھ ہی مدبر اور بہادر بھی۔

جب اندلسی مسلمانوں نے دیکھا کہ وہ چاروں طرف سے ایک خوفناک مصیبت میں گھرے ہوئے ہیں تو انہوں نے سوچا کہ یوسف بن تاشفین سے مدد کی درخواست کی جائے۔ اشبیلہ کے بادشاہ معتمد کو بھی ان کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس لیے کہ الفانسو عیسائی بادشاہ تھا جو اس کے ملک اشبیلہ پر بڑے زور کا حملہ کرنے والا تھا چنانچہ اندلسی مسلمانوں کا ایک وفد یوسف بن تاشفین کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وفد میں اندلس کے شہروں کے بڑے بڑے عالم، فقیہہ اور دیگر سیاستدان شامل تھے۔ انہوں نے افریقی رہنما یوسف کے سامنے اندلسی مسلمانوں کی دردناک صورت حال رکھتے ہوئے اس مشکل و مصیبت میں ان سے مدد و نصرت کی اپیل کی۔ بڑی تفصیل کے ساتھ اس وفد نے عیسائیوں کے ہولناک مظالم کی تصویر کشی کی۔ یوسف اندلسی مسلمانوں کی حالت زار سن کر بڑا دکھی اور متاثر ہوا۔ اس نے تلوار پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی کہ وہ اپنے مسلمان اندلسی بھائیوں پر ڈھائے گئے مظالم کا انتقام ضرور لیں گے۔ وفد کے لوگ مطمئن ہو کر خوش خوش اندلس واپس آ گئے۔

بادشاہ یوسف نے تلوار پر ہاتھ رکھ کر جو قسم کھائی تھی اسے پورا کیا۔ سب سے پہلے اس نے جہاد کی عام منادی کرائی اور دیکھتے ہی دیکھتے ملک کے چاروں طرف سے سے ہزاروں مجاہد پایہ تخت میں جمع ہو گئے۔ اس کے پاس صرف سو (100) جہاز تھے۔ ان جہازوں میں جتنی فوج بھیجی جا سکتی تھی۔ وہ جزیرۃ الخضر میں بھیج دی گئی۔ جب یہ جہاز اس فوج کو وہاں

اتار کر خالی واپس آئے تو دوسری بار پانچ ہزار مزید فوج اندلس بھیج دی گئی۔اس طرح افریقی فوج کی کل تعداد سترہ ہزار ہوگئی۔ یوسف جزیرۃ الخضر سے اشبیلیہ کی طرف روانہ ہوا تو ہر جگہ بڑی شان سے اس کی آؤ بھگت ہوئی۔ اشبیلیہ کے دروازے پر معتمد نے اس کا عظیم الشان استقبال کیا۔یوسف شہر سے باہر ٹھہرا کیونکہ اسے علم تھا کہ شہر میں ٹھہرنے سے بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہوں گی۔لوگ یہ سمجھیں گے کہ افریقہ کا بادشاہ ان کے شہر پر قبضہ کئے بیٹھا ہے۔ مصلحت یہی تھی کہ وہ باہر ہی ٹھہرے اور اپنا کام ختم کر کے واپس لوٹ جائے۔ معتمد نے بادشاہ کے اعزاز میں ایک بہت بڑی ضیافت دی اور اس کے سپاہیوں کو بہت سے تحفے تحائف دیئے۔جب ساری فوجیں اکٹھی ہوگئیں تو ان کی تعداد بیس ہزار سے زیادہ نہ تھی۔اس فوج کو لے کر یوسف آگے بڑھا۔ جب عیسائی بادشاہ الفانسو کو یہ اطلاع ملی تو وہ سرقسطہ کے محاصرہ میں مشغول تھا۔اس نے یہ محاصرہ چھوڑا اور اپنی ریاست کے تمام سرداروں کو حکم دیا کہ وہ اپنی اپنی فوج لے کر طلیطلہ میں پہنچ جائیں۔ جب عیسائی فوجیں یہاں پہنچیں تو ان کی کل تعداد ساٹھ ہزار تھی۔ ان میں کئی ہزار فرانسیسی بھی تھے۔ الفانسو زلاقہ کی طرف بڑھا، جہاں یوسف پہلے سے پہنچا ہوا تھا۔ زلاقہ کے میدان میں دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابل آئیں۔سب سے پہلے یوسف نے الفانسو کو پیغام بھیجا کہ وہ مسلمان ہو جائے یا جزیہ دینا منظور کرلے۔ الفانسو نے جواب دیا کہ اندلس کے دوسرے مسلمان بادشاہ مجھے خراج دیتے ہیں اور تم باہر سے اجنبی مجھ سے خراج (جزیہ) طلب کرتے ہو۔ یہ کیسے ممکن ہے۔؟ میرے پاس زبردست فوج ہے جو تمہیں تباہ کردے گی۔یوسف نے جب اس مغرور و متکبر عیسائی بادشاہ کا یہ توہین آمیز جواب سنا تو اسی کے مراسلہ کی پشت پر صرف ایک سطری یہ جواب لکھ کر بھجوایا ''جو کچھ ہونے والا ہے اسے تم خود دیکھ لو گے۔''

اب فریقین کی فوجیں اس قدر قریب تھیں کہ ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑے آمنے سامنے کھڑی تھیں۔ یوسف نے اس نازک موقعہ پر بڑی حکیمانہ چال چلی، یہ کہ اس نے اندلسی فوج آگے رکھی اور اپنی افریقی فوج پیچھے پہاڑیوں میں چھپا کر رکھی۔اب جب دونوں فوجوں

میں مقابلہ شروع ہوا تو یوسف نے اپنی افریقی فوج کو بالکل حرکت نہ دی۔ جب عیسائی افواج اندلسی افواج کو دھکیلتے ہوئے آگے نکل گئیں تو یوسف کی افریقی اپنی فوج نے جو پہاڑوں میں مورچہ بند تھی یکدم عقب سے عیسائیوں پر ہلہ بول دیا۔ یہ اچانک حملہ اور وہ بھی پشت سے تو الفانسو کے سپاہی اس کی تاب نہ لا سکے۔ شام ہونے تک عیسائیوں کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگ اٹھے۔ حالانکہ مقابلہ ایک اور تین کے تناسب سے تھا۔ عیسائی افواج ساٹھ ہزار اور مسلمانوں کی بیس ہزار یعنی تین عیسائی کے مقابلے میں فقط ایک مسلمان۔ الفانسو کی قسمت اچھی تھی کہ رات ہوگئی۔ ورنہ شاید ایک عیسائی بھی زندہ نہ بچتا۔ خود الفانسو بری طرح زخمی ہوا مگر کسی طرح مسلمانوں سے بچ نکلا۔ دوسرے دن صبح کو جب یوسف نے میدان جنگ کو دیکھا تو ہر طرف عیسائیوں کی لاشوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے اور مال غنیمت جگہ جگہ بکھرا پڑا تھا۔ امیر یوسف نے سارا مال معتمد اور اس کے ساتھیوں کے حوالے کر دیا۔ یہ بہت بڑی فتح تھی جو ایک عرصہ بعد مسلمانوں کو عیسائیوں پر حاصل ہوئی۔ اس عظیم الشان فتح نے عیسائیوں کی طاقت کا سارا گھمنڈ توڑ کر رکھ دیا۔ یوسف بن تاشفین عیسائیوں کی بچی کھچی قوت کو بھی ہمیشہ کے لیے کچل دینے کے لیے ان کا دور تک تعاقب کرنا چاہتا تھا کہ اچانک اس کے جواں سال بیٹے کی وفات کی خبر آ گئی جس سے اس نے آگے بڑھنے کا ارادہ ترک کر دیا چنانچہ تین ہزار سپاہی معتمد کے پاس چھوڑ کر اپنے ملک واپس لوٹ گیا۔

اس فتح کا کچھ عرصے تک کافی چرچا رہا۔ مگر اس کے بعد عیسائیوں نے پھر ہاتھ پیر مارنے شروع کر دیئے۔ انہوں نے حصن اللیط کو اپنا مرکز بنایا۔ یہاں سے وہ اردگرد کے علاقوں پر حملے کرتے۔ بستیوں کو لوٹتے اور جلا دیتے۔ مردوں کو بے دریغ قتل اور عورتوں کو یرغمال بنا لیتے۔ مسلمان بادشاہ عیسائیوں کی یہ ظالمانہ حرکتیں دیکھ کر بے بسی کا شکار ہو کر ٹس سے مس نہ ہوتے۔ انہیں عیش وعشرت اور رنگ رلیوں سے فرصت کب تھی۔ اندلسی مسلمانوں نے ایک بار پھر یوسف بن تاشفین کے پاس ایک وفد بھیجا اور اس سے مدد کی درخواست کی۔ امیر یوسف انتہائی درد مند اور مخلص انسان تھا۔ مظلوم اندلسی مسلمانوں پر عیسائیوں کا ظلم دیکھ کر وہ بے چین و بے قرار ہو جاتا۔ البتہ اس نے وفد سے کہا کہ میں تمہاری مدد کو تیار ہوں مگر اپنے بادشاہ سے کہو کہ وہ خود

مجھے بلائے۔ وفد کے اراکین نے ان کی اطلاع بادشاہ تک پہنچائی۔ چنانچہ معتمد خود افریقہ گیا اور امیر یوسف سے مدد کی التجا کی۔ چنانچہ دوسری بار پھر یوسف اندلس پہنچا۔ اشبیلیہ کے باہر پھر اس کا استقبال ہوا۔ تمام دوسرے بادشاہوں کی فوجیں ان کے پاس پہنچیں۔ چنانچہ یوسف ان سب کو ساتھ لے کر حصن اللیط کی طرف بڑھا جہاں عیسائی اس کے آنے کی خبر سن کر قلعہ بند ہوگئے تھے۔ امیر یوسف نے وہاں ان کا محاصرہ کرلیا۔ امیر یوسف کو دن رات ان کی فکر تھی کہ یہ قلعہ فتح ہوجائے مگر دوسری طرف جو بادشاہ مددگار بن کر آئے تھے، ان کی عجیب حالت تھی۔ وہ بدستور رنگ رلیاں منا رہے تھے۔ ان کی محفلوں میں دن رات گانے بجانے اور شراب نوشی کی رنگا رنگی ہوتی۔ شاعر عشقیہ اشعار سے ان کا دل بہلاتے۔ اندلس کے لوگ جب یہ منظر دیکھتے تو ایمانی غیرت کے ہاتھوں بے بس ہوکر دل تھام کر رہ جاتے۔

وہ کھلی آنکھوں یہ تضاد دیکھ رہے تھے۔ کہ ایک طرف ان کے اپنے بادشاہ عیاش و بدکردار ہیں جبکہ دوسری طرف اجنبی مہمان امیر یوسف اوران کی سپاہ پرہیز گار و عبادت گزار ہے۔ انہوں نے امیر یوسف سے درخواست کی کہ وہ اندلس ہی میں رہ جائے۔ یہاں کا بادشاہ بن جائے۔ اس میں ہمارے ملک اندلس کی بھلائی ہے۔ امیر یوسف نے یہ سنا تو عجیب قلبی و ذہنی کشمکش میں دوچار ہوگیا۔ کہ کیا مسلمانوں کی بقا و سلامتی اس کے سوا اور کوئی نہیں؟ امیر یوسف اسی سوچ میں تھا کہ غرناطہ کا قاضی ابوجعفر ان کے پاس آیا اور اسے بتایا کہ غرناطہ کا بادشاہ کتنا ظالم اور عیاش ہے۔ عوام اس سے تنگ اور نجات کے خواہشمند ہیں۔ امیر یوسف پہلے ہی ایسی شکایات سن کر اندلسی مسلمانوں کے گھناؤنے کردار سے نالاں تھا اور سخت پریشان بھی کہ ایسے حالات میں جب الفانسو عیسائی بادشاہ کی سرگرمیاں مسلمانوں کے سخت خلاف ہیں۔ مسلمان بادشاہ ان حالات میں بھی اپنی قوم کے مستقبل سے اس قدر بے فکر و بے نیاز ہیں آخر کیوں؟

بہرحال مجبور ہوکر امیر یوسف نے غرناطہ کے قاضی کی یہ تجویز قبول کرلی کہ غرناطہ جاکر وہاں کی حکومت مستقل طور پر خود سنبھال لے۔ اس کے تھوڑے عرصے بعد امیر یوسف کے پاس اندلس کے مسلمانوں کی طرف سے ایک درخواست پہنچی جس میں لکھا تھا کہ اندلس کے

بادشاہ عیش وعشرت میں غرق ہیں اور خلاف شریعت کام کرتے رہتے ہیں لہٰذا امیر یوسف صرف غرناطہ نہیں پورے ملک کی باگ ڈور سنبھال لیں۔ اسی میں اندلس اور اس کے بادشاہوں کی فلاح ونجات ہے۔ یہ درخواست امیر یوسف نے افریقی علماء ومفتیان کو بھجوادی اوران سے فتویٰ لیا کہ آیا شرعی لحاظ سے وہ ایسا کرسکتے ہیں۔ جواب ''ہاں'' میں آنے پر امیر یوسف نے اپنی فوجوں کے نام یہ فرمان جاری کردیا کہ اندلس کے تمام عیاش بادشاہوں سے اقتدار چھین لیں۔ چنانچہ تھوڑی مدت میں المریہ، طریف اور قرطبہ پر یوسف کا قبضہ ہوگیا۔ پھراشبیلیہ کی باری آئی۔ یادرہے کہ یہاں کے بادشاہ معتمد نے امیر یوسف کا ساتھ دیا تھا۔ لیکن جب یوسف کی فوجیں اس کے خلاف بڑھیں تو اس نے دشمن الفانسو سے مدد مانگ لی۔ لیکن امیر یوسف نے الفانسو اور معتمد کی مشترکہ فوجوں کو شکست فاش دے کر اشبیلیہ پر بھی قبضہ کرلیا۔ اس طرح باری باری اندلس کے تمام دوسرے علاقوں بلکہ تمام ملک پر یوسف بن تاشفین کا مکمل قبضہ ہوگیا۔ ایک عرصہ کے بعد اندلس میں پھر خوشحالی اور فارغ البالی لوٹ آئی۔ زندگی کے ہر شعبے میں ترقی ہونے لگی۔ ظلم اور تشدد کا نام ونشان مٹ گیا۔ عدل وانصاف کی حکمرانی قائم ہوئی۔ فیصلہ قرآن وسنت کی روشنی میں ہونے لگا۔

امیر یوسف نے فوجی مسائل کے علاوہ باقی سارے کام علماء کے سپرد کردیئے۔ بادشاہ اور امراء وزراء کے کردار وعمل کا عکس رعایا پر بھی پڑتا ہے۔ چنانچہ جب اوپر شریعت کی بہاریں رنگ جمانے لگیں تو نیچے عوام الناس بھی اس روحانی فضا میں خود بخود رنگے جانے لگے۔ امیر یوسف بن تاشفین کی سلطنت کا رقبہ اب اتنا ہوگیا تھا۔ جیسا بنی امیہ اور بنو عباس دونوں کی سلطنتوں کا مل کر تھا۔ تمام شمالی افریقہ میں تیونس سے لے کر بحر اطلانٹک تک اس کا سکہ چلنے لگا۔ ہر جمعہ کو کم از کم ملک بھر کی تین لاکھ مساجد میں امیر یوسف کے نام کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔ نہ معلوم کتنے کروڑ مسلمان اس مرد مجاہد کی بقاء وسلامتی کی دعائیں مانگنے لگے۔ تیرہ بادشاہوں نے امیر یوسف کو اپنا شہنشاہ تسلیم کیا۔ رعایا کو اتنا آرام وسکون پہلے کبھی نہ پہنچا تھا۔ اتنی عزت پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ روٹی کی قیمت برائے نام تھی۔ مٹھی بھر ترکاری اور میوے چند

کوڑیوں کے بھاؤ مل جاتے۔ بیشتر صوبوں میں لگان محصول (ٹیکس) بالکل معاف تھا۔

امیر یوسف بن تاشفین نے عمر بھی بڑی لمبی پائی۔ وہ ایک سو سال زندہ رہا۔ ان کی تمام عمر جہاد میں گزری۔ مسلمانوں کی ہر محاذ پر ہر میدان میں بھلائی و بہتری ان کے پیش نظر تھی۔ وہ دوسرے عیاش، شراب نوش اور بدکردار بادشاہوں کی غلط راہوں پر نہیں چلا۔ خود بھی نمازی اور متقی تھا اور اپنی رعایا کو بھی انہی صفات میں رنگ دیا۔ وہ ان کمزوریوں اور بری باتوں میں نہیں پڑا جو مسلمان کو کھوکھلا اور دل کو کمزور کر دیتی ہیں۔ امن وامان اور عدل وانصاف کا یہ عالم کہ کسی چور کے ہاتھ کاٹنے اور کسی مجرم کو موت کی سزا ملنے کی نوبت نہیں آئی۔ اس نے کبھی کوئی ایسا کام نہیں کیا جس سے ان کے نام پر دھبہ لگا ہو۔

فقط ایک صوبے کے گمنام حاکم سے نکال کر یوسف بن تاشفین نے اپنے آپ کو سلطان صلاح الدین ایوبی اور محمود غزنوی جیسے عظیم بادشاہوں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ بلاشبہ یوسف بن تاشفین نے اپنا نام مشاہیر اسلام کی فہرست میں شامل کیا اور اللہ تعالیٰ اپنے متقی بندوں کو اسی طرح عزت سے نوازتے ہیں۔

❀❀❀



سلطان محمود غزنوی رح

سلطان محمود جتنا بڑا فاتح تھا اس سے بڑا علم وفن کا سرپرست تھا۔ اس نے مسلم تہذیب وتمدن کو ہندوستان میں متعارف کروایا۔ اس کا اپنا تخت وسط ایشیاء میں اسلامی تمدن و ثقافت کا گہوارہ تھا

ملت اسلامیہ کے اولوالعزم جرنیل کا ولولہ انگیز تذکرہ

وہ ایک شہزادہ تھا۔

آغاز شباب پر اس نے اپنی سلطنت میں ایک نہایت خوبصورت باغ لگوایا اور اس باغ میں ایک نہایت حسین اور خوبصورت عمارت تعمیر کروائی۔ جب باغ اور عمارت کی تکمیل ہوگئی تو اس نے اپنے والد اور عمائدین کو مدعو کیا۔

جب بادشاہ نے باغ اور عمارت کو دیکھا تو بہت خوش ہوا مگر سب کچھ دیکھ کر بیٹے سے کہا: ''بیٹے باغ اور عمارت اگرچہ بہت ہی خوبصورت اور دلکش ہے، لیکن اس طرح کا باغ اور اس طرح کی عمارت ہر ایک امیر بنا سکتا ہے۔ بادشاہوں کی شان تو اس کی متقاضی ہے کہ ایسی عمارت کی طرح ڈالیں کہ دوسرے اس کی مثل نہ بنا سکیں۔''

بیٹے نے ادب سے پوچھا: وہ کون سی عمارت ہے جس کا آپ ذکر فرما رہے ہیں' بادشاہ نے جواب دیا ''اس عمارت سے مراد اہل علم کے دل ہیں۔ اس عمارت کی زمین میں اگر تم اپنے احسان اور محبت کی تخم ریزی کرو اور بارآور ہو تو اس کے پھل البتہ اس قابل ہوں گے کہ ان کے چکھنے سے تمہیں دین و دنیا کی سعادت کا مزہ ملے گا'' اور پھر اس ہونہار اور سعادت

مند بیٹے نے واقعی باپ کی نصیحت پر عمل کیا اور ایسی سلطنت کی بنیاد رکھی کہ آج اس عہد کا علم وانصاف، سخاوت اور شجاعت و بہادری الف لیلوی داستانیں محسوس ہوتی ہیں۔

یہ ناصح باپ امیر سبکتگین اور سعادت مند بیٹا سلطان محمود غزنوی تھا۔

یمین الدولہ ابوالقاسم سلطان محمود غزنوی 971ء میں پیدا ہوا اور 59 سال کی عمر میں 1030ء کو وفات پائی اور بھارت پر مشتمل تھی۔ اس کے عہد میں غزنی ملک کا پایہ تخت تھا۔ جو تہذیب و تمدن کا ایسا مرکز تھا جو بغداد ثانی مشہور ہوا۔ محمود بچپن ہی سے بہت ذہین و فطین، ہونہار اور بہادر تھا اس کی تربیت مشرقی سلاطین کے شہزادوں کی طرح کی گئی۔ اس وقت کے بڑے بڑے علماء کی خدمات حاصل کی گئیں۔ اس نے بہت جلد دینی علوم کی تکمیل کر لیا ور اس کا شمار حدیث و فقہ کو اچھا خاصا جاننے والوں میں ہونے لگا تکمیل تعلیم کے بعد محمود نو عمر ہونے کے باوجود باپ کے دوش بدوش تھا اور ملکی سیاست کا بڑے غور سے مشاہدہ کر رہا تھا۔ اس وقت پنجاب اور غزنی کی سرحدیں ایک دوسرے سے ملی ہوئی تھیں۔ ہندوستان کے راجہ جے پال کی فوجیں اکثر سرحدوں پر چھیڑ چھاڑ کیا کرتی تھیں۔ سبکتگین ایک امن پسند اور صلح کیش حکمران تھا۔ مگر جے پال کے مسلسل تنگ کرنے پر اس کو جوابی کاروائی کرنا پڑی۔ جب جے پال نے سندھ کی مسلمان حکومتوں کو سازش اور لالچ کے تحت سبکتگین کے خلاف حرکت میں لے آیا تو سبکتگین اس کو سبق سکھانے کے لیے اپنی فوجوں کو ہندوستان کی سرحد پر لے آیا اور سرحد پار کر کے ملتان کے قریب جے پال سے دو دو ہاتھ شروع کر دیے۔

کم سن محمود بھی ایک گھوڑے پر سوار سبکتگین کے شانہ بشانہ سپاہیوں کی رہنمائی کر رہا تھا فوجوں کے آمنے سامنے پہنچ جانے پر اصولی نامہ و پیام ہوا پھر جنگ شروع ہوگئی تیروں کی بارش میں دونوں فوجیں ایک دوسرے سے ٹکرا گئیں اور محمود کی تلوار بھی نیام سے نکل کر بجلی کی طرح کوندنے لگی تین روز کی جنگ میں ہندو لشکر کا صفایا ہو گیا اور مسلمانوں نے اپنے سے کئی گنی طاقت کو صلح کا ہاتھ بڑھانے پر مجبور کر دیا ہندوؤں کا وفد تحفے تحائف لے کر سبکتگین کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس نے ایک مسلمان کی حیثیت سے پیام صلح کو رد نہ کیا دس لاکھ درہم اور پچاس ہاتھی تاوان جنگ قرار پائے جے پال نے اپنے بعض معززین کو بطور ضمانت

مسلمانوں کے حوالے کیا اور غزنویوں کا لشکر لدا پھندا اپنے ملک کی طرف واپس ہوگیا۔ جے پال کی شہرت و غرور پر بھرپور ضرب لگی جس کو وہ ذہنی طور پر برداشت نہ کر سکا اپنے دارالسلطنت میں واپس ہو کر اس نے ایک دربار عظیم منعقد کیا جس میں داہنی طرف برہمنوں اور بائیں طرف ارکان دولت کی نشستیں تھیں اور ہندوستان کے دوسرے حصوں کے نمائندے بھی موجود تھے۔ جے پال نے سبکتگین سے انتقام کے مسئلے کو بھرے دربار میں رکھ دیا اور رائے طلب کی ارکان دولت کا مشورہ تھا کہ عہد توڑنا کسی طرح مناسب نہیں اس کے نتائج خطرناک بھی ہو سکتے ہیں اور بدنام کن بھی لیکن شرائط صلح کو ٹھکرا دیا جائے اور سبکتگین کو لکھ دیا جائے کہ وہ ہمارے آدمیوں کو واپس کر دے تو ہم اس کے آدمیوں کو غزنی بھیج دیں گے جے پال نے برہمنوں سے اتفاق کیا اور ضمانت میں آئے ہوئے مسلمان قید میں ڈال دیے گئے۔ اس کے ساتھ ہی جے پال کے سفیر دہلی، اجمیر، قنوج اور کالنجر پہنچ گئے جہاں کے امدادی لشکر تیزی کے ساتھ پنجاب کی طرف روانہ ہوگئے اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک لاکھ سوار اور بے شمار پیادے افغانستان کی سرحد پر جمع ہوگئے یہ متحدہ ہندوستان کا پہلا اجتماع تھا جو مسلمانوں کے خلاف جمع ہوا تھا امیر سبکتگین کو جے پال سے اس بدعہدی کی امید نہ تھی پھر بھی جیسے ہی اس کو حالات کا علم ہوا وہ ایک مرد غازی کی طرح اٹھ کھڑا ہوا جہاد کا آوازہ سلطنت غزنی کے در و دیوار میں گونجنے لگا اور اسلام کے نام پر ہزاروں رضا کار سبکتگین کے لشکر میں شامل ہوگئے اس طرح وہ لشکر جرار تیار ہوا جس نے کفر کی متحدہ قوت کو پاش پاش کر دیا۔ اس بار سبکتگین کا لشکر بھی پہلے سے بہت زیادہ تھا غزنی سے روانہ ہو کر اس نے سب سے پہلے افغانستان کے مشہور شہر طغان پر حملہ کیا اور بزور شمشیر اس پر قبضہ کر لیا پھر وہ پنجاب کی طرف بڑھا اور دریائے اٹک تک پہنچ گیا جے پال کا ٹڈی دل دریا کے اس پار ٹھہرا ہوا تھا مسلمانوں کی آمد کی خبر پاتے ہی اس نے دریا پار کر لیا اور دریا کو پشت پر لے کر خیمہ زن ہوگیا محمود اب تجربے کار سپاہی بن چکا تھا سن و سال کے اعتبار سے ابھی اس کے کھیلنے کھانے کے دن تھے مگر اس نے اپنے لیے تلواروں کے کھیل کا انتخاب کیا تھا اور چھوٹی سی عمر میں اتنا ماہر ہوگیا تھا کہ بڑے بڑے تجربہ کار اس سے کانپتے تھے جے پال اس بار اتنے بڑے لشکر کو لے کر آیا تھا کہ اس کا شمار و قطار ناممکن تھا امیر

سبکتگین نے اس کا اندازہ کر کے اور اپنی کم تعداد کو چھپانے کے لیے فوج کو پانچ پانچ سو آدمیوں کے گروہوں میں تقسیم کر دیا اور ہر گروہ آگے بڑھ کر داد شجاعت دینے لگا اس طرح ہر تھوڑے وقفے سے دشمن کا تازہ دم سپاہیوں سے مقابلہ ہوا اور جب سبکتگین نے ہندوں کے تھک جانے کا یقین کرلیا تو عام یلغار کا حکم دے دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے جے پال کی فوج میں بھگدڑ مچ گئی خود جے پال بڑی خراب و خستہ حالت میں اپنے دارالسلطنت پہنچ سکا۔ طفان پشاور اور نہر نیلاب کا علاقہ سلطنت غزنی میں شامل کرلیا۔ اس عرصے میں پنجاب کے سفیر پیغام صلح لے کر حاضر ہوئے اور امیر سبکتگین نے ہونہار محمود کی سفارش پر مزید تاوان جنگ لے کر صلح کرلی۔ کہا جاتا ہے کہ سلطان محمود کا مشہور انشاء پرداز ابوالفتح اسی جنگ میں امیر سبکتگین کو ملا تھا لیکن وہ زیادہ دن اطمینان سے گزار نہ پایا تھا کہ سامانی تاجدار نوح بن منصور کا خط موصول ہوا جس میں اس نے سامانی حکومت کے وزیر فائق اور ابوعلی سمجوری کی بغاوت کا حوالہ دیا تھا اور مدد کے معاوضے میں خراسان حکومت پیش کی تھی امیر سبکتگین فوراً غزنی سے روانہ ہوا محمود باپ کے ہم رکاب تھا جب وہ بخارا کے قریب پہنچے تو نوح نے شہر کے باہر اس کا استقبال کیا سبکتگین کی نظر جیسے ہی فوج پر پڑی وہ گھوڑے سے اتر پڑا اور بڑھ کر اس نے نوح کے گھوڑے کی لگام چوم لی نوح بھی اس قدر افزائی کے لیے گھوڑے سے نیچے آ گیا اور اس نے سبکتگین کو آغوش میں لے لیا سبکتگین قدرے توقف سے بلخ کی طرف بڑھا عقب سے نوح بن منصور کی فوج بھی آ گئی ہرات کے مقام پر فائق اور سامانی لشکروں کا مقابلہ ہوا۔ جنگ کی ابتدا میں فائق کی سپاہ نے سامانیوں کو پیچھے ہٹا دیا لیکن سبکتگین اور محمود نے اپنی فوجوں کو لے کر حملہ کیا تو فائق کی فوجوں کے قدم اکھڑ گئے اور اس نے میدان چھوڑ دیا سبکتگین نے محمود کو بھاگنے والوں کے تعاقب میں روانہ کیا جس نے بہت سے لوگوں کو قتل کیا اور مال و اسباب چھین لیا نوح بن منصور امیر سبکتگین اور محمود کی خدمت سے اس قدر خوش ہوا کہ اس نے سبکتگین کو ناصر الدولہ کا خطاب دیا اور امیر الامرائی کا منصب عطا کیا محمود اب بھرپور جوانی کے دور سے گزر رہا تھا اور سبکتگین کی نگاہ میں ہر ذمہ داری کا اہل تھا لہٰذا اس نے محمود کو خراسان کی حکومت پر متعین کر دیا اور خود غزنی واپس آ گیا ان سب کی واپسی کے بعد نیشاپور خالی تھا لہٰذا

فائق اور ابوعلی نے پھر اس پر قبضہ کر لیا محمود نے یہ خبر پہ کران کے مقابلے کے لیے ایک فوج روانہ کی۔ پھر خود بھی آ گیا لیکن اس مرتبہ اس نے فائق سے شکست کھائی۔ امیر سبکتگین کو اطلاع ملی تو وہ غزنی سے روانہ ہوگیا اس عرصے میں محمود نے پھر اپنے لشکر کو ترتیب دیا امیر سبکتگین اور فائق کی فوجوں میں میدان کارزار گرم تھا کہ محمود تازہ دم فوج کے ساتھ جا پہنچا اور دشمن کے قلب پر حملہ کیا۔ فائق اور ابوعلی اس ضرب کی تاب نہ لا سکے اور ان کے پیرا کھڑ گئے اور محمود نے تعاقب میں ان کی قوت کو کچل کر رکھ دیا جس کے بعد وہ کبھی سر نہ اٹھا سکے۔ فائق اور ابوعلی سے فارغ ہوا محمود خراسان کی طرف روانہ ہوگیا اور امیر سبکتگین غزنی آ گیا 387 ہجری میں اس کا انتقال ہوگیا وہ اپنے بعد غزنی کی حکومت اور تین بیٹے اسماعیل، نصر اور محمود چھوڑ گیا ان کے علاوہ سب سے اہم چیز جو سبکتگین اپنی اولاد کو ترکے میں دی تھی وہ ہندوستان کا راستہ تھا۔

رقبے کے اعتبار سے ہندوستان ایک بہت بڑا خطہ تھا اور یہاں کے ہندو حکمرانوں نے صدیوں سے ایسے سینکڑوں قلعے تعمیر کر رکھے تھے جو بظاہر ناقابل تسخیر تھے۔ سلطان محمود غزنوی نے شمالی اور وسطی ہندوستان کے تقریباً تمام قلعوں کو فتح کیا۔ اگرچہ اس نے یہاں کوئی مستقل اسلامی حکومت قائم کرنے کی کوشش نہ کی تاہم اس کے پے در پے حملوں نے ہندو حکمرانوں کی کمر توڑ دی اور بعد میں آنے والے مسلم حملہ آوروں کا راستہ ایک حد تک صاف کر دیا۔

سلطان محمود غزنوی ایک غلام کا بیٹا تھا لیکن اس جیسی شخصیات بہت کم پیدا ہوئیں۔ اس نے جب ملک کی باگ ڈور سنبھالی تو پہلے اپنی ریاست کے اندرونی استحکام میں دو تین سال صرف کیے اور بغداد کے عباسی خلیفہ سے حکمرانی کے استحقاق کا پروانہ حاصل کیا۔

صوبہ پنجاب پر اس وقت ایک طاقتور ہندو راجہ جے پال کی حکومت تھی۔ محمود غزنوی نے جب پنجاب پر لشکر کشی کی تو اس کی فوج میں 15 ہزار گھڑسوار تھے۔ جے پال کی کمانڈ میں 12 ہزار گھڑسوار، 32 ہزار انفنٹری اور 300 ہاتھی تھے۔ گھمسان کا رن پڑا اور جے پال کے 1500 سپاہی مارے گئے۔ جے پال گرفتار ہوا لیکن محمود غزنوی نے اسے چھوڑ دیا تاہم اس نے شکست کی بدنامی کی وجہ سے خودکشی کر لی۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا آنند

پال پنجاب کا راجہ بنا۔ آنند پال نے سارے شمالی ہندوستان کے راجوں، مہاراجوں سے مذہب اور ہندوستانی غیرت کے نام پر مدد کی اپیل کی۔ چنانچہ بہت کم عرصے میں ایک بہت بڑا لشکر جمع ہوگیا۔

ہندوستان کو بچانے کے لیے ہندو دیویوں نے اپنے زیورات اور ہیرے جواہرات بھیجے تاکہ ان کو بیچ کر دیس کا دفاع مضبوط کیا جائے۔ محمود غزنوی کی فوج کے ساتھ آنند پال کا سامنا تقریباً اسی جگہ ہوا جہاں اس کے باپ کے ساتھ ہوا تھا۔ سلطان اس انتظار میں تھا کہ پہل آنند پال کی طرف سے ہو چنانچہ یہی ہوا۔ دو ماہ کی بے عملی اور تعطل سے مجبور ہوکر ہندو فوج نے 1000ء میں حملہ کر دیا۔ بہت شدید لڑائی ہوئی۔ میدان محمود کے ہاتھ رہا۔ اس عظیم فتح نے محمود غزنوی کے لیے ہندوستان کے دروازے کھول دیئے۔ اس نے ہر سال ہندوستان پر چڑھائی کی اور بڑے بڑے قلعوں اور ریاستوں کو روند ڈالا۔

آخری بڑا حملہ غزنوی نے 1024ء کو سومنات پر کیا۔ سومنات کا قلعہ نہایت مضبوط اور مستحکم تھا۔ اس کے تین طرف دریا اور ایک جانب گہری خندق تھی۔ بظاہر اس کا فتح کرنا بڑا دشوار تھا۔ اس کے اطراف میں راجپوتوں کی ستائیس ریاستیں تھیں۔ جو سب کی سب سومنات کی محافظ تھیں۔ محمود غزنوی کی افواج ملتان کے راستے سومنات پر حملہ آور ہوئیں۔ وہ اپنے لشکر میں تیس ہزار مجاہد، بیس ہزار بار بردار اونٹوں کا اضافہ کر کے غزنی سے نکلا اور پندرہ رمضان کو ملتان پہنچ گیا۔ وہ گرم وخشک میدانوں کو روندتا ہوا اجمیر پہنچا اور وہاں چند دن قیام کرنے کے بعد آگے روانہ ہوگیا۔

راستے میں اس نے کئی قلعے فتح کیے اور گھومتا ہوا سومنات پہنچ گیا۔ یہ ساحل کاٹھیاواڑ پر ایک بہت بارونق اور مقدس مقام تھا۔ شہر کے وسط میں ایک عظیم الشان مندر تھا۔ جس کی چوٹیاں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں اور دریا کا پانی اس کی دیواروں سے ٹکرا رہا تھا۔ اسلامی لشکر کے قریب پہنچتے ہی ہزاروں پجاری فصیل پر آ کھڑے ہوئے اور پکار پکار کر کہنے لگے۔

''ہمارا معبود تمہیں اس لیے یہاں لایا ہے کہ سب کو ایک دم ہلاک کر دے تم نے جس طرح ہندوستان کے بتوں کے سر اور پاؤں توڑے ہیں اسی طرح تمہارے سر

اور پاؤں توڑے جائیں گے۔''

سلطان نے ان کی طعن و تشنیع کا کوئی خیال نہ کیا اور فوجوں کو پڑاؤ ڈالنے کا حکم دے دیا۔

دوسرے دن صبح ہوتے ہی لشکر اسلام نے تیرو کمان سنبھالے اور فصیل کے محافظوں پر تیروں کی بارش شروع کر دی۔ ہندو سپاہیوں کی ایک بڑی تعداد زخمی ہوئی تو انہوں نے فصیل خالی کر دی اور سومنات کے بت کے سامنے جا کر گر گئے۔ گڑ گڑا کر دعا کرنے لگے اور رو رو کر مدد مانگنے لگے۔

ادھر مسلمانوں نے فصیل خالی پائی تو سیڑھیاں لگا کر چڑھ گئے اور مندر کے در و دیوار اللہ اکبر کے فلک شگاف نعروں سے گونج اٹھے۔ اس پر ہندو سپاہیوں کو غیرت آئی اور وہ تلواریں سونت کر مقابلے پر آ گئے۔ شام تک دست بدست جنگ ہوتی رہی اور اندھیرا ہونے پر فریقین اپنے اپنے مقام پر واپس آ گئے۔

تیسرے روز مسلمانوں نے پوری قوت سے حملہ کیا مگر اطراف کے راجاؤں کی فوجوں نے ان کو آگے نہ بڑھنے دیا۔ بڑا سخت معرکہ ہوا۔ لیکن جنگ کا فیصلہ نہ ہو سکا اور شام ہو گئی۔ اب ہندوؤں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی۔ چوتھے روز انہوں نے قلعے سے نکل کر اسلامی لشکر پر حملہ کر دیا اور مسلمانوں کو گھیرے میں لینے کی کوشش کی لیکن سلطان محمود غزنوی کی جنگی تدبیروں سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔

جنگ اپنے شباب پر تھی۔ ہندو سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھے۔ پجاری اشلوک اور منتر پڑھ پڑھ کر ان کو للکار رہے تھے۔ ایک دم انہوں نے متحد ہو کر مسلمانوں پر اتنا شدید حملہ کیا کہ مسلمانوں کے قدم ڈگمگا گئے۔ سلطان نے اس کے جواب میں فوج کے ایک حصے کو علیحدہ کر کے ان کے مقابل کر دیا اور دو طرفہ جنگ شروع ہو گئی۔

اسی اثنا میں بھیم دیو راجہ اپنی تازہ دم فوج کے ساتھ آن پہنچا اور ہندوؤں کا غلبہ بڑھ گیا۔ سلطان نے دیکھا کہ ہندوؤں کی فوج میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے جبکہ اس کا اللہ کے سوا کوئی مددگار نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے ایک دھواں دار تقریر کی۔ اس کے الفاظ نے لشکر کی رگوں میں جذبہ جہاد دوڑا دیا اور چند لمحات پہلے جو مجاہد مدافعانہ جنگ لڑ رہے تھے وہ شیروں کی طرح

بھپر کر جھپٹ پڑے اور پلک جھپکتے ہی انہوں نے لاشوں کے انبار لگا دیئے۔

بھیم دیو کے لشکر کے پانچ چھ ہزار سپاہی ایک ہلے میں زمین پر گر کر تڑپنے لگے اور اسلام کے شیروں نے دوسری بار پھر حملہ مزید شدید کر دیا تو دشمن کو ٹھہرنا دشوار ہو گیا۔ بھیم دیو نے سنبھلنے کی بہت کوشش کی لیکن اکھڑے ہوئے قدم جم نہ سکے اور بھیم دیو سپاہیوں کو بھاگتے دیکھ کر خود بھی بھاگ کھڑا ہوا۔ ہندو لشکر جو قلعے کو بچانے کے لیے لڑ رہا تھا۔ راجاؤں کا یہ حال دیکھ کر گھبرا گیا اور دریا کی طرف کے دروازوں سے نکل کے بھاگنے لگا۔ مسلمانوں نے اس کا تعاقب کیا اور ان کی کثیر تعداد کو دریا برد کر دیا۔

مکمل فتح کے بعد سلطان سواروں کی ایک جماعت لے کر قلعے میں داخل ہوا۔ عمارت کو دیکھتا بھالتا وہ اس حصے میں پہنچا جس کی چھت چھپن مرصع ستونوں سے بنی ہوئی تھی اور جس کے بیچ سومنات کا بت نصب تھا۔ سلطان محمود نے پتھر کے پانچ گز لمبے اس مجسمے کو توڑنا چاہا تو پجاریوں نے ہاتھ باندھ کر استدعا کی کہ وہ اس کو نہ توڑے اور اس کے بدلے ہم سے ایک کثیر رقم زر و جواہر کی صورت میں وصول کر لے لیکن سلطان کی غیرت ایمانی نے یہ گوارا نہ کیا اور یہ کہہ کر ''میں محمود بت فروش نہیں، بت شکن کہلانا پسند کرتا ہوں۔'' گرز کی ضرب لگائی اور بت کو پاش پاش کر دیا۔

سومنات کی شکست کے بعد چونکہ ہندوؤں کے مذہبی جذبات کو سخت صدمہ پہنچا تھا۔ اس لیے سلطان کو واپسی پر جب وہ غزنی کی طرف لوٹ رہا تھا راجاؤں اور سرداروں نے ہارے ہوئے جواری کی طرح راستے میں چھیڑ چھاڑ اور پریشان کرنے کی کوشش کی مگر پھر منہ کی کھائی۔ مختصراً یہ کہ 417ھ، 1026ء میں گجرات کی فتح کو مکمل کرنے کے بعد اسی سال ملتان کے ڈاکوؤں اور قزاقوں کی سرکوبی کی۔ پھر اسے آخری معرکہ سندھ کے جاٹوں سے پیش آیا جو اس کے غزنی مال غنیمت لے جاتے ہوئے راستے میں مزاحم ہوئے۔ سلطان محمود نے جاٹوں کو سزا دینے کے لیے دریائے سندھ کے ساحل پر چند کشتیوں کا ایک بیڑا تیار کرایا۔ جس میں ایک طرف تو بحری راستے سے تیر اندازوں کو بھیج دیا اور دوسری طرف سے دریا کے دونوں کناروں کے ساتھ بھی سپاہ روانہ کر دی۔ جاٹ سلطان کا مقابلہ کرنے کے لیے چار ہزار جنگی

کشتیوں میں سوار ہو کر چل دیئے۔ دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا، جس کے نتیجے میں جاٹوں کا بحری لشکر حملے کی تاب نہ لاتے ہوئے بھاگ کھڑا ہوا۔ جب کہ خشکی کے راستے سے آتی ہوئی اسلامی فوج نے بہت سے سپاہیوں کو پکڑ کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس کے بعد سلطان بخیر وخوبی غزنی واپس پہنچ گیا۔

سندھ کے جاٹوں کی سرکوبی کے دوران ہی سلطان بیمار ہو گیا تھا۔ ہر چند کہ اس نے کمال استقامت اور شجاعت سے کام لیتے ہوئے بیماری کا حال ظاہر نہیں ہونے دیا۔ تاہم مرض غزنی پہنچ کر پہلے سے بڑھ گیا۔ بہت علاج معالجہ کرایا گیا لیکن افاقہ نہ ہوا۔ آخر کار چار برس تک موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد 421 ھ، 2030ء میں سلطان اللہ کو پیارا ہو گیا۔

سلطان کی ہمت ومردانگی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ وہ باوجود شدید بیماری کے اپنے تمام فرائض منصبی پورے طور پر انجام دیتا رہا اور دم واپسی تک ایک لمحہ بھی اپنے فرائض سے غافل نہیں ہوا۔

سلطان محمود غزنوی کے ہندوستان پر سترہ حملوں کی تفصیلات اتنی سحر انگیز ہیں کہ بڑے بڑے سپہ سالاروں نے ان سے پیشہ ورانہ فیض حاصل کیا اور اس عظیم مسلم سپہ سالار کو دل کھول کر خراج عقیدت پیش کیا۔

بعض متعصب مورخوں نے محمود غزنوی کو محض لٹیرا اور ڈاکو لکھا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ صرف لوٹ مار کے لیے ہندوستان پر حملے کرتا رہا اور یہاں کوئی مستقل سلطنت قائم نہیں کی۔ محمود غزنوی کے معترضین میں زیادہ تعداد فرنگی مورخین کی ہے۔ یہ لوگ اپنے بحری ڈاکوؤں اور لٹیروں کو تو عظیم کمانڈر اور امیر البحر کہتے نہیں تھکتے لیکن اسلام کا کوئی فرزند اگر تاریخ ساز کارنامے سرانجام دیتا نظر آئے تو اس کے کردار پر کیچڑ اچھالنے میں پیش پیش نظر آتے ہیں۔

سلطان کی عسکری ضروریات میں اقتصادی پہلو ایک نمایاں عنصر تھا۔ تاریخ کے ہر دور میں ہر جگہ یہ عنصر نمایاں رہا ہے اور آج بھی ہے۔ ہندو عورتوں نے اپنے زیورات اپنے سورماؤں کو پیش کر دیئے تھے کہ یہ لے لو اور محمود کے فوجیوں کو ادھر نہ آنے دو۔ مالی خوشحالی

بعد میں آتی ہے پہلے میدان کارزار میں مشکلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اسلام نے مشکلوں اور مصائب سے پراس عظیم رستے جہاد فی سبیل اللہ کے نتیجے میں اقتصادی اور معاشی بہتری کی نوید دی ہے اور ایک مومن کا بہترین رزق مال غنیمت کو قرار دیا ہے۔ حتیٰ کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''میرا رزق میرے نیزے کی انی کے نیچے رکھا گیا ہے۔'' اور یہی مال غنیمت، یہی رز ق سلطان محمود غزنوی مشکلوں اور مصائب سے بھرپور راستوں پر چل کر اپنے نیزے، تیر و تلوار کے ذزور پر حاصل کر رہا تھا۔

محمود غزنوی کی گھڑ سوار فوج وسط ایشیا کی پہلی فوج تھی جس نے صدہا برس تک چاروانگ عالم میں اپنی مہارت کا لوہا منوایا۔ اس کی فوج میں انفنٹری (پیدل فوج) کا ایک دستہ بھی نہ تھا۔ ساری کی ساری فوج گھڑ سوار تھی۔ اس حددرجہ موبائل فورس کا مقابلہ جب ہندوستانی راجاؤں کی انفنٹری، کیولری اور فیل سوار فوج سے ہوا تو اس کی کیولری کی چابک دستی اور دلاوری کے سامنے ہندو راجاؤں نے ہتھیار ڈال دیئے۔

سلطان محمود کی کیولری اس ترک کیولری کی بہترین مثال تھی۔ جس نے ایشیائے کوچک سے اٹھ کر مصر، یورپ اور مشرقی ایشیا کو روند ڈالا تھا۔ یہی وہ کیولری تدبیرات تھیں جن کو دوسو سال بعد چنگیز خان اور ہلاکو خان نے اپنا کر پوری دنیا کو دہشت زدہ کر دیا تھا۔ سلطان محمود نے جنگ وجدل میں جن عسکری روایات کو فروغ دیا ان میں ایک جلالی حسن تھا جبکہ چنگیز خان کی عسکری روایات میں محض قہاری، سفاکی اور دہشت ناکی نمایاں تھی۔

سلطان محمود غزنوی کی کیولری فورس میں نیزہ، تیر کمان اور ڈھال تلوار ایسے ہتھیار تھے جو بہت عام تھے اور جن کا استعمال بھی بہت عام ہوتا تھا۔ سلطان ہر سال واپس غزنی جا کر ان ہتھیاروں کی فراہمی کا خیال رکھتا تھا۔ البیرونی نے سلطانی لشکر کے جاہ وجلال کا جو تذکرہ کیا ہے اس میں اس بات کا بطور خاص ذکر کیا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ترکوں کی تلواریں، ہندی تلواروں سے زیادہ کاٹ دار اور ڈھالیں ہندی ڈھالوں سے زیادہ مضبوط لیکن ہلکی ہوتی تھیں۔ تیر کمان کے استعمال پر جو مہارت سلطان کے گھڑ سوار تیر اندازوں کو تھی وہ محتاج بیان نہیں۔ متحرک اہداف کو نشانہ بنانا اور وہ بھی گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر بیٹھ کر اور قریباً ⑩⑤ میل فی

گھنٹہ کی رفتار سے تیز دوڑتے گھوڑے سے، ایک ایسا کمال فن تھا جو اس کے شہسواروں سے خاص تھا۔ سلطان محمود کے جذبہ جہاد کے بعد یہی تیزی، تندہی، سبک دستی اور دلاوری تھی جس نے اتنے بڑے برصغیر کی اتنی بڑی فوج کو سالہا سال انگشت بدنداں رکھا۔

سلطان محمود غزنوی پسندیدہ طورطریقوں کا مالک تھا۔ سپاہی ہونے کے باوجود طبیعت میں نفاست تھی۔ خود اطاعت شعار تھا اور ماتحتوں سے بھی اس کی توقع رکھتا تھا۔ اس کی زندگی سپاہیانہ اوصاف کی حامل تھی۔ اس کے عدل وانصاف کے کتنے ہی واقعے مشہور ہیں۔ مذہب سے سلطان کو خاص لگاؤ تھا۔ وہ قرآن کا شیدائی اور سنت نبوی کا پیرو کار تھا۔ ہر فتح کے بعد سلطان پہلا کام یہ کرتا تھا کہ تبلیغ کے ذرائع پیدا کرتا، مبلغ مقرر کرتا اور مسجدیں تعمیر کراتا۔ سلطان محمود میں غیرت وحمیت درجہ کمال پر پہنچی ہوئی تھی۔ ہندوستان کی بعض جنگیں اسی کا نتیجہ تھیں۔ بعض جنگوں میں اسے کوئی مال غنیمت نہ ملا کیونکہ اس نے اطاعت قبول کر لینے والوں کو معاف کر دیا۔ اس کی حمیت نے یہ گوارا نہ کیا کہ معافی طلب کرنے والوں کو سزا دے۔

سلطان محمود کے کردار کو صرف میدان جنگ میں ہی نمایاں حیثیت حاصل نہیں بلکہ علم وادب کی محفلوں میں بھی وہ ایک امتیاز رکھتا تھا۔ اس کا دربار اپنے دور کے یکتا لوگوں سے بھرا رہتا تھا اور اس نے ہر ہنر کا کامل غزنی میں جمع کر لیا تھا۔ سلطان محمود جتنا بڑا فاتح تھا اس سے بڑا علم وفن کا سرپرست تھا۔ اس نے مسلم تہذیب وتمدن کو ہندوستان میں متعارف کروایا۔ اس کا اپنا تخت وسط ایشیاء میں اسلامی تمدن وثقافت کا گہوارہ تھا۔

❀❀❀



عماد الدین زنگی رح

"ملک ایک باغ کی طرح ہے جب تک باغبان اس کی آب پاشی اور حفاظت میں سرگرم رہے گا وہ سرسبز و شاداب رہے گا' جونہی اس نے غفلت کی سارا باغ اجڑ کررہ جائے گا"

بیت المقدس کی آزادی کی بنیاد رکھنے والے عظیم سپہ سالار

"ہمیں اب الرہا پر حملہ کر دینا چاہیے۔"

حکمران نے اپنے ماتحتوں سے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

اس طویل قامت حکمران کا رنگ گندمی مائل سرخ تھا، آنکھیں بڑی بڑی تھیں اور اس کا چہرہ پاکیزگی اور وجاہت کی منہ بولتی تصویر تھا۔ وہ اپنیما تحتوں کو اپنے فیصلے سے مطلع کر رہا تھا کہ ہمیں اب الرہا پر حملہ آور ہو جانا چاہیے۔

الرہا...... جسے صلیبی ایڈیسہ کے نام سے پکارتے تھے۔ یہ شہر کبھی دیار بکر (موجودہ ترکی) کے نواحی علاقے میں ایک نیم خودمختار عیسائی ریاست میں شامل تھا لیکن اب صلیبی اس پر قابض ہوکر یہاں پہلی صلیبی ریاست قائم کر چکے تھے۔ عیسائی اسے پانچواں مقدس شہر مانتے تھے۔ ان کے دیگر مقدس شہر یروشلم (بیت المقدس) انطاکیہ، روم اور قسطنطنیہ تھے۔ صلیبیوں نے یہاں زبردست فوج قائم کر رکھی تھی اور وہ موصل، دیار بکر اور بغداد وغیرہ کے لیے مستقل خطرہ بنے ہوئے تھے۔ دریائے فرات کے کنارے واقع یہ شہر مضبوط فصیلوں سے گھرا ہوا تھا۔

یہ 539ھ 1144ء کا ذکر ہے اب سے کچھ عرصہ قبل صلیبی مسلمانوں سے ان کا قبلہ

اول بیت المقدس چھین چکے تھے اور اس صدمہ سے ہر مسلمان کا دل تڑپ رہا تھا۔

حکمران نے فوج کو تیار ہونے کا حکم دیا۔ فوج کے تمام سپاہی بڑی پھرتی کے ساتھ سامان جنگ سے لیس ہو کر صف بستہ ہو گئے۔ وہ اپنے سالار کے حکم کے منتظر تھے۔ تازہ دم سدھے ہوئے گھوڑے تیار کھڑے تھے۔ منجنیقیں اور دیگر اسلحہ اکٹھا کیا جا چکا تھا، مستعد سپاہی اسلامی پرچم اٹھائے چاق و چوبند کھڑے تھے اور کوئی دم میں لشکر اسلام روانہ ہوا چاہتا تھا۔

سالار نے اشارہ کیا اور نعرۂ تکبیر کی گونج میں اسلامی فوج الرہا کی طرف روانہ ہو گئی۔ ادھر الرہا (ایڈیسہ) پر حکمران عیسائیوں کے رہنما، جوسلن ثانی کو خبر مل گئی کہ اسلامی فوج آ رہی ہے، اس کا چہرہ پریشانیوں اور تفکرات کی آماجگاہ بن گیا۔ اس نے فوج کے سالار کو بلا کر جلدی جلدی کچھ ہدایات دیں۔ تھوڑی دیر بعد جوسلن ثانی اپنے چند وفادار ساتھیوں سمیت فرار ہو کر کسی محفوظ مقام کا رخ کر رہا تھا۔

اسلامی لشکر جلد ہی الرہا کی فصیلوں تک آ پہنچا۔ شہر کا محاصرہ کر لیا گیا اور مکمل ناکہ بندی کر دی گئی۔ اسلامی فوج کے سالار نے کہا ''شہر کے حکام کو پیغام بھیج دیا جائے کہ اگر وہ ہتھیار ڈال دیں گے تو انہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔'' پیغام بھجوا دیا گیا لیکن کچھ دیر بعد ہر کارے، عیسائی حکام کا جوابی پیغام لا رہے تھے جس میں اسلامی لشکر کی پیشکش کو ٹھکرا دیا گیا تھا۔

اب جنگ کرنے میں کوئی چیز مانع نہ تھی۔ اسلامی فوج کی منجنیقیں حرکت میں آ گئیں۔ شہر پر حملوں کا آغاز ہو گیا۔ شہر میں اسلحہ اور خوراک کا وافر ذخیرہ موجود تھا۔ چنانچہ شہر والے قلعہ بند ہو کر 28 دن مقابلہ کرتے رہے۔ لیکن 29 ویں دن قلعہ میں محصور عیسائی پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ اسلامی فوج شہر کی فصیلیں توڑ کر شہر میں داخل ہو رہی ہے۔

الرہا فتح ہو چکا تھا۔ وہی صلیبی جنہوں نے کچھ عرصہ قبل بے گناہ مسلمانوں کے خون سے ہاتھ رنگے تھے، عورتوں کو ان کے سہاگ سے محروم کیا تھا، معصوم بچوں کے سروں سے والدین کا سایہ چھین لیا تھا، اب مسلمان فوج کے رحم و کرم پر تھے۔ اسلامی لشکر کے سپاہی غم و غصہ سے بے چین تھے۔ ان کی آنکھوں میں صلیبی سپاہیوں کے لیے رحم کی کوئی علامت نہ تھی۔ لیکن یہ اسلامی لشکر تھا جس کا ایک ایک سپاہی اپنے افسر اعلیٰ کے حکم کا پابند تھا اور وہ منتظر تھا کہ دیکھیں

سالار صلیبیوں کے بارے میں کیا فیصلہ کرتے ہیں۔

سپہ سالار نے اپنی بڑی بڑی ملیح آنکھیں اٹھائیں۔ ان کے خوبصورت چہرے پر سکون تھا۔ انہوں نے حکم دیا ''جو لوگ ہتھیار پھینک دیں، انہیں کچھ نہ کہا جائے اور جن لوگوں کو قیدی بنایا گیا ہے انہیں رہا کر دیا جائے۔''

یہ اس مسلمان حکمران کا اعلیٰ ظرف تھا اور مثالی رحم دلی کیونکہ وہ اس نبی کریم ﷺ کی امت میں سے تھے۔ جس نے 13 سال تک مکہ مکرمہ میں مسلمانوں پر ظلم ڈھانے والوں کو فتح مکہ کے روز معاف کر دیا تھا۔

الرہا کی فتح کوئی معمولی واقعہ نہ تھی اس کی خبر فوراً ہی پوری دنیا میں پھیل گئی اور تمام مسیحی ممالک میں صف ماتم بچھ گئی۔ مشہور مؤرخ علامہ ابن الاثیر کے الفاظ میں ''ایڈیسہ (الرہا) کی فتح، فتح الفتوح (فتح مبین) تھی۔'' ادھر پورے عالم اسلام میں خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔ شعراء مبارکباد کی نظمیں کہہ رہے تھے۔ علماء و مشائخ الرہا کے فاتح کو محافظ اسلام اور مجاہد اسلام کبیر کے خطاب دے رہے تھے۔ خلیفہ بغداد مقتفی الامر اللہ بھی اس فتح سے بے حد خوش تھے۔ انہوں نے حکم دیا کہ الرہا کے فاتح کا نام خطبوں میں شامل کیا جائے۔

اپنے بھرپور جذبہ ایمانی، مثالی غیرت اور بے پناہ جرات سے کام لیتے ہوئے صلیبیوں کے خلاف جہاد کا آغاز کرنے والے یہ اولین حکمران تھے۔ عماد الدین زنگی جنہیں بجا طور پر ملت اسلامیہ کا محسن قرار دیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے نہ صرف مسلمانوں کو صلیبیوں کی زبردست طاقت کے خلاف متحد اور منظم کیا بلکہ اپنے زیر انتظام علاقے میں اسلامی شریعت نافذ کر کے اسے ایک مثالی اسلامی ریاست بنا دیا۔

عماد الدین زنگی نے جب اس جہان میں اپنی زندگی کا پہلا سانس لیا تو اس وقت عالم اسلام کے بڑے حصے پر سلجوقیوں کی حکمرانی تھی۔ سلجوقی خاندان کے ایک بہت نامور حکمران سلطان ملک شاہ سلجوقی اس زمانے میں حکومت کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے تھے۔ ان کے دور میں مغرب میں شام، جنوب میں یمن اور عمان اور مشرق میں چین تک اسلامی مملکت کی حدود پھیل چکی تھی۔

قاسم الدولہ آقسنقر بن عبداللہ، سلطان ملک شاہ سلجوقی کے معزز مصاحب تھے۔ آقسنقر، ترکی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی ''سفید باز'' کے ہیں۔

سلطان اپنے قابل وزیر نظام الملک طوسی کی رائے کا بڑا احترام کرتے تھے۔ طوسی کے مشورے پر سلطان نے آقسنقر کو 447ھ میں حلب اور حماۃ کا گورنر مقرر کیا (یہ دونوں علاقے اب شام میں شامل ہیں) اسی سال آقسنقر کو اللہ نے ایک بیٹے سے نوازا۔ آقسنقر نے اپنے بیٹے کا نام عماد الدین رکھا۔ عماالدین آقسنقر کی اکلوتی اولاد تھے۔

485ھ (1092ء) میں ملک شاہ سلجوقی کی حیات مستعار کے دن پورے ہو گئے۔ ان کے بیٹے رکن الدین ابوالمظفر برکیاروق نے شوال 487ھ میں سلجوقی سلطنت کی زمام کار سنبھالی۔

یہ وہ دور تھا جب یورپ میں بیداری کی لہریں کروٹیں لے رہی تھیں۔ اس وقت عیسائیوں کی حکومت صرف براعظم یورپ تک محدود تھی لیکن سلطان ملک شاہ سلجوقی کے انتقال کے بعد عیسائیوں نے بیت المقدس، فلسطین اور دیگر علاقوں کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا۔ اسی دور میں فرانس کا ایک راہب پیٹر دی ہرمٹ اٹھا۔ اس نے ملک ملک گھوم کر اپنی شعلہ بیانی سے مسیحیوں کے دلوں میں آگ بھڑکا دی۔

نومبر 1095ء میں فرانس کے شہر کلیر ماؤنٹ میں پوپ اربن ثانی نے مسیحیوں کا بہت بڑا اجتماع بلایا۔ اجتماع میں عیسائی راہبوں، پادریوں اور عام لوگوں نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ اس اجتماع میں پوپ نے فتویٰ دیا کہ ''بیت المقدس کو کافروں کے قبضہ سے آزاد کروانے کے لیے، خداوند یسوع مسیح کے ہر پیرو کا اولین فرض ہے کہ وہ اپنی جان کی بازی لگا دے۔''

بیت المقدس اور فلسطین پر قبضہ کرنے کے لیے عیسائیوں نے جو جنگیں لڑیں وہ صلیبی جنگیں کہلاتی ہیں کیونکہ کلیر ماؤنٹ کے اجتماع میں پوپ اربن ثانی نے لوگوں کو ایک صلیب دکھا کر کہا تھا ''خداوند یسوع مسیح خود اپنی قبر سے یہ صلیب تمہارے سینوں پر آویزاں کرنے کے لیے نکلا ہے۔ یہی تمہاری نجات کا نشان ہے اور یہی تمہاری فتح کی ضامن ہے۔''

صلیبی جنگوں کی کل تعداد آٹھ ہے اور ان کا عرصہ 1096ء سے 1271ء تک محیط ہے۔ ان میں سے پہلی تین جنگیں مشہور ہیں۔ اگست 1096ء میں صلیبیوں کا پہلا لشکر بیت المقدس کی سمت روانہ ہوا۔ جون 1099ء میں صلیبی مسلمانوں کے قبلہ اول بیت المقدس پر قابض ہو چکے تھے اور کچھ ہی عرصہ بعد ان کی حکومت بالائی الجزیرہ میں ماردین سے لے کر مصر کی سرحد العریش تک پھیل چکی تھی۔

ارض مقدس میں عیسائیوں کی چار ریاستیں وجود میں آ چکی تھیں جن کے صدر مقامات بیت المقدس، الرہا، انطاکیہ اور طرابلس تھے۔

یہ دور مسلمانوں کے لیے بڑا کٹھن اور کرب انگیز تھا وہ اپنی نظروں کے سامنے صلیبیوں کو بیت المقدس پر قابض ہوتے اور مسجد اقصیٰ میں خون کی ندیاں بہاتے دیکھ چکے تھے۔ فی الحقیقت مسلمان بڑی بے بسی سے دو چار تھے۔

مسلمانوں کی اپنے رب سے دعائیں قبول ہوئیں اور ظلم وستم کی اس سیاہ رات میں بالآخر امید کی ایک کرن چمک اٹھی اور پھر اس کرن سے پھوٹنے والی کئی کرنوں نے دور دور تک اجالا کر دیا۔ جبر و استبداد کے گھٹا ٹوپ اندھیرے بھاگ کھڑے ہوئے اور ارض مقدس فلسطین نور اسلام سے جگمگا اٹھی۔

شب ظلمت میں امید کی یہ پہلی کرن تھی، عماد الدین زنگی، جنہوں نے اپنی عظیم قوت ایمانی بے مثال جرات اور قیادت کی بے پناہ صلاحیتوں سے کام لیتے ہوئے پے در پے حملے کر کے صلیبیوں کے دانت کھٹے کر دیئے۔ ان کے مضبوط اقتدار کی بنیادیں ہلا دیں۔ صلیبیوں کے خلاف جس مقدس جہاد کا انہوں نے 507ھ میں آغاز کیا۔ اسے پھر ان کے بیٹے نور الدین زندگی اور پھر صلاح الدین ایوبی نے دوسری اور تیسری صلیبی جنگوں میں پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ فی الحقیقت صلیبی سیلاب کے آگے بند باندھنے کے جرات مندانہ اقدام میں پہل عماد الدین زندگی ہی نے کی۔

487ھ (1094ء میں سلجوقی سلطنت کی باگ ڈور سلطان رکن الدین ابوالمظفر برکاروق کے ہاتھوں میں آ چکی تھی۔ انہوں نے امیر کربوقا کو موصل کا امیر مقرر کر دیا تھا۔

امیر کربوقا، عماد الدین کے والد آقسنقر کے دوست تھے۔ انہوں نے عماد الدین کو اپنے پاس بلالیا۔ ان کی تعلیم و تربیت کے لیے اساتذہ مقرر کیے۔ ان کی رہائش، خوراک، لباس اور دیگر ضرورتوں کا اعلیٰ انتظام کیا۔

495ھ میں جرکمیش کے امیر کے لڑکے ناصر الدین کی بیٹی سے عماد الدین کی شادی ہوگئی۔ کچھ عرصہ بعد امیر مودود موصل کی حکمرانی پر فائز ہوئے۔ وہ بڑے غیرت منداور باہمت انسان تھے۔ انہوں نے ہی صلیبیوں کے خلاف باقاعدہ جہاد کی داغ بیل ڈالی۔ عماد الدین تو خود دل سے اس جہاد کے خواہاں تھے۔ ابھی صرف چند سال پہلے صلیبی لشکر بیت المقدس پر قابض ہو چکا تھا۔ اس المناک واقعہ سے عماد الدین کا دل بے حد افسردہ تھا اور وہ چاہتے تھے کہ انہیں صلیبیوں کو ارض مقدس سے مار بھگانے کا موقع مل جائے۔ امیر مودود کی فوج میں شامل ہوکر انہوں نے صلیبیوں کے خلاف زبردست لڑائیاں لڑیں۔ ان لڑائیوں میں بلاد شجستان، ایڈیسا اور طبریہ کے معرکے مشہور ہیں۔

507ھ (1113ء) میں طبریہ کا معرکہ پیش آیا۔ عماد الدین زنگی اس جنگ میں نہایت بہادری سے دشمن کی صفوں کو چیرتے ہوئے شہر کے دروازے تک پہنچ گئے اور اس میں اپنا نیزہ گاڑ دیا۔ ان معرکوں کے نتیجے میں عماد الدین کی دھاک ہر طرف بیٹھ گئی اور صلیبی ان کے نام سے خوف کھانے لگے۔

511ھ میں سلطان محمد سلجوقی کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے سلطان محمود تخت نشین ہوئے۔ انہوں نے 516ھ میں عماد الدین کو واسط کا حاکم بنایا اور ساتھ ہی بصرہ کی نیابت بھی سپرد کی۔ کچھ عرصہ بعد موصل کے امیر آقسنقر برسقی کا انتقال ہوگیا۔ ان کے انتقال کے بعد صلیبیوں نے موصل کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا۔ اس پر موصل کے دوسرکردہ علماء کرام بہاء الدین ابوالحسن علی شہرزوری اور صلاح الدین محمد، سلطان محمود کے پاس پہنچے اور ان کو مشورہ دیا کہ موصل میں کسی تجربہ کار شخص کو حاکم بنایا جائے۔ مشیروں سے مشورہ لیا گیا تو سب نے متفقہ طور پر رائے دی کہ موصل کی امارت کے لیے عماد الدین سے بہتر کوئی شخص نہیں ہے چنانچہ عماد الدین موصل کے گورنر مقرر کر دیے گئے۔

عمادالدین نے رمضان المبارک 522ھ (ستمبر 1127ء) میں موصل کا انتظام سنبھال لیا۔ اس کے ساتھ ہی سلطان محمود نے اپنے دونوں بیٹوں الپ ارسلان اور فرخ شاہ کی تعلیم عمادالدین زنگی کے سپرد کر دی اور انہیں اتابک کا خطاب دیا۔ اتابک ترکی کا لفظ ہے اور اس کے معنی ''بزرگ اور اتالیق'' کے ہیں۔ یہ لقب سب سے پہلے سلطان ملک شاہ طوسی کو دیا تھا اس کے بعد سلجوقی سلطنت میں اس خطاب کو نہایت اہمیت حاصل ہوگئی اور یہ صرف اس امیر کو دیا جاتا جو بے حد محترم اور ذی عزت سمجھا جاتا تھا اور نوجوان شہزادوں کی تربیت، نگرانی اور نگہداشت بھی اس کے سپرد کی جاتی تھی۔

مؤرخ الاثیر کے مطابق یہ وہ دور تھا جب عیسائی حکمران شہروں پر آبادی کا لحاظ کیے بغیر خراج لگا رہے تھے۔ حلب کی نصف آمدنی اسی طرح وصول کر لیا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ انہوں نے شہر کے دروازے پر باغ کے قریب جو چکیاں تھیں ان پر بھی خراج لگا دیا تھا۔

صلیبی جب چاہتے، دمشق اور حلب کے نواحی علاقوں میں عیسائیوں کی ٹولیاں لوٹ مار کیا کرتی تھیں۔ 522ھ میں حلب سے شہریوں کا ایک وفد عمادالدین زنگی کے پاس موصل آیا اور اس وفد نے شہریوں کی مظلومیت کی داستان سنائی۔ عمادالدین زنگی نے فوج کو تیار ہونے کا حکم دیا اور حلب پر حملہ کر دیا۔ یہ حملہ اس قدر تند و تیز تھا کہ صلیبی حکمرانوں کے ہوش اڑ گئے۔ عمادالدین عیسائی علاقے میں دور تک بڑھتے چلے گئے۔ یہ کسی عیسائی ریاست پر پہلا باقاعدہ حملہ تھا۔ دشمن بھاگ کھڑا ہوا اور عمادالدین نے حلب کو مستقل چھاؤنی کی حیثیت دے دی۔ وہ تقریباً ایک سال یہاں مقیم رہے اور اس عرصہ میں انہوں نے آس پاس کی عیسائی چوکیوں کا قلع قمع کر ڈالا۔ اگلے سال انہوں نے عیسائیوں کے زیر تسلط علاقے کے سب سے بڑے سرحد قلعہ، حصن الاثارب پر حملہ کر دیا۔

اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے یروشلم (بیت المقدس) کے بادشاہ بالڈون نے فوراً جاگیرداروں اور رؤسا کی کانفرنس بلائی اور ان سے صلاح مشورہ کیا کہ عمادالدین زنگی کے حملے کا کیا مقصد ہو سکتا ہے۔ آیا یہ ایک وقتی جوش ہے اور ذاتی اغراض کے پیش نظر کیا جا رہا ہے یا پھر اس کے پیچھے کوئی بڑا مقصد اور تحریک کارفرما ہے۔ بیشتر مشیروں کا خیال یہ تھا کہ یہ ایک

وقتی ابال ہے اور بہت جلد اس آندھی کا زور ٹوٹ جائے گا لیکن بعض مشیروں نے اندیشہ ظاہر کیا کہ یہ طوفان تھمنے والا نہیں ہے اور عمادالدین وہی شیر دل سالار ہے جس نے طبریہ کے دروازے پر نیزہ گاڑ دیا تھا۔ شاہ بالڈون نے فیصلہ کیا کہ ایک بڑی فوج تیار کی جائے اور حصن الاثارب کی سمت کوچ کیا جائے۔ حصن الاثارب حلب سے چار میل کے فاصلے پر انطاکیہ کو جانے والے راستے پر واقع تھا۔

جب عمادالدین کو بالڈون کی فوج کی آمد کی خبر ملی تو وہ بھی اپنے سپاہیوں کو لے کر آگے بڑھے اور دل ہلا دینے والے تکبیر کے نعروں کی گونج میں دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ یہ جنگ نہایت خونریز تھی اور صلیبیوں کا اس جنگ میں بہت زیادہ جانی نقصان ہوا۔ علامہ ابن خلدون کے مطابق ساٹھ ستر برس بعد تک بھی صلیبی سپاہیوں کی ہڈیاں میدان جنگ میں بکھری رہیں۔

بالڈون کی فوج کو شکست سے دوچار کرنے کے بعد عمادالدین زنگی پر قلعہ الاثارب کی طرف متوجہ ہوئے اور ایک زبردست حملہ کر کے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ بہت جلد قلعہ کی فصیلوں پر اسلامی پرچم لہرا رہا تھا۔ اس مضبوط قلعہ کی فتح سے صلیبی دہل کر رہ گئے۔ اب حلب اور نواحی علاقے صلیبیوں کی چھیڑ چھاڑ سے محفوظ ہو گئے تھے۔

اس دوران عیسائی فوجیں دشمن کے دروازے تک آ پہنچی تھیں۔ عمادالدین زنگی نے بحرین کا رخ کیا اور صلیبیوں کو خوفناک شکست دی۔ ان واقعات سے صلیبی اس قدر خوفزدہ ہوئے کہ ان کے پادری سیاہ ماتمی لباس پہن کر یورپی ممالک جا پہنچے اور وہاں نوحے اور مرثیے پڑھنے لگے۔ اس فریاد کا اثر یہ ہوا کہ روم کے شہنشاہ شاہ فرانس نے لاکھوں سپاہیوں کو اکٹھا کیا اور 534ھ (1140ء) میں ارض شام پر یلغار کر دی۔ انہوں نے جو راستہ اختیار کیا اس میں شیزر کا علاقہ بھی آتا تھا۔

اس زمانے میں شیزر ابوالعساکر سلطان ابن منقذ حکمران تھے۔ انہوں نے عمادالدین سے مدد طلب کی۔ عمادالدین نے فوراً فوج کو منظم کیا اور شیزر کے قلعہ کا محاصرہ کرنے والی صلیبی فوج کی جانب روانہ ہو گئے۔ دریائے عاصی کے کنارے پر پڑاؤ ڈال کر انہوں نے قیصر روم کو میدان جنگ میں آنے کی دعوت دی اور کہا کہ آؤ ہم تمہاری تلواروں کا مزا چکھیں

اور تم ہماری تلواروں کا۔

شام روم کو قلعہ الاثارب کے عیسائیوں نے یہ کہہ کر خوفزدہ کر دیا کہ ابھی اثارب کے معرکہ میں عماد الدین زنگی کا لشکر عیسائیوں کی فوج کا قلع قمع کر چکا ہے۔ چنانچہ میدان جنگ میں مقابلہ سود مند نہ ہوگا۔ چنانچہ قیصر روم نے پہاڑوں کی بلندی سے مقابلے کو ترجیح دی لیکن انہیں شاید علم نہ تھا کہ زنگی بھی ان نشیب وفراز سے بخوبی آشنا ہیں۔ زنگی کا لشکر بھی پہاڑ پر چڑھ گیا اور اتنا زبردست حملہ کیا کہ دشمن اپنا سارا سامان اسلحہ، منجنیقیں وغیرہ چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ عماد الدین نے اپنی فوج کو لے کر صلیبیوں کا دور تک تعاقب کیا۔ ہزاروں صلیبیوں کو ہلاک، زخمی یا گرفتار کر لیا اور تعاقب اس وقت تک جاری رکھا جب تک قیصر روم کی فوج شام کے ساحل پر شاہی بیڑے میں سوار ہو کر روم کی طرف بھاگ کھڑی نہ ہوئی۔ اس لڑائی میں عماد الدین کی فوج نے بڑی مقدار میں مال غنیمت حاصل کیا۔ اس شاندار فتح پر بہت سے مسلمان شعراء نے مبارکباد کے قصیدے لکھے۔

شیزر کے بعد عماد الدین نے قلعہ عرفہ پر حملہ کیا جو طرابلس کے عیسائی نواب کے قبضہ میں تھا۔ پھر قلعہ بعرین کا محاصرہ کر لیا، اس سے قبل بعرین کے مضافات میں شاہ یروشلم اور شاہ فرانس کی متحدہ فوج نے عماد الدین کا مقابلہ کیا اور شکست کھائی۔ قلعہ بعرین کا محاصرہ ایک ماہ تک جاری رہا جس کے بعد عیسائیوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔

6 جمادی الاول 539ھ 23 دسمبر 1144ء کا دن وہ تاریخی دن تھا جب عماد الدین نے پہلی صلیبی ریاست کے صدر مقام الرہا کو بھی تسخیر کر لیا۔ الرہا کی فتح کے بعد عماد الدین نے دریائے فرات کے مشرقی علاقے کی طرف پیش قدمی کی اور متعدد قلعے اور شہر فتح کیے ان میں سیروج کا مشہور قلعہ بھی قابل ذکر ہے۔

عماد الدین نے جس بھرپور طریقے سے صلیبیوں کے خلاف جہاد کا آغاز کیا تھا وہ پوری مسیحی دنیا کو چونکا دینے کے لیے کافی تھا۔ عماد الدین صلیبی فوجوں کو ارض مقدس سے پوری طرح نکال باہر کرنے اور بیت المقدس کی بازیابی کے لیے کوشاں تھے۔ وہ اپنا یہ مشن جاری رکھتے لیکن 5 ربیع الآخر 541ھ 14 ستمبر 1146ء کو انہیں کسی مملوک (غلام) نے شہید

کر دیا۔ ان کی عمر تقریباً 60 سال تھی۔

ان بطل جلیل کی شہادت کی خبر پوری اسلامی دنیا میں انتہائی رنج کے ساتھ سنی گئی لیکن عیسائیوں میں مسرت کے شادیانے بجنے لگے۔ فرانسیسی مؤرخ مثار کے مطابق "عمادالدین زنگی کی موت نے عیسائیوں کو حیات نو عطا کر دی۔"

عمادالدین زنگی شریعت کی پابندی کروانے اور قوانین حکومت پر عمل کروانے کے سلسلہ میں بہت سخت تھے۔ وہ سرکاری حکام اور فوجی افسروں پر کڑی نظر رکھتے تھے۔ انہیں ذاتی جائیدادیں بنانے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ انہوں نے فوج کو حکم دے رکھا تھا کہ وہ بھی فصلوں اور کھیتوں کو کوئی نقصان نہ پہنچائیں اور شہریوں اور دیہاتیوں سے معاوضہ ادا کیے بغیر کوئی چیز نہ لیں۔ وہ کہتے تھے

"جو سلطان اپنی فوج کو رعایا کی املاک اور زمین پر قبضہ کرنے کی اجازت دیتا ہے وہ بڑا ظالم اور ظلم کو رواج دینے کا موجب ہے۔"

عمادالدین زنگی نہایت سخی، رحم دل اور غریبوں کے ہمدرد تھے۔ وہ ہر جمعہ کی نماز سے قبل ایک سو سرخ دینار مستحقین میں تقسیم کرتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی وہ اپنے قابل اعتماد ماتحتوں کے ذریعہ غریبوں کی امداد کرتے رہتے تھے۔ انہوں نے اپنے ماتحت افسران کو سختی سے ہدایت کر رکھی تھی کہ ان کے علاقے میں کوئی فرد ایسا نہیں ہونا چاہئے جس کے پاس کھانے کے لیے خوراک اور پہننے کے لیے لباس نہ ہو۔ عمادالدین زنگی کی سخاوت کی وجہ سے بعض مؤرخین نے انہیں "ابوالجود" کا خطاب بھی دیا۔

عمادالدین زنگی نے اس قسم کا نظام حکومت نافذ کیا تھا کہ ان کی رعایا خود کو ایک وسیع خاندان کا حصہ سمجھتی تھی۔ جس کے سربراہ وہ خود تھے۔ شہید زنگی بے روزگاروں کو خود روزگار فراہم کرتے۔ مزدوروں اور کاریگروں کو اجرت کم ہونے کی شکایت ہوتی تو اجرت بڑھواتے۔ جن کاشتکاروں کے پاس زرعی اراضی کم ہوتی انہیں زمین دلواتے تھے۔ عمادالدین زنگی اپنا یہ قول اکثر دہرایا کرتے تھے۔

"ملک ایک باغ کی طرح ہے۔ جب تک باغبان اس کی آب پاشی اور حفاظت

میں سرگرم رہے گا وہ سرسبز و شاداب رہے گا، جونہی اس نے غفلت کی سارا باغ اجڑ کر رہ جائے گا۔"

عمادالدین زنگی نے جب موصل کی حکمرانی سنبھالی تو شہر کا اکثر حصہ ویران تھا۔ مساجد ٹوٹ پھوٹ چکی تھیں۔ جامع عتیق سے لے کر محلّہ طیاطللین تک ایک ویرانہ تھا لیکن عمادالدین زنگی، نے موصل کا انتظام اس قدر عمدگی سے کیا کہ چند سال کے اندر اندر یہ ویرانہ آباد ہوگیا۔ اس سے قبل شام کا تقریباً سارا علاقہ بنجر پڑا ہوا تھا اور صلیبیوں کی لوٹ مار سے تجارت بند ہوگئی تھی۔ عمادالدین نے ایک جانب پے درپے دستے بھیج کر لوٹ مار کا یہ سلسلہ سرے سے ختم کروا دیا۔ دوسری جانب لاکھوں افراد کو باہر سے بلوا کر دیہات میں آباد کیا۔ ہر قسم کے پھلوں کے باغات اور طرح طرح کے اناج کی فصلیں لگوائیں حتیٰ کہ پیداوار اتنی بڑھی کہ پھل اور غلہ شہر سے باہر بھی بھیجا جانے لگا۔ تجارت چمک اٹھی، مسمار عمارتوں کی جگہ نئی اور جدید طرز کی تعمیرات نے لے لی۔ عمادالدین نے موصل کے شمال میں بھی ایک شہر آباد کیا۔ جس کا نام خود ان کے نام پر عمادیہ رکھا گیا۔

عمادالدین زنگی ایک علم دوست حکمران تھے۔ ان کی مجلس میں بڑے بڑے علماء اور صاحب علم افراد موجود رہتے تھے۔ انہوں نے اہم ملکی عہدوں کے لیے بھی قابل اشخاص کا انتخاب کیا تھا۔ ان میں ایک اہم شخصیت ابو جعفر محمد الجواد کی ہے جو عمادالدین کے مشرف (وزیر اعظم اور مجلس شوریٰ کے صدر) تھے۔ ابو جعفر محمد الجواد نے نہ صرف علم کی ترویج اور سرپرستی کی بلکہ متعدد کارنامے سرانجام دیئے۔ انہوں نے خاصے فاصلے سے ایک نہر کھدوائی جو عرفات تک پانی پہنچاتی تھی۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں حاجیوں کو آرام و سہولیات مہیا کرنے کے لیے کئی عمارتیں بنوائیں، مدینہ منورہ کے گرد ایک مضبوط فصیل تعمیر کروائی۔ وہ ہر سال مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے مستحقین کے لیے اس قدر رقم، غلہ اور کپڑا بھیجتے تھے جو ان کی سال بھر کی ضرورتوں کے لیے کافی ہوتا تھا۔ ان مستحقین کو فراہم کی جانے والی امداد کا حساب کتاب بھی رکھا جاتا تھا اور بیواؤں، یتیموں اور محتاجوں کے کوائف محفوظ رکھے جاتے تھے۔

عمادالدین نہ صرف صاحب علم حکمران تھے بلکہ عمل کے میدان میں بھی آگے آگے

تھے۔ وہ نماز اور روزہ کو میدان جنگ میں بھی ترک نہ کرتے تھے۔عماد الدین زنگی چاہتے تو اپنے زیر تسلط علاقے پر اطمینان سے حکومت کر سکتے تھے لیکن ان کی غیرت ایمانی نے گوارہ نہ کیا کہ مسلمانوں کا قبلہ اول بیت المقدس، صلیبیوں کے قبضہ میں رہے۔ انہوں نے انتہائی کم وسائل اور قلیل افرادی قوت کے باوجود ایک بڑی طاقت سے ٹکر لے کر اسے لرزہ براندام کر دیا اور اس عظیم جہاد مقدس کی بنیاد رکھ دی جس کے نتیجے میں مسلمان کچھ ہی عرصے بعد بیت المقدس کو صلیبیوں سے واپس لینے میں کامیاب ہو گئے۔

❀❀❀



صلاح الدین ایوبیؒ

سپہ سالار کا شوق جہاد اس کے ایک ایک سپاہی کی رگ وپے میں سرایت کر گیا تھا۔ جب اس نے جہاد کے لیے اپنے پرچم کھولے تو ہر سپاہی جام شہادت پینے کے لئے بے تاب نظر آتا تھا

وہ بطل جلیل جس نے قبلہ اول کو غیر کے خونی پنجوں سے آزاد کروایا

جولائی کا مہینہ تھا۔ دھوپ لحہ بہ لحہ تیز ہوتی جارہی تھی۔ تپتی ہوئی پتھریلی زمین پر چلتے چلتے پیادہ فوج کے پاؤں جھلسے جاتے تھے اور وہ سواروں کا ساتھ نہ دے پاتے تھے۔ آخر شام ہوگئی مگر اسلامی لشکر کا کوسوں پتہ نہ تھا۔ رات انہوں نے راستے میں پڑاؤ ڈالا۔ جی بھر کے پانی پیا اور پڑ کے سو رہے۔ اگلے دن منہ اندھیرے اٹھ کر پھر کوچ بول دیا۔ یہ جمعہ کا دن تھا اور اسلامی لشکر کا سپہ سالار اسی دن کے انتظار میں تھا۔

آخر انہیں دور سے طبل جنگ سنائی دیا اور اسلامی پرچم لہراتا نظر آیا۔ پھر ایک نعرہ بلند ہوا۔ مسیحی لشکر صلیب الصلبوت اٹھائے آگے بڑھا۔ لوبیہ کے گاؤں کے قریب دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔ یہ مقام پہاڑ کی دو چوٹیوں کے درمیان تھا۔ جو قرن الحطین کہلاتی ہیں۔

اسلامی لشکر اور مسیحی افواج کے آمنے سامنے آنے کی وجہ ایک خبیث نظر شخص تھا جو کہ ریجنالڈ کے نام سے معروف تھا۔ یہ شخص کسی عیسائی امیر کی بیوی کو اغوا کر کے انطاکیہ لے بھاگا تھا اور اس کے بعد انطاکیہ کا حاکم بن بیٹھا تھا۔ اس کامیابی سے اس کے حوصلے اتنے بڑھ گئے تھے کہ ایک مرتبہ اس نے مسلمان حکمران سلطان نورالدین محمود سے ٹکر لینے کی جرأت کی

اور گرفتار ہو کر پندرہ سال قید رہ چکا تھا۔

رہائی ملنے پر اسے کرک کا قلعہ دار بنا دیا گیا۔اس کو مصر سے آنے جانے والے مسلمان تاجروں اور غریب حاجیوں کے قافلے لوٹنے میں خاص مسرت حاصل ہوتی۔ایک دفعہ تو اس نے مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ پر چڑھائی کا منصوبہ بنالیا تھا اور اس میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہو گیا تھا اس کی تفصیل عیسائی مصنف لین پول نے یوں لکھی ہے۔

ریجنالڈ نے جزیرہ نمائے عرب پر فوج کشی کا ارادہ کیا تھا تاکہ مکہ معظّمہ میں خانہ کعبہ اور مدینہ منورہ میں آنحضرت ﷺ کے روضۂ مقدس کو مسمار کر دے۔اس غرض سے اس نے خاص جہاز تیار کرائے تھے جن کے ٹکڑے الگ کر کے انھیں دوبارہ جوڑا جا سکتا تھا۔ان ٹکڑوں کو وہ اپنے قلعہ کرک سے عقبہ کے ساحل پر لے گیا اور انھیں جوڑ کر جہازوں کا ایک بیڑا تیار کیا اور عیذاب پر چھاپہ مارنے نکلا جو بحیرۂ قلزم کے افریقی ساحل پر واقع ہے۔ پھر اس نے دو جہازوں کو بیچ میں ڈال کر بندرگاہ ایلہ کا راستہ بند کر دیا۔مسلمانوں کو اس کی خبر ہوئی تو ان کا بحری بیڑا ریجنالڈ کے تعاقب میں نکلا۔اس بیڑے کا امیر البحر لولو تھا۔لولو نے آتے ہی ایلہ کا بحری راستہ کھول دیا پھر اپنی ساری فوج کو بندرگاہ الحورا تک لے آیا۔ ریجنالڈ نے اسی بندرگاہ سے مدینے پر حملے کا منصوبہ بنایا تھا۔اسلامی فوج کو آتا دیکھ کر فرنگیوں کے ہوش اڑ گئے اور وہ جہازوں سے اتر کر پہاڑوں کی طرف بھاگے۔لوگوں نے بدوؤں سے گھوڑے لے کر اپنے سپاہی ان کے پیچھے روانہ کیے، دشمنوں کو باغ اور غار میں جا پکڑا اور ان کے ٹکڑے اڑا دیے۔لولو نے کسی کو جان کی امان نہ دی۔

مگر ایک شخص بچ نکلا جو ریجنالڈ تھا۔کرک واپس پہنچ کر وہ اپنی قوت مجمع کرتا رہا اور حسب معمول قلعہ کے قریب سے گزرنے والے قافلوں کو لوٹنا اس کا معمول تھا۔ایک دن قلعہ میں شادی کی ایک تقریب تھی۔ملکہ سبل کی بہن شہزادی ازابیل کی شادی ریجنالڈ کے کسی عزیز کے ساتھ ہو رہی تھی۔ جب رات بھیگ چکی تو دلہا دلہن کو قلعے کے ایک برج میں پہنچا دیا گیا اور قلعہ پر سناٹا چھا گیا۔اچانک رات کی تاریکی میں نقارے پر چوٹ پڑی اور تلواریں کھنکنے لگیں اور ''یا اہل السلام'' ! ''یا اہل السلام'' کا نعرہ فضا میں گونجنے لگا۔

اسلامی لشکر ریجنالڈ سے مکے پر حملے کا انتقام لینے آن پہنچا تھا۔ اس نے ریجنالڈ کے سپاہیوں کو سنبھلنے کی مہلت نہ دی اور قلعے کے بیرونی احاطے پر دھاوا بول دیا۔ ریجنالڈ کے سپاہی بھاگ کر قلعے میں گھس گئے اور اس کا پل اڑا دیا۔ مسلمانوں نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا اور خندق کے سامنے منجنیقیں نصب کرا دیں لیکن جب لشکر اسلام کے کمانڈر کو یہ معلوم ہوا کہ اس کے حملے سے شادی کی کسی تقریب میں خلل واقع ہوا ہے اور حصار کے اندر ایک برج میں دلہا دلہن ٹھہرے ہوئے ہیں تو اس نے حکم دیا کہ اس برج کو نشانہ نہ بنایا جائے۔

قلعہ کا محاصرہ کوئی مہینہ بھر جاری رہا۔ اتنے میں طبریہ کا حاکم ریمنڈ کمک لے کر پہنچ گیا۔ اس نے سپہ سالار سے ملاقات کی اور پانچ سال کے لیے عارضی صلح ہوگئی 1184ء کے شروع میں سپہ سالار سرحد سے واپس چلا گیا۔

لیکن ریجنالڈ جیسے رہزن کی نظر میں قول و پیمان کی بھلا کیا وقعت ہو سکتی تھی۔ جب اس کو خبر ملی کہ تاجروں کا ایک بہت بڑا قافلہ قاہرہ سے آیا ہے اور اس کے قلعے کے قریب پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے تو اس سے نہ رہا گیا۔ اس نے اس قافلے پر دھاوا بول دیا اور اسے لوٹ کر تاجروں کو قیدی بنا لیا۔ سپہ سالار نے مطالبہ کیا کہ ان تاجروں کو فوراً رہا کر دیا جائے۔ لیکن نہ تو بیت المقدس کے بادشاہ گائی نے اس کی کوئی پروا کی اور نہ ریجنالڈ نے۔ بلکہ اس قزاق نے تو مکے سے آنے والے حاجیوں کے ایک اور قافلے پر بھی حملہ کر دیا۔ جب انہوں نے فریاد کی تو ریجنالڈ بولا۔ کہاں ہیں تمھارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم بلاؤ نا انھیں اپنی مدد کے لیے! پھر اس نے بڑی سفاکی سے قافلے کو لوٹ لیا اور بہت سے حاجیوں کو شہید کر ڈالا۔

سپہ سالار کو اس واقعے کی خبر ہوئی تو اس کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا۔ اس نے کہا: ان شاء اللہ اس شخص کو میں اپنے ہاتھ سے قتل کروں گا۔

سپہ سالار کا شوق جہاد اس کے ایک ایک سپاہی کی رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا۔ جب اس نے جہاد کے لیے اپنے پرچم کھولے تو ہر سپاہی جام شہادت پینے کے لیے بے تاب نظر آتا تھا۔ سپہ سالار نے تہیہ کر لیا تھا کہ جب تک صلیبیوں کی فوجی طاقت کا قلع قمع نہیں ہو جائے گا اور یہ غاصب سرزمین مقدس خالی نہ کر جائیں گے وہ دم نہیں لے گا۔

ادھر صلیبیوں کو بھی چاروں طرف سے فوجی مدد مل رہی تھی اور وہ جوق در جوق میدان کار زار میں پہنچ رہے تھے۔ رفتہ رفتہ ان کی فوجیں صفوریہ کے چشموں تک پہنچ گئیں جن کے آگے میلوں بنجر میدان پھیلا ہوا تھا۔ نزدیک و دور نہ کوئی ندی تھی اور نہ کہیں سبزہ۔ صلیبی لشکر کی تعداد بیس ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ اس میں شامی فرنگیوں کے قریب قریب تمام سردار شامل تھے۔ سب کے سب اسلامی سپہ سالار سے ایک فیصلہ کن جنگ کے لیے میدان میں نکل آئے تھے۔ بالآخر انھیں خبر ملی کہ سپہ سالار دریائے اردن پار کر چکا ہے اور ان سے صرف پندرہ میل دور طبریہ کی بلندیوں میں خیمہ زن ہے۔ وہ اپنے ساتھ پچیس ہزار کا لشکر جرار لے کر نکلا تھا اور اپنے بڑے لڑکے ملک الفاضل کی سرکردگی میں ایک مختصر سی فوج طبریہ پر حملہ کرنے کے لیے گلیلی کی طرف روانہ کر دی تھی اس فوج نے شہر کا محاصرہ کر لیا اور ایک ہی دن میں اس کی بیرونی فصیل پر قبضہ کر لیا۔ شہر میں ریمنڈ کی بیوی اور فوج گھر کر رہ گئی۔

اس خبر سے عیسائیوں میں کھلبلی مچ گئی۔ انہوں نے فوراً ایک مجلس مشاورت منعقد کی تا کہ لڑائی کے بارے میں کوئی قطعی فیصلہ ہو سکے۔ شاہ گائی میں مقابلے کی جرأت نہ تھی، اس لیے اُس نے لڑائی میں پہل کرنے کی مخالفت کی۔ طبریہ کا فرماں روا ریمنڈ بڑا دور اندیش آدمی تھا اور سپہ سالار کی فوجی صلاحیتوں سے بخوبی آگاہ تھا۔ وہ بولا: دشمن چاہے طبریہ پر قبضہ کر کے میرے اہل و عیال کو گرفتار ہی کیوں نہ کر لے مگر پیش قدمی ہرگز نہ کی جائے۔ کچھ اور سرداروں کا مشورہ بھی یہی تھا لیکن شام کو ریجنالڈ اور ٹیمپلروں کا سردار ڈی رڈ فورڈ چپکے سے شاہ گائی خیمے میں جا پہنچے اور اسے پیش قدمی پر رضامند کر لیا۔ پھر اگلے دن سویرے ہی صلیبیوں نے کوچ بول دیا۔

ادھر سپہ سالار کے مشیر بھی لڑائی کے خلاف تھے لیکن سپہ سالار نے کہا: اللہ کی رضا پر بھروسہ رکھو اور حملے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اس کے بعد شاید دشمن کا اتنا بڑا لشکر کبھی اکٹھا نہ ہو سکے۔

مسیحی سردار اس زعم میں چلے تھے کہ دوپہر تک مسلمانوں کو جالیں گے اور شام تک ان کا صفایا کر دیں گے۔ انہیں موت نے ایسا دھکا دیا تھا کہ وہ اندھا دھند اس لق و دق میدان

میں بڑھے چلے جارہے تھے جو صفوریہ کے چشموں کے آگے پھیلا ہوا تھا۔ کرک کے بھیڑیے کو جب اسلامی فوج کی تعداد کا علم ہوا تو ہنس کر کہنے لگا! لکڑیاں جتنی زیادہ ہوں گی آگ اتنی ہی زیادہ جلے گی۔

دونوں لشکروں کے آمنے سامنے آنے کا پس منظر یہی تھا اور اب دونوں ایک دوسرے کو ختم کرنے کے درپے تھے۔ صلیبیوں نے ایک زوردار حملہ کیا اور مسلمانوں نے ان کے حملے کو روک کر انھیں قتل کرنا شروع کر دیا۔ دن بھر گھمسان کی لڑائی ہوتی رہی۔ فرنگیوں نے سر توڑ کوشش کی کہ مسلمانوں کی صفوں کو درہم برہم کر کے اسی دن لڑائی ختم کر دیں لیکن مجاہدین اسلام اپنی جگہ ڈٹے رہے اور دشمنوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹتے رہے۔ رات ہوئی تو فرنگی نڈھال ہو چکے تھے۔ چاروں طرف لاشیں ہی لاشیں بکھری پڑی تھیں اور وہ ان کے بیچ میں خستہ حال بیٹھے تھے۔

دوسرے دن پھر گھمسان کا رن پڑا۔ مسلمانوں نے اس قدر جوش و خروش سے حملہ کیا کہ عیسائی لشکر میں افراتفری پھیل گئی۔ ریمنڈ نے یہ صورت حال دیکھی تو ایک مختصر سا دستہ لے کر چپکے سے ساحل کی طرف فرار ہو گیا۔ دوپہر تک جنگ کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ عیسائی سمٹ سمٹ کر حطین کے ٹیلے پر جمع ہو گئے اور مسلمانوں نے ان پر چاروں طرف سے یورش کر دی۔ آخر انھوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ ناموس رسالت کے محافظ لشکر اسلام کے سپہ سالار اعظم اور امت مسلمہ کے اولعزم کمانڈر اس شخص کو دنیا صلاح الدین ایوبی کے نام سے جانتی ہے۔

صلاح الدین کا ایک امریکی سوانح نگار ہیرلڈ لیمب اس کی اس شاندار فتح کے متعلق لکھتا ہے کہ شاہ گائی کی دعوت پر فرنگیوں کا ایک لشکر جرار مسلمانوں کے مقابلے کے لیے آیا تھا۔ لیکن جب جنگ حطین اختتام کو پہنچی تو صلیبی فوج کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ قرن حطین میں صرف قیدی زندہ بچے۔ باقی سارے مسیحی موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے اور یروشلم کے بہادر نائٹوں کا خاتمہ ہو گیا۔

صلاح الدین ایوبی اپنی اس فتح کو تائید الٰہی جان کر ایک عظیم مستقبل کا عنوان سمجھتا تھا اور واقعتاً ایسا ہی ہوا کہ اللہ نے اس کو قبلہ اوّل کی آزادی کے لیے چن لیا۔ ایک مرتبہ سلطان

صلاح الدین ایوبی بیمار ہوئے اور شدت بیماری میں آپ نے دعا کی یاذوالجلال والاکرام! اگر میں تندرست ہو گیا تو نصاریٰ کو عالم اسلام سے نکالنے اور بیت المقدس پر اسلامی پرچم لہرانے میں اپنی باقی عمر صرف کردوں گا۔‘‘

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد خلاف میں یروشلم اسلامی سلطنت کا حصہ بنا۔ یہ خطہ سرزمین انبیاء کے نام سے مشہور ہے۔ بیت المقدس 490 برس تک اسلامی سلطنت کا حصہ رہا۔ جب مسلمانوں میں اتحاد واتفاق ختم ہوا تو دنیائے نصاریٰ نے بیت المقدس پر قبضہ کرنے کا ارادہ کر لیا۔ 1090ء میں نصاریٰ نے تیاریاں شروع کردیں۔ پوپ پال نے تمام نصاریٰ کو اس مشن کیلیے آمادہ کیا۔ 1096ء میں نصاریٰ کے سرخیل گاڈ فری کی قیادت میں 6 لاکھ نصاریٰ کے جنگجو اور خون خوار فوج ارض فلسطین میں داخل ہوئی۔ 1099ء میں صلیبی جنگجوؤں نے بیت المقدس کے دروازوں پر دستک دی اور شہر کا محاصرہ کرلیا۔ نالائق نااہل اور بزدل مسلم حکمران نے مقابلہ سے جان چھڑائی۔ نصرانیوں کے ناپاک قدم بیت المقدس میں داخل ہو گئے۔ نصاریٰ کے خونخواروں نے مسلمانوں کا قتل عام شروع کردیا۔ پہلی صلیبی جنگ کا نتیجہ لاکھوں مسلمانوں کے قتل عام پر منتج ہوا۔ 490 برس تک اسلامی سلطنت کا حصہ رہنے کے بعد اب یروشلم ایک مرتبہ پھر نصاریٰ کی عملداری میں آ گیا تھا۔ نصرانیوں نے گنبد سے ہلال کو اتارا اور صلیب لٹکادی۔ مسلمانوں کیلیے یہ بہت بڑا صدمہ تھا۔ آج ان سے وہ مقدس شہر چھن گیا تھا۔ جس میں رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے شب معراج کے موقع پر کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کو نماز پڑھائی تھی۔ پھر یہی وہ قبلہ اول تھا جس کی جانب رخ کر کے ہادی عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور جانثار صحابہ نے کئی سال تک نمازیں ادا فرمائی تھیں۔ اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مسلمان نفاق کا شکار ہوئے تو نصاریٰ یہاں غالب آ گئے۔ اب جہاد فی سبیل اللہ جیسی نعمت عظمیٰ مسلمانوں سے چھن چکی تھی۔ صلیب غالب آ گئی تھی۔ اب مسلمان کسی صلاح الدین ایوبی کے منتظر تھے جو ان کو متحرک کر کے نصاریٰ پر ہیبت طاری کرسکتا۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کار خیر کے لیے سلطان صلاح الدین ایوبی میدان میں آئے۔ صلاح الدین ایوبی نے ابتدا میں مصر کی حکومت کی باگ ڈور سنبھالی تو عزم مصمم کرلیا کہ نصاریٰ کو ارض مقدس

سے نکال کر دم لے گا۔ صلاح الدین ایوبی نے جہاد کی تبلیغ اور شہادت کے فضائل بیان کیے اور پوری مملکت کو ابھارا گیا کہ اللہ کی مقدس سرزمین سے نصاریٰ کو بے دخل کرنا ہے پھر اسلامی دنیا کو ایک جھنڈے کے نیچے جمع کیا۔ سلطان صلاح الدین ایوبی کو سلطان تسلیم کرلیا گیا۔ لیکن مصر، عراق، شام اور یمن کا یہ سلطان پھر بھی اپنے جہادی خیمے میں گامزن رہا۔ صحیح مجاہدین ہی آپ کے درباری تھے اور تلواروں کی تربیت آپ کا مشغلہ تھا۔ صلاح الدین ایوبی نے بیت المقدس کی فتح کے لیے خالق ارض وسماء سے مدد مانگی اور پھر اس مشن کے لیے تیاری کرنے لگے۔

نصاریٰ کا لیڈر ان دنوں ریج نالڈ تھا۔ یہ ملعون بدعہد سفاک اور وحشی تھا۔ حج کے قافلوں کو لوٹ لیتا تھا۔ عورتوں بچوں اور بوڑھوں کو قتل کر دیتا تھا۔ قیدیوں کو غلیظ طعنے دیتا تھا۔ ایک مرتبہ اس لعین خبیث نے انتہائی ناپاک جسارت کی اور کہا اپنے محمد ﷺ کو پکارو کہ تمہیں چھڑائے۔ اب سلطان نے عزم مصمم کرلیا کہ اس خبیث کو واصل جہنم کر کے بیت المقدس کو آزاد کروائے گا۔ 583 ہجری کے دوران غازی صلاح الدین مجاہدین اسلام کا لشکر لے کر بیت المقدس کی جانب روانہ ہوئے۔

نصاریٰ نے یہ خبر ملنے پر خوب تیاری کی۔ صلیب کے سائے میں عہد وپیمان باندھے گئے۔ عیسائیوں نے بہت بڑا لشکر تیار کیا اور صلاح الدین ایوبی کی پیش قدمی کو روکنے کے لیے حطین میں خیمہ زن ہوگئے۔ صلاح الدین ایوبی کو جب یہ خبر ملی تو آپ نے بھی مجاہدین اسلام کو حطین کی جانب پیش قدمی کرنے کا حکم دیا۔ صلاح الدین ایوبی منتظر تھے کہ نصاریٰ حطین سے نکل کر مقابلہ کریں لیکن ان کو ہمت نہ ہوئی۔ طبریہ کا قلعہ نزدیک ہی تھا اور محفوظ پناہ گاہ تھا۔ صلاح الدین ایوبی نے پیش قدمی کی اور یہ قلعہ فتح کرلیا۔ نصاریٰ کے لشکر میں صف ماتم بچھ گئی۔ ایک مرتبہ پھر صلیب کے سائے میں عہد و پیمان باندھتے ہوئے نصاریٰ طبریہ واپس لینے کے لیے میدان جنگ میں آئے۔ صلاح الدین ایوبی نے ایسی چال چلی کہ مجاہدین کو بلند وبالا مقامات پر تعینات کردیا۔ نصاریٰ کی پوری فوج گھیرے میں آ گئی۔ صلاح الدین ایوبی نے ان کی سپلائی لائن کاٹ کر ان کی لاجسٹک سپورٹ بند کردی۔ اب پانی کے سرچشمے اس

کے قبضہ میں تھے۔نصاریٰ کی صفوں میں بھوک اور پیاس نے راج کرنا شروع کردیا۔ اب لڑائی شروع ہوئی،مجاہدین نے ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا۔ شدید لڑائی میں 3000 عیسائی واصل جہنم ہوئے اور 30,000 اپنے بادشاہ کی قیادت میں قیدی بنے۔اس عظیم الشان فتح پر بھی صلاح الدین ایوبی کے دل میں ذرہ برابر غرور نہ آیا۔آپ گھوڑے سے اترے اوراپنی جبین کو اللہ کے حضور سجدے میں رکھ دیا۔

اب صلاح الدین ایوبی کی اگلی منزل بیت المقدس کی فتح تھی۔ نصاریٰ کا فرمانروا اورصلیب اب سلطان کی قید میں تھے۔ سلطان نے مجاہدین کی تنظیم نومکمل کی۔ راستے کی تمام رکاوٹیں دور کیں اور پیش قدمی کرتے ہوئے یروشلم کے دروازوں پر دستک دی۔ مجاہدین اسلام سے ولولہ انگیز خطاب کیااور جہاد کے فضائل سے آگاہ کیا۔صلاح الدین ایوبی نے کہا کہ 91 سال سے بیت المقدس نصاریٰ کے ناپاک قبضہ میں ہے اور یہاں کفروشرک کی حکمرانی ہے۔ایک دن بھی اس کی عبادت نہیں ہوئی۔اس موقع پر انہوں نے عزم مصمم کرتے ہوئے کہا ''جب تک بیت المقدس پراسلام کا جھنڈا نہ نصب کردوں اس وقت تک نصاریٰ کے خلاف جہاد کروں گا۔ یہاں تک کہ فتح میرا مقدر بنے یا میرے پرخچے اڑ جائیں۔''

صلاح الدین ایوبی نے نصاریٰ کو للکارا، اپنی سپاہ کو مختلف ذمہ داریاں سونپ دیں۔مکمل ذہنی اورجسمانی تیاری کے بعد انہوں نے اللہ اکبر کا نعرہ بلند کردیا۔ چاروں طرف سے اللہ تعالیٰ کی عظمت وکبریائی کے نعرے گونجنے لگے۔شہادت کی طلب گار مسلم سپاہ مرنے مارنے پرتل گئی۔اب عام پیش قدمی شروع ہوئی۔ رکاوٹ بننے والا ہر صلیبی واصل جہنم کیا جانے لگا۔ نصاریٰ نے بیت المقدس کے اردگرد فصیل بنائی ہوئی تھی اوراس کے ساتھ گہری خندق کھودی ہوئی تھی۔ جلد ہی ہزاروں صلیبیوں کی ناپاک لاشوں سے یہ خندق بھرگئی۔مجاہدین نے صلیب کو گرادیا۔مجاہدین شہرمیں داخل ہونے لگے۔شکست خوردہ نصاریٰ کا فرمانروا صلاح الدین ایوبی کی خدمت میں حاضر ہوا اور امان طلب کی۔ نصرانی فرمانروا ۱۹ سال پہلے والے نصرانی ظلم وستم کو بھول گیا تھا۔ جب نصرانیوں نے یروشلم پر قبضہ کرکے لاکھوں مسلمانوں کو شہید کرکے خون کی ندیاں بہادی تھیں۔صلاح الدین ایوبی چونکہ سنت محمد ﷺ سے پیار کرتا

تھا لہٰذا فاتح بدر وحنین ﷺ کی پاکیزہ سنت پر عمل درآمد کرتے ہوئے نصاریٰ کو عام معافی دے دی۔ نصاریٰ سے اسی حسن سلوک کا مظاہرہ سیدنا عمر فاروق t نے بھی 600 سال قبل کیا تھا۔ صلاح الدین ایوبی نے انتہائی کم فدیہ وصول کیا۔ ناداروں کا فدیہ بیت المال سے ادا کیا۔ نصاریٰ کے فرمانروا کی اہلیہ کو سارے مال واسباب اور خدام سمیت آزاد کر دیا۔ 91 سال بعد بیت المقدس ایک بار پھر مسلمانوں کے ہاتھ میں آیا۔

اس عظیم الشان فتح نے مسلم سپاہ کا سر فخر سے بلند کر دیا اور دنیائے نصاریٰ میں کہرام مچ گیا تھا۔ نصاریٰ نے بدلہ لینے کی ٹھان لی۔ پوپ پال اور پادریوں نے چندہ اکٹھا کرنا شروع کر دیا۔ جذبات ابھارے گئے۔ نصرانی شاعروں نے مرثیے لکھنے۔ بڑے بڑے چرچ شام غریباں کا منظر پیش کرنے لگے۔ نصاریٰ نے اپنی آمدنی کا دس فیصد جنگی تیاریوں میں جھونک دیا اور اس ٹیکس کا نام عشر صلاح الدین رکھا اور لاکھوں کا لشکر تیار کیا گیا۔

سال 585 ہجری کے دوران یورپی ممالک سے یہ ٹڈی دل لشکر یروشلم پر قبضہ کے لیے روانہ ہوئے۔ صلاح الدین ایوبی ان کے منتظر تھے۔ آپ کی قیادت میں مجاہدین اسلام اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے جان کی بازی لگا کر رتبہ شہادت پر فائز ہونے کے لیے تیار تھے۔ صلاح الدین ایوبی نے اتنی زبردست پلاننگ کی کہ نصاریٰ کے لشکر کو راستے ہی میں الجھا کر اور لمبی جنگ کے ذریعے بے دست و پا کر دیا جائے تاکہ وہ یروشلم تک پہنچنے ہی نہ پائے۔ تمام تدبیراتی عوامل کو مدنظر رکھتے ہوئے صلاح الدین ایوبی ساحل عکا پر خیمہ زن ہوا۔

لاکھوں کے نصرانی جتھے ساحل پر لنگر انداز ہوئے۔ صلاح الدین ایوبی نے مجاہدین اسلام کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک حصہ شہر کی حفاظت کے لیے شہر کے اندر لگا دیا تاکہ شہریوں کی حفاظت ہو اور باقی مجاہدین کو لے کر نصرانیوں کے عقب میں خیمہ زن ہوا۔ صلاح الدین ایوبی نے پلٹ جھپٹ کر نصرانیوں کو ان کے عقب سے خون میں نہلانا شروع کر دیا۔ خود صلاح الدین ایوبی مجاہدین کی قیادت کرتے ہوئے نصاریٰ پر شب خون مارتے اور ان کی صفوں کو چیر کر ان کے دلوں پر ہیبت طاری کر دیتے تھے۔ عکاء کی محافظ فوج بھی نصاریٰ پر شب خون مارتی رہتی۔ ہر تازہ حملے میں سینکڑوں نصرانی واصل جہنم ہوتے رہے۔

عکاء پر سات لاکھ نصرانی حملہ آوروں کی امداد کے لیے روزانہ یورپ سے نئے جتھے وارد ہوتے رہتے تھے۔ عکاء کی جنگ تین سال تک جاری رہی۔ ہزاروں نصاریٰ واصل جہنم ہوئے۔ان کے لاکھوں کے لشکر کی کمر ٹوٹ گئی۔عیسائی دنیا میں ہلچل مچ گئی۔ایک اور تدبیراتی چال کے ذریعے عکاء شہر سے مسلم مجاہدین کو واپس بلا لیا گیا تاکہ یروشلم پہنچنے تک نصاریٰ کا زور ختم ہو جائے۔عکاء اور یروشلم کے درمیان ایک اور قصبے میں صلاح الدین ایوبی اور نصاریٰ کی جھڑپیں ہوئیں۔ یہاں بھی ہزاروں نصاریٰ واصل جہنم ہوئے۔اب ان میں سلطان کا مقابلہ کرنے کی اہلیت ختم ہوگئی تھی۔ان گنت وسائل اور لاکھوں سپاہی صلاح الدین ایوبی کا کچھ نہ بگاڑ سکے تھے۔ نصاریٰ کے کمانڈر انچیف نے کہا کہ اس عرصہ (تین سال) میں تو ہم اتنے وسائل اور سپاہ کے ساتھ پورا ایشیا فتح کر سکتے تھے۔اسی غم وفکر میں فرانس کا بادشاہ فلپ اپنی سپاہ سمیت ناکام ونامراد لوٹ گیا۔ رچرڈ خود بھی بددل ہوگیا۔اب رچرڈ،صلاح الدین ایوبی سے صلح کرنا چاہتا تھا۔ اس نے صلاح الدین ایوبی کی خدمت میں قاصد بھیجا اور لاکھوں فوجیوں کے کمانڈر انچیف نے صلاح الدین ایوبی سے بیت المقدس حوالے کرنے کا مطالبہ کیا۔سلطان نے جواب دیا کہ جب تک ایک بھی مسلم مجاہد زندہ ہے۔ بیت المقدس کی طرف پیش قدمی شروع کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ رچرڈ نے صلح سے مایوس ہوکر بیت المقدس کی طرف پیش قدمی شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔اب قدم قدم پر صلاح الدین ایوبی اور مجاہدین نے سردھڑ کی بازی لگادی۔ ہزاروں نصاریٰ واصل جہنم ہوئے رچرڈ کا منصوبہ ناکام ہوگیا۔اس نے اپنے ماتحت کمانڈروں کو طلب کیا اور ان کا مشورہ مانگا۔سب کمانڈروں نے رچرڈ کو مشورہ دیا کہ واپس جانا چاہیے۔سلطان صلاح الدین کی موجودگی میں ہم بیت المقدس کو تسخیر نہیں کرسکتے۔ ناکام ونامراد رچرڈ نے سلطان سے صلح کی درخواست کی۔ سلطان نے اپنی پسندیدہ شرائط پر اس کی درخواست قبول کرلی۔لشکر نصاریٰ کے سربراہ نے صلیب کی واپسی کا مطالبہ کیا لیکن سلطان صلاح الدین ایوبی رحمہ اللہ نے اس سے انکار کردیا۔ رچرڈ کی کوئی بھی شرط تسلیم نہ ہوئی اور وہ ناکام ونامراد واپس لوٹنے لگا۔ واپس لوٹتے ہوئے رچرڈ زاروقطار رو رہا تھا اور اپنے منہ کے سامنے ڈھال رکھ کر کہہ رہا تھا ”میں جس شہر کو فتح کرنے آیا تھا اب

اس کی طرف دیکھنے کے بھی لائق نہیں رہا۔''

شہادت کے متمنی صلاح الدین ایوبی نے جنگوں سے فراغت کے بعد حج بیت اللہ کا ارادہ کیا لیکن سخت بیمار ہو گئے اور 1193 ھ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ وفات کے بعد اس صلاح الدین ایوبی اسلام کی ملکیت میں 50 درہم سے بھی کم دولت تھی۔

آج بھی سلطان صلاح الدین ایوبی کا جہادی کردار ہمارے سامنے مشعل راہ ہے۔ صلاح الدین ایوبی کی ہمت وشجاعت اوراستقلال مسلم کمانڈروں کے لیے بہت بڑا عسکری سبق ہے۔ ان کی خیمہ کی زندگی اور جہاد سے وابستگی زریں مثالیں ہیں۔

صلاح الدین ایوبی نے ہمیشہ سادہ زندگی گزاری۔ ان کا سادہ خیمہ آج پورے عالم اسلام کے سالاران عسارکرکو پیغام دیتا ہے کہ نمائشی زندگی سے گریز کریں۔

صلاح الدین ایوبی کی زندگی سبق سکھاتی ہے کہ ہم ہمہ تن شریعت محمدی ﷺ کی پیروی کریں۔ سچی پیروی ہی میں ہماری دنیا واخروی فلاح ہے۔

سلطان کے دل میں جہاد کا شوق اورمحبت انہیں حد تک تھی کہ سوائے جہاد فی سبیل اللہ کے اسے کسی کام سے رغبت نہیں تھی۔

آج کے دور میں ماڈرن افواج کے کمانڈر جب اپنے ماتحتوں کو جنگی احکامات دیتے ہیں تو آخری آدمی آخری گولی تک کا حکم دیتے ہیں۔ آج سے 1000 سال پہلے سلطان غازی صلاح الدین نے اس کا عملی ثبوت دیا تھا۔ جب رچرڈ کو صلاح الدین ایوبی کے اس ارادے کا علم ہوا تو اس نے بھاگنے میں ہی عافیت سمجھی۔

المختصر سلطان صلاح الدین ایوبی کی فتوحات نے مسلمانوں کی عظمت رفتہ کو بحال کیا۔ انہوں نے زندگی بھر کسی یہودی، نصرانی، سبائی یا رافضی سے دوستی نہیں کی۔ اس کی دوستی صرف مسلمانوں اور خصوصاً مجاہدین اسلام کے ساتھ ہوئی تھی۔

آج پھر ایک غازی صلاح الدین ایوبی کی ضرورت ہے جو فرعون وقت اوراس کے حواریوں کو للکار سکے۔



شہاب الدین غوریؒ

وہ ظالم کے لیے سیف بے نیام اور مظلوم کے لیے امن کا پیغام تھا: وہ صبر و استقامت کا ایسا پہاڑ تھا جس کی مضبوط چٹانوں سے برصغیر کا سارا کفر اپنا سر ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا

دہلی کو فتح کرنے والے عظیم مسلم سپہ سالار کا دلپذیر تذکرہ

ترائن کا وسیع و عریض میدان، میدان کارزار بنا ہوا ہے۔ تاحد نظر گھوڑے اور ہاتھی نظر آ رہے ہیں، ان پر سوار نوجوان بار بار بے چینی سے پہلو بدل رہے ہیں۔ وہ جنگ شروع ہونے کے منتظر ہیں تاکہ دشمن پر جھپٹ پڑیں۔ وہ شمشیر وسناں کے جوہر دکھانے اور جنگی مہارت کا مظاہرہ کرنے کے لیے بے تاب ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ آج طرفین عزم کر کے آئے ہیں کہ مخالف کو نہیں چھوڑیں گے۔

دونوں لشکر بالکل تیار ہیں۔ ایک جانب ہندو فوج ہے جو کم وبیش پانچ لاکھ جوانوں پر مشتمل ہے۔ ان سب کا تعلق کسی ایک حکومت اور ریاست سے نہیں بلکہ یہ ایک سو پچاس ریاستوں کی متحدہ فوج ہے۔ یہ سب راجے مہاراجے دشمن کی فتوحات کے آگے بند باندھنے کے لیے اکٹھے ہوئے ہیں کیونکہ دشمن کی پے در پے فتوحات سے ان کی ریاستیں ختم ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ دہلی کے حکمرانوں نے ان سب راجوں کو دھرم رکھشا (ہندو مذہب کی حفاظت) کے نام پر اکٹھا کیا ہے۔ یوں ساری فوج جوش و جذبے سے سرشار ہے۔

دوسری جانب مجاہدین اسلام کا لشکر ہے۔ یہ جانثار ان اسلام افغانستان کی سنگلاخ چٹانوں سے چلے تھے، راستے کے علاقوں کو فتح کرتے ہوئے اور وہاں کے حکمرانوں کو زیر

کرتے ہوئے آج دہلی کی سرحد پر موجود تھے۔ یہ لشکر تیاری اور افرادی قوت کے لحاظ سے دشمن کے مقابلے میں بہت کم لیکن ہمیشہ کی طرح قوت ایمانی سے پوری طرح لیس ہے۔ لشکر کے جوانوں کے چہروں پر عجیب طمانیت ہے۔ وہ غلبہ اسلام کی جس خواہش کی تکمیل کے لیے اپنی جان ہتھیلی پر لے کر نکلے تھے، آج اس کا کڑا امتحان ہے۔

بالآخر جنگ کا آغاز ہوتا ہے۔ دونوں طرف سے ہراول دستے ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ تلواروں سے تلواریں ٹکراتی ہیں۔ فضا میں عجیب قسم کا شور ہے، جس میں گھوڑوں کی ہنہناہٹ غالب ہے۔ تلواروں کی جھنکار میں بار بار ''رام رام'' اور ''اللہ اکبر'' کی صدائیں بھی بلند ہو رہی ہیں، جوش دلانے والے اپنے اپنے جوانوں کو جوش دلا رہے ہیں۔ معرکہ عروج پر پہنچ جاتا ہے۔ دونوں طرف سے بڑھ چڑھ کر حملے ہو رہے ہیں۔ میدان جنگ کا نقشہ لمحہ بہ لمحہ بدل رہا ہے۔ گھمسان کا رن جاری ہے۔ اچانک مسلمانوں کا لشکر پیچھے ہٹنا شروع ہو جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے ان کے قدم اکھڑ گئے ہیں اور وہ میدان جنگ سے فرار چاہتے ہیں اس صورت حال سے ہندو فوج میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ فتح کی مسرت میں وہ بے ترتیبی کا شکار ہونے لگتے ہیں۔ مسلمان فوج مسلسل پیچھے ہٹ رہی ہے۔ مسلمانوں کے تعاقب اور انہیں قتل کرنے کے شوق میں ہندوستانی فوج کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔

اسلامی لشکر کا ذہین کمانڈر جب دیکھتا ہے کہ مطلوبہ نتائج حاصل ہو گئے ہیں تو فوج کو پلٹ کر دوبارہ حملہ کرنے کا حکم دیتا ہے لشکر کا پانچواں حصہ جس کو کمانڈر نے ابھی تک محفوظ رکھا تھا اور جنگ میں شامل نہیں کیا تھا، ہراول دستے کے طور پر حملے میں شریک ہو جاتا ہے۔ ہندو فوج مسلمانوں کے اس طرح اچانک پلٹ کر حملہ کرنے کے لیے بالکل تیار نہ تھی۔ ان کے نزدیک تو فتح ہو چکی تھی۔ بوکھلاہٹ اور حواس باختگی کا شکار ہو جانے پر ہندو فوج کے ہزاروں سپوت موت کے گھاٹ اتر جاتے ہیں۔

اب میدان جنگ کا نقشہ بدل چکا ہے۔ وہ فوج جو کچھ دیر پہلے تک فتح کی خوشی سے سرشار آگے بڑھتی چلی جارہی تھی اب گاجر مولی کی طرح کٹ رہی تھی ہندو فوج کا کمانڈر دہلی کا حکمران راجہ جس نے سارے ہندوستان کے راجوں کو جمع کیا تھا، جب پانسہ پلٹتا دیکھتا ہے

اور اسے اپنی شکست نظر آنے لگتی ہے تو وہ راہ فرار ڈھونڈنے لگتا ہے۔ آخر کار موقع ملنے پر وہ میدان کارزار سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ لیکن بدقسمتی نے اس کا دامن یہاں بھی نہیں چھوڑا۔ مسلمانوں کے لشکر میں کچھ نوجوان اسے دیکھ چکے ہیں۔ مسلمان نوجوان اس کا تعاقب کر کے اسے پکڑ لیتے ہیں۔ یہی وہ راجہ تھا جس نے مسلمانوں کو للکارا تھا اور ابھی کچھ دیر پہلے طاقت کے نشے میں اپنی فوج کے درمیان کھڑا مسلمانوں پر طعن و تشنیع کر رہا تھا۔ لیکن اب مسلمان نوجوان کے قدموں میں پڑا زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا مگر مسلمانوں کے دل میں اس اسلام کے باغی اور مسلمانوں کے قاتل کے لیے رحم کا کوئی جذبہ نہ تھا۔ باہم مشورے کے بعد اس کا سرتن سے جدا کر دیا جاتا ہے۔

یہ لڑائی آٹھ سو سال قبل 1193ء میں لڑی گئی۔ اس جنگ میں مسلمانوں کی فتح سے دہلی مسلمانوں کے زیرنگیں آیا۔ کچھ ہی عرصے بعد مسلم ریاست کی سرحدیں قنوج، گجرات، گوالیار اور بنگال تک جا پہنچیں۔

دہلی کو فتح کرنے والے اس لشکر کے سپہ سالار کا نام محمد تھا جو تاریخ میں شہاب الدین محمد غوری کے نام سے مشہور ہوا جبکہ اس کے مقابلے میں دہلی کو بچانے اور مسلم فتوحات کے سیلاب کے آگے بند باندھنے کی ناکام کوشش کرنے والے راجہ کا نام پرتھوی راج تھا۔ تمام مؤرخین حتی کہ متعصب ہندو بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ پرتھوی اپنی تمام تر قوت اور ڈیڑھ سو ریاستوں کی مدد کے باوجود افغانستان کے سنگلاخ پہاڑوں سے چلنے والے لشکر اسلام کی فتوحات کے سیلاب کو نہ روک سکا۔ دہلی کی سرحدوں اور حکومت کو مسلمانوں کے زیرنگیں آنے سے نہ بچا سکا اور وہ اس کے اتحادی اس سیلاب میں خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے۔

☆☆☆

محمود غزنوی کے دور میں جب ہندوستان میں اسلامی فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا تو راجپوت امراء کی حالت ابتر ہونے لگی۔ محمود غزنوی اور اس کی اولاد کی پے در پے لشکر کشی نے توان کو بالکل ختم کر کے رکھ دیا۔ غزنوی فاتحین نے سرہند، تھانیسر اور ہانسی وغیرہ کے مشہور قلعوں کو فتح کیا۔ لاہور اور اس کے گرد و نواح کے دیگر راجاؤں کو شکستیں دیں یہ غزنوی

فرمانروا اجمیر اور دہلی کے راجاؤں کو ختم کرنے کی سوچ ہی رہے تھے کہ دفعتاً ان کی اپنی سلطنت زوال پذیر ہونے لگی۔ چنانچہ ہندوستان پر مکمل حکمرانی کے عزائم کو سلطان شہاب الدین غوری نے عملی جامہ پہنایا۔ ہندوستان پر شہاب الدین کے حملے کا پس منظر کچھ یوں ہے۔

محمود غزنوی کی وفات کے بعد ان کے صوبیدار ہندوستان میں محمود کے مفتوحہ علاقوں پر اپنا کنٹرول قائم نہ رکھ سکے۔ چنانچہ غورستان کے صوبیدار شہاب الدین غوری نے ہندوستان کے شورش زدہ غزنوی مفتوحہ علاقوں کی طرف یلغار کی۔

سب سے پہلے 577ھ میں شہاب الدین غوری نے ملتان پر حملہ کیا۔ موجودہ اوچ شریف کے راجہ کو جب شہاب الدین کی آمد کی خبر ملی تو وہ قلعہ بند ہوگیا۔ شہاب الدین نے قلعہ کے اردگرد اپنے خیمے لگا دیئے اور تسخیر قلعہ کی کوشش کرنے لگا۔ کچھ عرصہ کے بعد اسے احساس ہوا کہ جنگ اور محاصرہ کے ذریعے قلعہ اور اہل قلعہ کو مغلوب کرنا مشکل ہے۔ لہٰذا اس نے اس میں کامیابی کے لیے ایک اور چال چلی۔ اس نے اوچھ کی رانی کے پاس اپنا قاصد بھیجا اور یہ پیغام بھجوایا کہ تیری مدد و کوشش سے قلعہ فتح ہوگیا تو میں تجھے اپنی ملکہ بنالوں گا۔ رانی پہلے ہی سے شہاب الدین سے بہت خائف تھی اور اسے یقین تھا کہ اس معرکے میں کامیابی سلطان کی ہوگی لہٰذا رانی فوراً شہاب الدین کے دام میں آگئی اور اس نے قاصد کو کہلا بھیجا کہ میری عمر تو اب ایسی نہیں رہی کہ بادشاہ کی ملکہ بنوں۔ البتہ میری لڑکی اس قابل ہے کہ وہ آپ جیسے جانباز اور سرفروش جنگجو کے عقد میں آئے۔ میں بادشاہ کے حکم کی تعمیل کروں گی یہ کہ اپنے خاوند اور راجہ کو ٹھکانے لگا کر قلعہ کی فتح کی راہ ہموار کروں گی۔ ہاں میری ایک شرط ہے کہ فتح کے بعد قلعہ پر قابض ہوکر میرے مال و متاع کو ہاتھ نہ لگائیں۔ شہاب الدین نے رانی کی یہ شرط منظور کی۔ اس کے بعد رانی نے اپنے خاوند راجہ کو زہر دے کر ہلاک اور قلعہ شہاب الدین کے حوالے کر دیا۔ شہاب الدین نے حسب شرائط راجہ کی بیٹی کو مسلمان کر کے اس کے ساتھ نکاح کیا اور پھر رانی اور اپنی دلہن کو غزنی بھیج دیا تاکہ وہاں وہ اسلامی تعلیمات سے بہرہ ور ہوسکیں۔ اس طرح شہاب الدین نے عجیب سی خوفناک حکمت عملی اپنا کر اوچھ کا

قلعہ تو فتح کرلیا لیکن دل ہی دل میں وہ رانی سے ناراض تھا کہ اس نے محض دنیوی اور نفسانی لالچ میں اپنے خاوند سے بے وفائی کی۔ بہر حال کچھ دنوں بعد رانی کا انتقال ہوگیا۔ بیٹی نے بھی شہاب الدین کی ملکہ بن کر کوئی خوشی اور سکون حاصل نہ کیا اور اپنی ماں کی وفات کے بعد اپنے والد اور والدہ کے رنج و غم میں نڈھال ہو کر مرگئی۔ شہاب الدین نے ملتان اور اوچھ کی حکومت اپنے معتمد خاص علی کرماج کو سونپی اور خود غزنی واپس آ گیا کچھ عرصہ بعد وہ پھر ہندوستان آیا اور پشاور، گجرات، لاہور اور سندھ کے بعض علاقے فتح کر کے اپنی قلمرو میں شامل کیے۔ لیکن سلطان کا اصل مقصد ہندوستان کی متحدہ قوت پرتھوی راج کے ساتھ تاریخی جنگ کرنے کا تھا۔ لہٰذا چھوٹی بڑی دوسری فتوحات کو چھوڑ کر ہم اس بڑی اور عظیم فتح کی طرف آتے ہیں۔

شہاب الدین غوری نے 587ھ میں ہندوستان پر بڑا حملہ کیا۔ اس زبردست حملے میں اس نے بھٹنڈہ کے قلعہ پر قبضہ کرلیا۔ اس زمانے میں بھٹنڈہ ہندوستان کے بڑے بڑے راجاؤں کا مرکزی شہر بن گیا تھا اور یہ شہر راجہ اجمیر کے قبضے میں تھا۔ شہاب الدین نے بھٹنڈہ کی حکومت ملک بہاؤالدین ٹونکی کے سپرد کی اور خود غزنی واپس ہونے کی تیاری میں تھا کہ اسے خبر ملی کہ رائے پتھورا (پرتھوی راج) اور کھانڈے راؤ دو لاکھ سواروں اور تین ہزار ہاتھیوں کی زبردست فوج کے ساتھ بھٹنڈہ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ یہ خبر سن کر غوری نے وطن واپسی کا ارادہ ملتوی کر دیا اور ان دونوں راجاؤں کی متحدہ قوت سے ٹکر لینے کا فیصلہ کرلیا۔ ترائن جو دہلی سے چالیس کوس کے فاصلے پر واقع تھا وہاں دریائے سرتی کے کنارے دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔ چونکہ سلطان کی فوج وطن واپسی کے موڈ میں جنگ کے لیے ذہنی طور پر پوری طرح تیار نہ تھی۔ اس لیے بے دلی کے ساتھ کچھ دیر لڑنے کے بعد میدان چھوڑنے لگی۔ جبکہ ہندوؤں کی تازہ دم فوج جو تعداد میں بھی غوری سے کئی گنا زیادہ تھی جان توڑ کر لڑی۔ چنانچہ پہلے ہی ہلہ میں مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ شہاب الدین کا میمنہ اور میسرہ (دائیں بائیں حصہ) بالکل خالی ہوگیا۔ قلب (درمیانی) میں البتہ کچھ لشکری باقی رہ گئے۔ فوج کی بے ترتیبی اور بدحالی دیکھ کر شہاب الدین کے ایک امیر نے مشورہ دیا کہ اس وقت جنگ سے کنارہ کشی

اختیار کر لی جائے۔ اس لیے کہ عام فوجیوں کے علاوہ افغانی اور خلیجی سردار جو اب تک پورے جوش و جذبے کے ساتھ لڑتے رہے، جنگ کے موڈ میں نہیں ہیں۔ اس لیے وقتی طور پر پسپائی اختیار کر کے لاہور کی طرف روانہ ہو جائیں۔ لیکن غوری نے اپنے مشیر کا مشورہ نہیں مانا۔ اس نے ہمت و جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے قلب میں باقی ماندہ سپاہیوں کی رفاقت میں دشمن پر حملہ کر دیا۔ اس معرکے میں شہاب الدین نے جانبازی کا زبردست مظاہرہ کیا۔ شہاب الدین دشمن پر تابڑ توڑ حملے کر رہا تھا کہ راجہ دلی کھانڈے راؤ کی نظر اس پر جا پڑی۔ چنانچہ اس نے اپنا ہاتھی شہاب الدین کی طرف بڑھایا لیکن اللہ کا شیر بھی غافل نہ تھا اپنا نیزہ سنبھال کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔ ہاتھی کے قریب پہنچ کر اس نے پوری قوت سے نیزہ ہاتھی کے منہ میں گھونپ دیا۔ اس ضرب کاری سے ہاتھی لڑکھڑانے لگا تو اس پر بیٹھے کھانڈے راؤ نے شہاب الدین کے بازو پر تلوار کا ایسا وار کیا کہ شہاب الدین زخم کی تاب نہ لا کر نیم بے ہوشی کے حالت میں گھوڑے سے گر گیا لیکن قریب لڑتے خلیجی سپاہی نے بڑی پھرتی سے بادشاہ کو سنبھالا اور اپنے گھوڑے پر ڈال کر میدان سے باہر محفوظ جگہ لے آیا۔ زخمی شیر اب میدان چھوڑ کر بھاگنے والے اپنے ہم وطن افغان سرداروں کی آغوش میں میدان جنگ سے بیس کوس کے فاصلے پر ایک خیمے کے اندر پڑا تھا۔ مسلمان فوجی جو ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ سب سلطان کے پاس آئے اور اپنے بادشاہ کو زندہ سلامت پا کر اطمینان کا سانس لیا۔ وفاداروں نے شہاب الدین کو کندھے پر اٹھایا اور واپس وطن روانہ ہوئے۔ وطن پہنچ کر شہاب الدین نے میدان جنگ سے بھاگنے والے افغان امیروں سے کچھ نہ کہا لیکن خلیجی اور غوری کی خوب خبر لی۔ اس نے جو اور چنے تھیلوں میں بھرے اور ان سرداروں اور جرنیلوں کے منہ پر چڑھا کر سارے شہر میں پھرایا۔ شہاب الدین نے حکم دیا کہ جو کچھ جو اور چنے نہ کھائے اسے قتل کر دیا جائے۔ بھگوڑے جرنیلوں نے اپنی جانوں کی سلامتی کو غنیمت جان کر تھیلوں میں بھرے چنے اور جو چبانے شروع کیے تب ان کی خلاصی ہوئی۔

شہاب الدین غورستان پہنچنے کے بعد غزنی روانہ ہوا۔ وہاں اس نے ہندوؤں سے شکست کا انتقام لینے کے لیے زبردست فوجی تیاریاں شروع کر دیں۔ جنگی تیاریوں کے

دوران انہوں نے دن کا چین اور رات کا آرام اپنے اوپر حرام کر دیا۔ شکست کے دوسرے ہی سال وہ ایک لاکھ سات ہزار ترکی، خلیجی اور افغان سرداروں اور سپاہیوں کا ایک زبردست لشکر لے کر ہندوستان کی طرف روانہ ہوا چونکہ اپنے سرداروں سے سلطان کا دل صاف نہ تھا اس لیے اس بار ہندوستان پر حملے کے بارے میں کسی سے کوئی مشورہ نہ کیا۔ جب عظیم الشان لشکر پشاور کے قریب پہنچا تو ایک بوڑھے امیر نے جسے بادشاہ کی خدمت میں اثر ورسوخ حاصل تھا یہ درخواست کی کہ اب تک آپ کے جانثاروں کو یہ علم نہیں ہوسکا کہ جہاں پناہ کا ارادہ کیا ہے اور کس دشمن کی تباہی و بربادی کے لیے اتنے عظیم الشان لشکر کے ساتھ ایک سفر کی زحمت گوارا فرمائی ہے۔ شہاب الدین نے جواب دیا کہ کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ جس دن سے میں نے ہندوستان سے شکست کھائی ہے اس دن سے میں نے اپنی بیوی کا منہ نہیں دیکھا، نہ لباس بدلا ہے، نہ ہی پلنگ پر سویا ہوں، نہ ہی تاج پہنچا اور نہ ہی تخت پر بیٹھا۔ سارا سال میں نے کافر ہندو سے شکست کے غم وغصے میں گزارا ہے۔ جن خلیجی اور غوری امیروں نے میری خدمات و احسانات کو نظر انداز کر کے مجھے بے یارو مددگار میدان جنگ میں چھوڑ دیا تھا میں نے ان سے سلام دعا تک گوارا نہیں کی۔ ان نمک حرام بے وفا اور غدار امیروں سے اب بھی کوئی امید نہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر میں ان آزمائے ہوئے بے وفا امیروں کے ساتھ پھر ہندوستان پر حملہ کرنے جا رہا ہوں۔

بوڑھے امیر نے بادشاہ کی یہ بات سن کر بڑے ادب سے کہا اللہ تعالیٰ آپ کو کامیاب کرے۔ مجھے امید ہے کہ گزشتہ جنگ میں آپ سے بے وفائی کرنے والے امیر اپنے اس گناہ اور جرم پر نادم وشرمسار ہیں۔ اب کی بار وہ ایسا نہیں کریں گے۔ آپ کا پورا پورا ساتھ دیں گے۔ اپنے دامن پر سابقہ بزدلی کے لگے داغ دھو ڈالیں گے۔ ساتھ ہی میری درخواست ہے، بوڑھے امیر نے کہا کہ آپ اپنے امیروں کا قصور معاف کر دیں اور انہیں شرف باریابی عطا کریں۔ آپ کا یہ حسن سلوک انہیں اپنے گناہوں پر نادم کرے گا اور آمدہ جنگ میں یہ حق نمک ادا کریں گے۔

شہاب الدین کو بوڑھے امیر کی یہ بات پسند آئی۔ اسی وقت دربار عام منعقد کیا۔

معتوب امیروں کو گرانقدر خلعتوں سے نوازا ان کی گذشتہ خطاؤں کو معاف کر کے ان سے آئندہ وفاداری کا عہد لیا۔

دوسرے روز شہاب الدین اس مقام کو خیر باد کہہ کر آگے بڑھا اور منزل بہ منزل سفر کرتا ہوا ملتان پہنچا۔ یہاں شہاب الدین نے ان امیروں کے مرتبوں میں اضافہ کیا۔ جنہوں نے ان کی عدم موجودگی میں خیر خواہی اور نمک حلالی کا دامن نہ چھوڑا تھا اور اس ہنگامہ خیز زمانے میں لاہور کے مسلمان سالاروں کی مدد کرتے رہے تھے تاکہ وہ گردوپیش کے راجاؤں کے ساتھ بڑے سخت مقابلہ میں سلطان کا ساتھ دے سکیں۔ شاہی لشکر جب لاہور پہنچا تو شہاب الدین نے اپنے ایک معتمد خاص امیر جس کا نام رکن الدین حمزہ تھا کو اجمیر روانہ کیا اور اس کے توسط سے اجمیر کے راجہ اور اس کے باشندوں کو اسلام کی دعوت دی۔ رائے پتھو رایہ دعوت پا کر غصے میں سیخ پا ہوا اور اس کے جواب میں سخت لہجے میں سلطان کو غلیظ گالیوں سے نوازتے ہوئے میدان جنگ میں للکارا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ہندوستان کے تمام راجاؤں کو اپنی مدد کے خطوط لکھے۔ جواب میں ہندوستان کے سبھی راجاؤں نے رائے پتھورا (پرتھوی راج) کا ساتھ دینے کا عہد کیا اور اپنے اپنے لشکر لے کر اس کی مدد کے لیے چل پڑے۔ چند دنوں کے اندر تمام ہندوستانی راجے رائے پتھورا کے گرد جمع ہو گئے۔ رائے پتھورا تین لاکھ راجپوتوں اور افغانوں کا عظیم الشان لشکر لے کر شہاب الدین کا مقابلہ کرنے کے لیے آگے بڑھا۔ دریائے سرستی کے کنارے ترائن کے مقام پر دونوں لشکر آمنے سامنے ہوئے۔ ہندوستان بھر کے ڈیڑھ سو سوار راجپوت راجاؤں نے بہادری کا ٹیکہ (نشان) اپنی پیشانیوں پر لگایا اور انتہائی دلیری و جرأت سے کام لینے اور مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے کی قسمیں کھائیں۔ ان راجاؤں نے آپس میں عہد کیا کہ جب تک مسلمانوں کو بالکل ختم نہ کر لیں گے اس وقت تک اپنی تلواریں نیام میں واپس نہ لے جائیں گے اور اس میدان جنگ میں اپنے اپنے کمالات کا ایسا مظاہرہ کریں گے کہ دنیا میں ہمیشہ کے لیے نام باقی رہے یہ راجے چونکہ شہاب الدین کو ایک مرتبہ شکست دے چکے تھے اس لیے ان کے حوصلے بہت بلند تھے۔

اُن راجاؤں نے آپس میں طے کیا کہ آغاز جنگ سے پہلے شہاب الدین کو ایک ہدایت نامہ بھیجا جائے۔ انہوں نے سلطان کو ایک خط لکھا جس کا مضمون تھا۔

''ہم ہندو راجاؤں کے عظیم الشان لشکر کی کیفیت تمہیں معلوم ہی ہوگی۔ ہمارے ساتھ جس قدر لشکر ہے وہ تمہیں اور تمہاری ننھی منی فوج کو تہس نہس کر دینے کے لیے کافی ہے۔ لیکن ابھی ہندوستان کے دوسرے علاقوں سے بھی مزید افواج کی آمد جاری ہے۔ جن کے قدموں سے زمین کا سینہ کانپ رہا ہے اگر تمہیں اپنی جان عزیز ہے تو اپنے سپاہیوں کی غریب الوطنی پر ترس کھاؤ۔ ہم سے لڑنے کا ارادہ ترک کرکے واپسی کی راہ لو۔ ہم تم سے کسی قسم کا تعرض نہیں کریں گے اور تمہارا راستہ نہیں روکیں گے۔ ہم تم پر ترس کھاتے ہوئے تمہیں واپس لوٹ جانے کا نیک مشورہ دیتے ہیں ورنہ یاد رکھو کل صبح ہم اپنے تین ہزار ہاتھیوں پر سوار بے شمار جنگجوؤں کے ساتھ میدان جنگ میں تمہارا حشر کر دیں گے۔''

شہاب الدین نے راجاؤں کا یہ خط پڑھ کر دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے یہ جواب بھجوا دیا۔

''مجھے اس امر کا پورا پورا احساس ہے کہ آپ کا خط محبت اور ہمدردی کے جذبات سے معمور ہے۔ میں آپ کی ہدایت (کہ واپس چلا جاؤں) پر عمل ضرور کرتا لیکن کیا کروں مجبور ہوں۔ اپنے بھائی کا محکوم اور تابع فرمان ہوں اور اسی کے حکم کی تعمیل میں یہاں تک آپ کے مقابل آیا ہوں۔ آپ مجھے مہلت دیں تاکہ میں اپنے قاصد کو بھائی کے پاس بھیج کر آپ کے لشکر کی کثرت وقوت کا حال بیان کرکے اپنی کمزوری بتا سکوں۔ مجھے یقین ہے کہ اس شرط پر صلح ہو سکتی ہے کہ سرحد، پنجاب اور ملتان پر تو غوریوں کا قبضہ رہے اور باقی تمام ہندوستانی علاقے آپ کی حکومت میں چھوڑ دیئے جائیں۔''

ہندو راجاؤں نے شہاب الدین کے اس جواب سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مسلمانوں کا لشکر واقعی بہت کمزور اور پریشانی کی حالت میں ہے۔ لہٰذا وہ اپنی قوت وکثرت کے نشے میں سرشار

ہوکر مسلمانوں کی طرف سے بالکل غافل ہوگئے۔ جب شہاب الدین نے اچھی طرح اطمینان کرلیا کہ ہندو راجے غفلت میں پوری طرح مبتلا اور عیش وعشرت میں مشغول ہیں تو اس نے راتوں رات اپنا لشکر مرتب کیا اور صبح سویرے جبکہ راجپوت سپاہی قضائے حاجت اور غسل وغیرہ میں مصروف تھے اچانک ان پر ہلہ بول دیا۔ ہندوؤں کا لشکر جو اس ناگہانی آفت سے بالکل بے خبر و غافل تھا افراتفری میں جنگ کی تیاری کرنے لگا لیکن غوری نے انہیں سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ اسے علم تھا کہ ہندو راجاؤں نے لڑنے مرنے کا عزم کر رکھا ہے۔ لہٰذا اس نے اپنی فوج کو چار حصوں میں تقسیم کیا اور ہر حصے کو یہ ہدایت کی کہ باری باری ہندوؤں سے لڑائی کرے۔ شہاب الدین نے اپنی فوج کے ان حصوں کے سرداروں اور لشکریوں کو یہ ہدایت بھی کی کہ جب ہندوستانی ہاتھیوں کی قطاریں مسلمانوں پر حملہ آور ہوں تو یہ لوگ اپنے آپ کو جھوٹ موٹ کی نمائشی فرار کی راہ اختیار کریں۔ جب ہندوستانی لشکر کے سپاہی تمہارا پیچھا کرتے ہوئے اپنی حدود سے تھوڑا باہر نکل آئیں تو مسلمان لشکری پلٹ کر اچانک اس پر جوابی حملہ کریں اور اپنے نیزوں اور تلواروں کی جانگداز ضربوں سے دشمن کو موت کے گھاٹ اتار دیں۔ اسلامی لشکر اپنے سردار اعلیٰ غوری کی اس ہدایت کے مطابق صبح سے لے کر عصر تک دشمن سے لڑتا رہا۔ لیکن باوجود ہر طرح کی کوشش کے ہندوؤں کے قدم میدان سے نہ اکھڑے۔ جب شہاب الدین نے دیکھا کہ یہ تمام دن یونہی بے کار گزرا جارہا ہے تو اس نے اپنی کمان میں بارہ ہزار سواروں کے ساتھ جو اب تک تازہ دم تھے یکدم اچانک حملہ کرنے کا حکم دیا۔ یہ حملہ ایسا زبردست تھا کہ ہندوؤں کے قدم میدان جنگ سے اکھڑ گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے کھانڈے راؤ اور دوسرے بہت سے ہندو راجے ہلاک ہوگئے۔ رائے پتھورا بچ بھی نکلا لیکن منتشر و مایوس فوج کے ساتھ بھاگ کھڑا ہوا لیکن وہ ابھی تھوڑی دور ہی گیا ہوگا کہ دریائے سرستی کے کنارے مسلمان لشکریوں نے اسے گرفتار کرکے شہاب الدین کے سامنے لا کھڑا کیا۔ جس نے اس کا سر اپنے ہاتھ سے قلم کیا۔

اس طرح شہاب الدین غوری ہندوستان بھر سے جمع درجنوں ہندو راجاؤں کی مشترکہ فوج کو عبرتناک تاریخی شکست دینے کے بعد فتح و کامرانی کے ڈنکے بجاتا واپس غزنی لوٹ

گیا۔

لاہور میں قیام کے زمانے میں شہاب الدین کو معلوم ہوا کہ غیر مسلم گکھڑوں نے جو دریائے سندھ سے لے کر کوہ سوالک کے دامن تک علاقے میں آباد تھے، ہنگامے برپا کرر کھے ہیں۔ وہ اس حد تک ظالم اور متعصب تھے کہ ان کے اس پاس کی آبادی ان کے ظلم وستم سے عاجز آ چکی تھی۔ خاص طور پر پشاور اور اس کے اردگرد کے مسلمانوں کا تو انہوں نے جینا ہی دوبھر کر دیا تھا۔ ان بے دین و بے مذہب گکھڑوں نے خدا پرست مسلمانوں کے لیے پنجاب کا سفر بھی مشکل بنا دیا تھا یہ لوگ کسی مذہب یا اخلاق کے پابند نہ تھے۔ اپنی جواں سال بالغ لڑکیوں کے ساتھ تو ان کا سلوک انتہائی غیر مہذبانہ بلکہ کمینہ پن تھا۔ ان کے ہاں رواج تھا کہ جب ان کی لڑکی جوان ہوتی تو اس کا باپ یا بھائی اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے مکان کے دروازے پر آ کھڑا ہوتا اور راہ چلنے والوں کو اپنی لڑکی فروخت کے لیے پیش کرتا۔ اگر خوش قسمتی سے کوئی راہ گیر اس لڑکی کو پسند کر کے خرید لیتا تو منہ مانگے دام لے کر یہ لڑکی اس کے حوالے کر دی جاتی۔ ورنہ اس معصوم بچی کو وہیں موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔ ان لوگوں میں یہ دستور بھی تھا کہ ایک عورت کئی کئی شوہروں کی زوجہ ہوتی جو شوہر اس عورت کے گھر جاتا وہ باہر دروازے پر اپنا نشان لگا جاتا کہ دوسرے شوہروں کو اس کی موجودگی کا علم رہے۔ ایسے عالم میں کوئی دوسرا شوہر عورت کے مکان پر آتا تو نشان دیکھ کر اندازہ کر لیتا کہ اس وقت عورت تنہا نہیں ہے۔ لہٰذا وہ فوراً واپس چلا جاتا الغرض یہ بے غیرت گندی قوم ایک زمانہ تک اسی وحشیانہ انداز کی زندگی بسر کرتی رہی۔

شہاب الدین کا دوسری فتوحات کے علاوہ یہ عظیم الشان کارنامہ بھی تاریخ کا روشن باب ہے کہ اس نے اس ظالم و وحشی قوم کو اسلام کی رحمتوں بھری آغوش میں پناہ دی۔ واقعہ یہ ہوا کہ سلطان کے آخری زمانے میں ایک متقی پرہیزگار مسلمان گکھڑوں کے ہاتھوں گرفتار ہوا۔ اس نیک نفس خدا پرست انسان نے ان بے دین وحشیوں کو مذہب اسلام کی خصوصیات سے آگاہ کیا۔ خوش قسمتی سے گکھڑوں کے امیر کو یہ باتیں پسند آ گئیں۔ اس نے اس پاکباز مسلمان سے پوچھا کہ اگر میں اسلام قبول کرنے کے لیے سلطان شہاب الدین کی خدمت

میں حاضر ہوں تو وہ میرے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔؟ اس مسلمان نے جواب دیا میں یقین دلاتا ہوں کہ ہمارے بادشاہ تجھے اس عالم میں دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔ چنانچہ اس گکھڑ سردار کو اسلام پر آمادہ پا کر اس مسلمان بزرگ نے ایک خط میں سلطان کو اس صورتحال سے باخبر کیا۔ یہ خط ملتے ہی سلطان شہاب الدین نے ایک مرصع کمر بند اور گراں بہا خلعت گکھڑ سردار کو بھجوائی اور اسے اپنے دربار میں طلب کیا۔ اس طرح سلطان اور اس کے امراء کے روبرو یہ وحشی سردار مشرف بہ اسلام ہوا۔ شہاب الدین نے خوش ہو کر اسے گلے لگایا اور پھر اس کے نام کوہستانی علاقوں کی فرمانروائی کا پروانہ جاری کر دیا۔ گکھڑ سردار کے مسلمان ہونے پر اس کا پورا قبیلہ مسلمان ہو گیا۔ البتہ تھوڑے گکھڑ اپنے سردار کے مسلمان ہونے پر خفا ہوئے اور یہ ناراضگی تعصب اور دشمنی اس قدر بڑھی کہ انہوں نے دھوکے سے سلطان کو شہید کر دیا۔

گکھڑوں کی قوم میں بیس افراد سلطان سے سخت نالاں تھے کیونکہ سلطان نے ان کے عزیزوں کو قتل اور خود ان کو بے گھر کر دیا تھا۔ اسی سبب بیس نے مل کر شہاب الدین غوری کے قتل کا منصوبہ بنایا۔ جس دن سلطان دریائے سندھ کے کنارے ایک مقام پر خیمہ زن ہوا اس کے دوسرے روز یہ گکھڑ کسی نہ کسی طرح شاہی خیمے تک پہنچ گئے۔ اس وقت شاہی لشکر وہاں سے کوچ کی تیاری کر رہا تھا۔ ایک گکھڑ سلطان کے خیمے کے پہریدار کے پیٹ میں چھرا گھونپ کر فرار ہو گیا۔ دربان کے زخمی ہونے پر چاروں طرف ایک شور سا مچ گیا۔ شاہی خدمت گار بھی سلطان کے خیمے کی حفاظت چھوڑ کر زخمی دربان کے گرد جمع ہو گئے۔ جب باقی 19 گکھڑوں نے دیکھا کہ اس وقت شاہی خیمہ خالی ہے اور تمام محافظ اپنے بادشاہ کو تنہا چھوڑ کر زخمی دربان کے گرد جمع ہو گئے ہیں تو وہ ہاتھوں میں چھرے اور خنجر لیے ہوئے بادشاہ کی خواب گاہ میں گھس آئے۔ شہاب الدین ابھی اٹھنے کی تیاری کر رہا تھا کہ ان سفاکوں نے اس پر حملہ کر دیا۔ چھروں اور خنجروں کے پے در پے وار کر کے انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا۔

اس طرح اس عظیم فرمانروائے غورستان کی المناک شہادت کا حادثہ رونما ہو گیا۔ سلطان کی شہادت سے فتوحات کا وہ سلسلہ رک گیا جس نے محمود غزنوی کے بعد ہندوستان کے ہندو راجاؤں کے غرور و تکبر کا بت پاش پاش کرتے ہوئے ہندوستان میں مسلمانوں کی آئندہ ایک

ہزار سالہ حکومت کی راہ ہموار کی تھی۔

سلطان شہاب الدین غوری ایک رحم دل، خدا ترس اور انصاف پسند بادشاہ تھا۔ وہ علم وادب سے بھی گہری دلچسپی رکھتا تھا۔ علماء کی صحبت میں بیٹھنے کو اپنے لیے باعث فخر سمجھتا تھا اور ان کی عزت اور خدمت کرنے کو وہ اپنا فرض منصبی سمجھتا تھا۔ وہ قول کا پکا، کردار کا سچا، تلوار کا دھنی اور دل کا غنی حکمران تھا۔

وہ ظالم کے لیے سیف بے نیام اور مظلوم کے لیے امن کا پیغام تھا۔ وہ صبر و استقامت کا ایسا پہاڑ تھا جس کی مضبوط چٹانوں سے برصغیر کا سارا کفر اپنا سر ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا۔

❀❀❀



سلطان محمد فاتح رح

سلطان کا عہد ہر اعتبار سے ایک مثالی عہد تھا. یہ عہد ایک طرف فتوحات کے لئے مشہور ہے تو دوسری طرف علم وادی کی ترقی اور تہذیب وثقافت میں ممتاز ہے یہی وجہ ہے کہ دنیا کے تمام مسلمان سلطان محمد فاتح کا نام بڑے احترام سے لیتے ہیں اور اسے ملت اسلامیہ کا عظیم ہیرو قرار دیتے ہیں

فاتح قسطنطنیہ کی عزم وہمت کے انمٹ نقوش

ہم خشکی کے راستے اپنے بحری جہاز سمندر میں پہنچائیں گے اور بندرگاہ پر حملہ کریں گے۔

یہ ناممکن ہے ..... یہ کیسے ہوسکتا ہے..... یہ تو ممکن نہیں۔ بادشاہ کی بات تمام درباریوں کے منہ سے بے ساختہ یہ جملے نکلنے لگے۔ کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ بندرگاہ اوران کے درمیان دس میل خشکی کا خطہ ہے اور اسے بحری جہازوں کے ذریعے طے کرنا ممکنات میں نظر نہیں آتا۔ لیکن بادشاہ کا حکم تھا اور اس سے انحراف بھی ممکن نہ تھا لہٰذا تدابیر سوچی جانے لگیں۔ اور پھر بادشاہ کی تجویز پر ہی اس بظاہر ممکن نظر نہ آنے والے منصوبے پر کام شروع کر دیا گیا اور اس منصوبے کی تکمیل نے دنیا کو حیران کر دیا اور اسی وجہ سے اس بادشاہ کا نام تاریخ اسلامی میں امر ہوگیا، اور کیوں نہ ہوتا یہ منصوبہ قسطنطنیہ کی فتح کا منصوبہ تھا جس کے فاتحین کو اللہ کے آخری رسول نے جنت کی بشارت دی تھی۔ اس سعادت کو حاصل کرنے والے یہ بادشاہ سلطان محمد فاتح تھے۔ جن کے ہاتھوں قسطنطنیہ فتح ہو کر اسلامی ریاست میں داخل ہوا اس کا موجودہ نام استنبول ہے اور یہ ترکی کا مشہور شہر ہے۔

سلطان محمد فاتح 20 اپریل 1429ء کو پیدا ہوا۔ سلطان مراد ثانی نے اپنے بیٹے کی تعلیم وتربیت کا معقول انتظام کیا اور مروجہ علوم وفنون کی تدریس کے لیے چوٹی کے علماء وفضلاء مقرر کیے۔ سلطان محمد فاتح خداداد ذہانت کا حامل تھا لہٰذا اس نے شروع ہی سے علم وفن کے حصول میں بڑے ذوق وشوق سے حصہ لیا اور اپنی ذہانت اور اعلیٰ صلاحیتوں سے استادوں کو حیرت میں ڈال دیا۔ اپنی مادری زبان ترکی کے علاوہ جلد ہی اس نے فارسی، عربی اور یونانی زبانیں سیکھ لیں اور لاطینی زبان سے بھی اچھی خاصی واقفیت حاصل کر لی اور مذہب کے ساتھ، یونانی فلسفے، مشرقی تہذیب وثقافت اور تاریخ کے موضوعات پر بھی اپنا مطالعہ جاری رکھا۔ اس کے ساتھ ساتھ جنگی علوم وفنون سے تو اسے خاصی دلچسپی تھی۔ زمانہ طالب علمی جنگی ایجادات اور فوجی اصول وقواعد سمجھنے اور سیکھنے میں وہ بڑے ذوق اور شوق کا مظاہرہ کیا کرتا تھا۔ سلطان محمد فاتح کو 24 برس کی عمر میں ہی اپنے عظیم باپ سلطان مراد ثانی کی وفات کا صدمہ برداشت کرنا پڑا۔

باپ کی وفات کے بعد جب وہ تخت پر بیٹھا تو اس کی عمر چوبیس برس تھی مگر ارادے بہت بلند تھے پڑوسی ملک کا طاقت ور بادشاہ قسطنطین اس غلط فہمی میں مبتلا ہوگیا کہ سلطان ناتجربہ کار اور نوعمر ہے لہٰذا اس نے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ سلطان کا ایک رشتہ دار ''ارخان'' پڑوسی ملک میں پناہ حاصل کر چکا تھا اور ایک عرصے سے قسطنطین اس کا وظیفہ وصول کیا کرتا تھا لالچی بادشاہ نے اچانک مطالبہ کیا کہ وظیفہ دگنا کر دیا جائے۔ سلطان محمد فاتح کو یہ بات بہت ناگوار گزری، اس نے گرج کر کہا ''اس احمق بادشاہ کو وظیفے کی بجائے میں ایسا سبق سکھاؤں گا کہ ساری دنیا حیران رہ جائے گی۔'' قسطنطنیہ دنیا کا بہت بڑا تجارتی مرکز تھا۔ شاہ قسطنطین کے پاس فوج اور دولت کی کثرت تھی لہٰذا وہ کسی کو خاطر میں نہ لاتا۔ سلطان محمد فاتح تو پہلے ہی اس شہر کو فتح کرنے کے لیے بے چین تھا۔ لالچی بادشاہ نے وظیفے کا ذکر چھیڑ کر گویا اپنی موت کو دعوت دی۔ شاید اسے یہ غلط فہمی تھی کہ بار بار کوشش کے باوجود مسلمان اس شہر کو فتح کرنے میں ناکام رہے تھے لہٰذا یہ نوعمر سلطان کیا کر لے گا۔ سلطان نے زور شور سے جنگی تیاریاں شروع کر دیں۔ قسطنطنیہ سے پانچ میل کے فاصلے پر اس نے ایک زبردست قلعہ تعمیر کرایا اور

اس میں جنگی ساز و سامان جمع کرنا شروع کیا۔ دشمن فوج نے ایسا منہ توڑ جواب دیا حملہ آور دم دبا کر بھاگ گئے۔ پھر سلطان نے ہمسایہ ملکوں سے دوستانہ معاہدے کیے، ہنگری کے ایک انجینئر نے اس زمانے کی سب سے بڑی توپ بنا کر دی۔ ترکی کے اپنے کاریگروں نے ایک بہت بڑا لکڑی کا قلعہ بنایا جسے ہر جگہ لے جایا جا سکتا تھا۔ تین سو جنگی جہازوں کا بحری بیڑہ تیار کیا گیا۔

ادھر شاہ قسطنطین بھی بے خبر نہیں تھا۔ اس نے یہ چال چلی کہ شہر کی بندرگاہ کو جو سمندری راستہ جاتا تھا اس میں لوہے کی موٹی موٹی زنجیریں ڈلوا کر بحری جہازوں کا راستہ ہی بند کر دیا۔ دوسری طرف قسطنطین کے بڑے بڑے جنگی جہاز کھڑے ہو گئے تا کہ اگر کوئی ان زنجیروں کو کاٹنے کی کوشش کرے تو اسے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ گویا پہلے اگر قسطنطنیہ کی فتح مشکل تھی تو اب ناممکن ہو گئی تھی۔ مگر سلطان قسطنطنیہ کی فتح سے متعلق حدیث نبوی اور اپنے اسلاف کی کوششوں سے بھی بخوبی آگاہ تھا اور اسی وجہ سے وہ ہر حال میں یہ شہر فتح کرنا چاہتا تھا۔

سلطان محمد فاتح قسطنطنیہ کے اردگرد قدم جمانے اور محاصرے کی ممکنہ رکاوٹیں دور کرنے کے ساتھ ساتھ آزمودہ کار مجاہدین کے دستے تشکیل دے رہا تھا اور ان کے لیے تمام سامان اپنی ذاتی نگرانی میں مہیا کرنے کی مہم میں لگا ہوا تھا۔ قسطنطنیہ یورپی دنیا کا وہ سیاسی و مذہبی مرکز تھا جسے فتح کرنے کے لیے روایتی جنگی تیاریاں کافی نہ تھی۔ سلطان کو اس امر کا احساس تھا اور وہ اپنی غیر معمولی عسکری ذہانت (رضی اللہ عنہم رضی اللہ عنہا رحمہ اللہ رضی اللہ عنہ علیہا السلام رحمۃ اللہ علیہ علیہ السلام V رحمۃ اللہ علیہ علیہ السلام علیہا السلام ﷺ رحمۃ اللہ علیہ) کو کام میں لاتے ہوئے کوئی ایسی تدبیر سوچ رہا تھا ج اس کے حریف کو ششدر اور حیرت زدہ کر کے رکھ دے اور اسے سنبھلنے کا موقع اس وقت تک نہ ملے جب تک شکست کی مضبوط پکڑ اس کو چیت نہ کر دے۔ جنگ میں کامیابی کے لیے کچھ تو قسمت کا اچھا ہونا بھی ضروری ہے۔ آسمان و زمین کے مالک ربّ کائنات سے مدد کی دعا سلطان کا دائمی معمول تھا۔ جنگ کے لیے روانہ ہونے سے پہلے اس نے اپنے تمام مجاہدین کے ساتھ مل کر دو رکعت نماز پڑھی اور عاجزی و زاری کے ساتھ خصوصی دعا کی۔

علاوہ ازیں وہ امور حرب کے بارے میں مسلسل استخارہ کرتا تھا۔ کامیاب کمانڈر کے لیے ایسی تخلیقی سوچ بھی ضروری ہے جو اسے روایتی طریقوں سے ہٹ کر انقلابی ایجاد کرنے کی رہنمائی کرے ورنہ وہ اپنی قوم کو فتح کا تحفہ نہیں دے سکتا۔ قدرت نے سلطان کو اس نعمت سے بھرپور نوازا تھا اور اسے ایسی ناقابل تسخیر قوت ارادی دی تھی جو ناممکن کو ممکن کر دکھاتی ہے۔ اس نے اپنی زنبیل سے یکے بعد دیگرے ایسے تین داؤ برآمد کیے جو اس سے پہلے جنگ کے میدانوں میں نہ کھیلے گئے تھے۔

سب سے پہلے اس نے قسطنطنیہ کی مضبوط فصیلوں کو توڑنے کے لیے خاص طور پر بھاری توپیں بنوائیں جن کی اس زمانے میں نظیر نہ تھی۔ مؤرخین کا دعویٰ ہے کہ دنیا کی تاریخ میں قلعہ بند شہر کو توڑنے کے لیے توپوں کا استعمال پہلی مرتبہ قسطنطنیہ میں ہوا تھا۔ سلطان نے ہنگری کے ایک انجینئر کی خدمات حاصل کر کے ایسی توپ ڈھالی تھی جو 300 کلووزن کا گولہ ایک میل سے دور تک پھینکتی تھی۔

پھر اس نے پہیوں پر چلنے والے لکڑی کے اونچے اونچے مینار بنوائے جو شہر کی فصیل جتنے اونچے تھے۔ ان کے سرے سے پر برج کی شکل کا مورچہ ہوتا تھا اس میں مجاہد بیٹھتے تھے۔ ان میناروں کے ساتھ لمبی سیڑھی بندھی ہوتی جس کو خندق کے پار قلعے کی فصیل پر رکھ کر پل سا بنالیا جاتا اور شہر کی دیوار پر اترنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ قسطنطنیہ والوں نے جنگ کی غیر معمولی تیاری کی تھی۔ وہ توپوں سے منہدم ہونے والی فصیل کی جلدی سے مرمت کر دیتے تھے اور مٹی کے تیل سے جلتے ہوئے گولے لکڑی کے بُرجوں پر پھینک کر انہیں آگ لگا دیتے تھے لیکن سلطان اپنی دھن کا پکا تھا، اس نے محاصرے کے دوران ایک تیسری تدبیر سوچی جو ایسی دلچسپ و عجیب، ناقابل یقین اور انوکھی تھی کہ سلطان کی ذہانت وفراست پر زمانہ آج تک انگشت بدنداں ہے اور اس کی سوجھ بوجھ اور عزم وہمت کی داد دیتا ہے۔

قسطنطنیہ کا شہر مثلث نما ہے جس کے دو حصے پانی میں گھرے ہوئے تھے۔ شمال میں شاخ زریں (Golden Horn)، اس کے معنی ہیں ''سنہرا سینگ'' اس خلیج کی شکل سینگ کی سی تھی اور دھوپ پڑنے سے اس کا رنگ سنہرا ہو جاتا تھا اس لیے اسے ''گولڈن ہارن'' کہتے ہیں۔

اس کے ایک طرف کی آبادی کا نام غلطہ اور دوسری طرف کا استنبول تھا۔ غلطہ کو اب قاسم پاشا کہتے ہیں) اور جنوب میں بحر مرمرہ تھا۔ بڑی فوجیں صرف مشرق سے حملہ کر سکتی تھیں لیکن اس جانب سے یکے بعد دیگرے تین مضبوط دیواریں شہر کی حفاظت کر رہی تھیں۔ جن کے اوپر ⑩⑦① فٹ کے فاصلے سے برج بنے ہوئے تھے اور بیچ میں ⑩⑥فٹ چوڑی اور ⑩⑩① فٹ گہری خندق کھدی ہوئی تھی۔ سمندر کی جانب سے شاخ زریں کے دہانے پر مضبوط آہنی زنجیرہ بندھا ہوا تھا۔ جس کے ہوتے ہوئے کوئی جہاز اندر نہ آ سکتا تھا۔ جنگ کے دنوں میں اس کی حفاظت ۸ بڑے اور ۲۰ چھوٹے جہاز کر رہے تھے۔ اس طرح اس کو بجا طور پر دنیا کا سب سے زیادہ مستحکم اور مضبوط قلعہ سمجھا جاتا تھا۔ سلطان نے محاصرے کے ابتدائی ایام میں اندازہ لگالیا کہ جب تک شاخ زریں کی خلیج جو آبنائے باسفورس سے بطور شاخ قسطنطنیہ کے ساتھ چند میل چلی گئی ہے کی طرف سے حملہ نہ ہوگا، شہر فتح نہ ہو سکے گا......

لیکن اس خلیج کے دہانہ پر زبردست بحری قوت مدافعت کے سبب اس میں داخل ہونے کا سوچا بھی نہ جا سکتا تھا۔ سلطان اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ مسلسل دعاؤں اور استخارے کی بدولت قدرت نے اس کی دستگیری کی اور اس کی ذہانت نے ایک دلیرانہ اور ناقابل یقین حد تک حیرت انگیز فیصلہ کر کے راتوں رات اس پر کامیابی سے عمل بھی کر ڈالا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اپنے ہلکے جہازوں اور فوجی گوداموں (گولہ بارود اور سامان کے ذخیروں) کو خشکی کے راستے باسفورس کی بندرگاہ کے بالائی حصے میں منتقل کر دیا جائے۔ یہ راستہ تقریباً دس میل کا تھا۔ اس کی زمین اونچی نیچی ناہموار تھی، جگہ جگہ درختوں کے چھوٹے بڑے جھنڈ اور ٹیلے تھے مگر سلطان کا عزم وارادہ ایسا مضبوط اور اس کے ساتھی ایسے جانثار اور فرمانبردار تھے کہ انہوں نے بظاہر ناممکن نظر آنے والی تجویز کو ممکن کر دکھایا۔

سلطان نے لکڑی کے تختے چربی ملوا کر بچھوائے اور ۱۲ جمادی الاول ۸۵۷ھ بمطابق ۲۲ اپریل ۱۴۵۳ء کی رات ۷۰ جنگی کشتیاں خشکی پر چلا کر ''گولڈن ہارن'' کے اندر لا پہنچائیں۔ اس دوران غیر متوقع حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے ہر قسم کے انتظامات کیے گئے تھے، سلطان کا بحری بیڑہ دشمن کو مصروف رکھنے کے لیے مسلسل گولہ باری بھی کر رہا تھا لیکن خشکی

پر جہاز چلانے کا یہ کام اتنی پھرتی اور تیزی سے ہوا کہ بازنطینیوں کو مداخلت کرنے بلکہ اس منصوبے کو سمجھنے تک کا موقع ہی نہ ملا۔ صبح اٹھ کر جب انہوں نے فصیل سے نیچے نظر ڈالی تو ان کی حیرت اور خوف کی انتہا نہ رہی کہ نسبتاً چھوٹی اور ہلکی عثمانی کشتیاں گولڈن ہارن کے وسط میں تیر رہی تھیں اور بڑے بڑے بازنطینی جہاز دور کھڑے حسرت و بے بسی سے انہیں تک رہے تھے کیونکہ خلیج کے اتھلا ہونے کے سبب وہ ان کے قریب بھی نہ آ سکتے تھے۔ مؤرخین اور عسکری تجزیہ نگاروں نے سلطان کی اس تدبیر کو ایسا عظیم الشان اور غیر معمولی کارنامہ قرار دیا ہے جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ ایک جرمن مؤرخ اسٹیفن زویگ نے اسے انسانی تاریخ کا بے مثال واقعہ (Almost Without Parallel in History) قرار دینے کے بعد معجزوں کا معجزہ (The Miracle of Miracles) کہا ہے لیکن یہ تبصرہ صحیح نہیں، اس لیے کہ معجزہ تو وہ انوکھا اور غیر معمولی واقعہ ہوتا ہے جو کسی نبی کے ہاتھ پر ظاہر ہو۔ انبیاء کرام علیہم السلام کے علاوہ کسی اور شخص کے ہاتھ پر کوئی ایسی چیز ظاہر ہو تو اگر وہ نیک ہے تو کرامت اور بد ہے تو استدراج (مہلت) کہلاتی ہے۔ لیکن ان تینوں میں ظاہری اسباب اختیار نہیں کیے جاتے، لہٰذا سلطان کا یہ کارنامہ معجزہ یا استدراج تو ہرگز نہیں لیکن کرامت بھی نہیں، یہ تو اس کے اعلیٰ دماغ، اس کے انجینئروں کی مہارت اور رضا کاروں کی محنت کا ثمرہ ہے۔

محاصرے کو 51 دن گزر گئے تھے اور سلطان نے ہر طرف سے اپنی گرفت مضبوط کر لی تھی۔ اب آخری اور فیصلہ کن حملے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس سے قبل اہل شہر کو جاں بخشی کے وعدے پر ہتھیار ڈالنے کا پیغام بھیجا گیا مگر انہوں نے اپنے زعم میں دفاع کی بھرپور تیاریاں کر رکھی تھیں۔ ویسے بھی ان کا سردار دلیر اور بہادر آدمی تھا۔ (مسلم مؤرخین نے دل کھول کر اس کی شجاعت کی تعریف کی اور داد دی ہے) اس نے خراج دینا قبول کیا لیکن شہر حوالے کرنے کی تجویز قبول نہ کی لہٰذا سلطان نے ۱۸ جمادی الاول ۸۵۷ھ ۲۷ بمطابق مئی ۱۴۵۳ء کو سلطان نے آخری جنگی مشاورت بلائی اور اگلے دن علی الصبح عام حملے کا اعلان کر دیا گیا۔ یہ رات سلطان سمیت تمام عثمانی مجاہدین نے ذکر و عبادت میں گزاری۔ مؤرخین کے مطابق عثمانی لشکر

میں جگہ جگہ ذکر کے حلقے لگے ہوئے تھے اور وہ تسبیح ومناجات، تکبیر وتہلیل اور ذکر جلی وخفی میں مصروف تھے۔ ان میں جوش وولولہ اور عزم وہمت کی غیر معمولی لہر دوڑی ہوئی تھی۔

اگلے دن آخری معرکہ شروع ہوا۔ محصور بازنطینیوں نے غیر معمولی بہادری کا مظاہرہ کیا۔ دونوں طرف سے آگ اور خون کی بارش ہو رہی تھی۔ عزم مصمم کا ٹکراؤ عزم مصمم سے ہو رہا تھا۔ حملہ جتنا سخت تھا۔ مدافعت بھی اتنی ہی سخت تھی۔ دوپہر تک زور دار معرکہ رہا۔ جانبین سے جوانمردی اور شجاعت کے خوب جوہر دکھائے گئے۔ سلطان گھوڑے پر سوار، اپنے پردادا سلطان بایزید یلدرم کی عادت کے مطابق ہاتھ میں گرز تھامے، اپنے تیار کردہ ۱۲ ہزار پر مشتمل نصوصی لشکر ''ینی چری'' کی قیادت کر رہا تھا۔

اس عدد میں شاید یہ حکمت تھی کہ حدیث شریف میں آتا ہے ۱۲ ہزار آدمی قلت کے سبب مغلوب نہیں ہوتے یعنی کسی اور سبب مثلاً گناہوں یا امیر کی عدم اطاعت کی وجہ سے شکست کھائی تو کھائی، تعداد کی کمی ان کے لیے مسئلہ نہیں بنتی۔ آخر کار دوپہر کے قریب جب زمین آگ کا سمندر اور آسمان دھوئیں کا بادل بن چکا تھا، دونوں طرف بے انتہا جوش وخروش تھا اور کوئی بھی ہمت ہارنے پر تیار نہ تھا ''ینی چری'' کا ایک دلیر مجاہد آغا حسن جو بڑا تندرست وتوانا اور قوی ہیکل مجاہد تھا۔ قلعہ کی فصیل پر سب سے پہلے قدم جمانے اور اسلامی جھنڈا لہرانے میں کامیاب ہو گیا۔

آغا حسن ۳۰ ساتھیوں سمیت ناقابل عبور سمجھی جانے والی فصیل پر چڑھنے میں کامیاب ہو گیا۔ اگرچہ وہ اور اس کے ۱۸ ساتھی فصیل پر لڑے گئے زبردست معرکے میں جام شہادت نوش کر گئے لیکن انہوں نے دوسرے مجاہدین کے لیے اوپر چڑھنے کا راستہ ہموار کر دیا۔ عثمانی لشکر قلعے پر ٹوٹ پڑا اور اسے اپنی تیز وتند یلغار میں بہاتا ہوا لے گیا۔ سلطان کی خواہش اور اعلان کے مطابق ظہر سے پہلے قسطنطنیہ فتح ہو گیا۔

ظہر کے وقت سلطان محمد ثانی فاتح قسطنطنیہ اپنے وزراء سپہ سالاروں اور مجاہدین کے ساتھ سینٹ رومانس کے دروازے سے (جہاں سب سے زیادہ خونیں معرکہ لڑا گیا تھا اور قیصر قسطنطنیہ...... جس کی بہادری کا اعتراف کرنا چاہئے کہ بہادری کی قدر بھی بہادری کا حصہ

ہے.....یہیں لڑتے ہوئے مارا گیا تھا) واضح ہو کہ اس کی موت پر نبی ﷺ کی ایک سچی پیش گوئی پوری ہوئی تھی۔

''اذاھلک قیصر فلا قیصر بعدہ''

''جب قیصر طبعی موت کی بجائے قتل ہو کر ہلاک ہوگا تو پھر کوئی قیصر پیدا نہ ہوگا۔''

شہر میں داخل ہوا اور گلیوں، بازاروں سے گزرتے ہوئے آیا، صوفیا نامی کلیسا پہنچا۔ تواضع کے اظہار کے لیے سر پر خاک کی مٹھی ڈالی۔ اس موقع پر اس پر شکر کے جذبات کی شدت سے رقت طاری ہوگئی اور قسطنطنیہ کو مفتوح اور اجڑا ہوا دیکھ کر دنیا کی بے ثباتی کا مشاہدہ کر کے اس کی زبان پر بے اختیار فردوسی کا یہ شعر آ گیا۔

پردہ داری می کند بر قصر کسری عنکبوت
بوم نوبت می زند بر گنبد افراسیا

''مکڑی نے شاہ ایران کے محل میں جالے بنے ہوئے ہیں اور افراسیات کے گنبد پر الو بول رہا ہے۔''

سلطان نے گرجا میں داخل ہو کر تصویریں مٹائیں اور اذان کہلوا کر نماز ظہر ادا کی۔ اس اذان کے وقت جو ساڑھے ۸۰۰ سالہ جدوجہد اور قربانیوں کا ثمر تھی، مؤذن اور حاضرین پر جو کیف طاری ہوا ہوگا اس کا بس اندازہ ہی کیا جا سکتا ہے۔ عیسائیوں کے ہاں مشہور تھا کہ اگر کسی نے اس قلعے کو فتح کیا تو اس گرجے کے قریب پہنچنے پر آسمانی فرشتہ نازل ہوگا اور اسے ہلاک کر دے گا۔ سلطان تزک واحتشام اور عجز وانکساری کے امتزاج کے ساتھ گرجے میں داخل ہوا، آسمان سے تو کوئی فرشتہ نہ اترا البتہ موقع پر موجود عیسائیوں نے پادریوں کی من گھڑت روایات کی حقیقت اپنی آنکھوں سے دیکھ لی۔

فتح کے بعد سلطان نے پوری اسلامی دنیا میں خوشخبری بھیجی جس سے دنیائے اسلام کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک خوشی ومسرت کی لہر دوڑ گئی۔ اس دن سے اس کے نام کے ساتھ ''فاتح'' کے لقب کا اضافہ ہو۔

یوں تو عیسائی حکومتیں شروع ہی سے مسلمان حکومتوں کو رشک وحسد کی نگاہ سے دیکھتی تھیں۔ لیکن فتح قسطنطنیہ کے بعد تو وہ انگاروں پر لوٹنے لگیں اور تہیہ کر لیا کہ جس قیمت پر بھی ہو سکے ترکوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے۔ اس سلسلے میں کالکٹوس سوئم پوپ آف روما کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ صلیبی جنگ کے علمبرداروں میں ایک اس کی ذات بھی تھی۔ اس کی ترکوں کے خلاف متواتر اور لگاتار کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ 860ھ میں عیسائی حکومتیں خم ٹھونک کر ترکوں کے مقابلے پر آ گئیں اور سلطنت عثمانیہ پر حملہ آور ہوئیں۔

سلطان محمد فاتح بھی ڈیڑھ لاکھ فوج اور دو سو جنگی جہاز لے کر عیسائی حکومتوں کا مزاج بحال کرنے کے لیے مقابلے پر آ گیا اور سربیا (سرویا) کے دارالسلطنت شہر بلگریڈ کا محاصرہ کر لیا۔ قریب تھا کہ دارالسلطنت کو فتح کر لے ہنگری کا مشہور سپہ سالار ہونیاد پھر کمک لے کر آ پہنچا۔

اس لڑائی میں بیس ہزار ترک شہید ہوئے۔ سلطان کا زخم معمولی تھا۔ چند روز میں اچھا ہو گیا۔ لیکن ہونیاد جسے قضا لے آئی تھی اس کا زخم کاری ثابت ہوا۔ بیس روز تک موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا رہ کر آخر کار اس نے دم توڑ دیا۔ اس کے مرنے سے دولت عثمانیہ نے اپنے سب سے بڑے دشمن سے نجات حاصل کر لی۔

اس جنگ کے بعد سلطان نے 863ھ میں محمود پاشا صدر اعظم کو پھر تسخیر سربیا کے لیے روانہ کیا اور اس نے آتے ہی سربیا کے تمام مقبوضات فتح کر کے دولت عثمانیہ میں شامل کر لیے۔ صرف ایک شہر بلگریڈ اس کے ہاتھوں سے بچ گیا تھا۔ کیونکہ اس نے سلطنت ہنگری میں شمولیت کر لی تھی۔ باقی تمام مقبوضات سلطنت عثمانیہ میں آ چکے تھے۔

گزشتہ جنگ میں جو یورپ کی متحدہ افواج اور ترکان عثمانیہ کے درمیان ہوئی تھی اس میں چونکہ والی مورہ توماس نے بھی سلطان فاتح کے دشمنوں کا ساتھ دیا تھا۔ اس لیے سلطان نے فتح سے فراغت پانے کے بعد پھر مورہ کا رخ کیا اور حملہ کر کے شہر کورنٹائن اور اس سے متعلقہ تمام شہروں پر قبضہ کر لیا۔ قریب تھا کہ مورہ پر بھی قبضہ کر کے اس کا خاتمہ کر دے کہ والیٔ بوسینا کی عاجزی اور سفارش آڑے آئی۔ سلطان نے والیٔ مورہ کو معاف کر دیا اور اس نے

بارہ ہزار اشرفی سالانہ خراج ادا کرنے کا وعدہ کر کے جان بچائی۔ مگر افسوس والیٔ مورہ نے اپنے روایتی بدعہدی کی اور وہ پھر سرکش ہوگیا۔ اب سلطان نے دوبارہ مورہ پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کرلیا اور والیٔ مورہ جان بچا کر اٹلی بھاگ گیا۔

والیٔ بوسینیا ویمتر بوس نے بھی گزشتہ جنگ میں سلطان کے دشمنوں کا ساتھ دیا تھا۔ اس لیے سلطان نے فتح قسطنطنیہ کے بعد سب سے پہلے بوسینیا ہی پر حملہ کیا تھا۔ مگر والیٔ بوسینیا نے بارہ ہزار سالانہ اشرفی خراج ادا کرنے کے وعدے پر سلطان سے صلح کر لی اور وہ آئندہ کے لیے اس کی دوستی کا دم بھرنے لگا۔ لیکن جبل گرود، جبلت نہ گرود کے بمصداق وہ اپنی فطرت سے مجبور تھا۔ چنانچہ اس نے پھر عہد شکنی کی۔ سلطان نے بھی اس پر حملہ کیا مگر وہ ہونان کے مجمع الجزائر کی طرف بھاگ نکلا اور وہ وہیں مر گیا۔

اب بوسینیا کے نئے حکمران نے بھی اپنا وہی طرز عمل اختیار کیا۔ جو اس کے پیش رو کا تھا۔ بلکہ اس سے بڑھ کر یہ خراج ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ سلطان نے اپنے وزیر اعظم محمود پاشا کو حملہ کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ محمود پاشا نے فوج کشی کی اور بوسینیا پر فتح پائی اور بوسینیا کے نئے حکمران کو ترکوں نے گرفتار کرلیا۔ ہنگری کے نامور سپہ سالار ہونیاد کے بیٹے میتیاس نے بوسنیا پر حملہ کر دیا۔ ترکان عثمانیہ نے ڈٹ کر اس کا مقابلہ کیا۔ جس میں بے شمار ہنگری سپاہ ترکوں کے ہاتھ واصل جہنم ہوئی اور میدان ترکوں کے ہاتھ رہا۔

اس لڑائی کے بعد بہت سے شرفا نے اپنی رضا و رغبت سے اسلام قبول کرلیا اور وہ ہمیشہ اس پر ثابت قدم رہے۔ یہ اسلام کی روحانی قوت اور مسلمانوں کے حسن عمل کا نتیجہ تھا جس کا نقش نئے نئے مسلمان ہونے والے عیسائیوں کے دلوں پر ہمیشہ کے لیے ثبت ہوگیا۔ 981ھ میں حسن روزن نے جو قراط سے آمودار یا تک قابض تھا۔ دولت عثمانیہ کے حدود میں تاخت و تاراج شروع کر دی۔ سلطان بذات خود اس کے مقابلے کو نکلا اور اسے آذربائیجان کے قریب ایسی شکست دی کہ پھر اس میں مقابلے پر آنے کی کبھی ہمت پیدا نہ ہوئی۔

روزن حسن، تیمور لنگ کی نسل سے تھا اور ایشائے کوچک میں ساحل بحر اسود پر واقع ایک

مشہور بندرگاہ سینوب پر حکمرانی کرتا تھا۔ (دیو جانس کلبی، مشہور فلسفی یہیں پیدا ہوا تھا) ہر چند وہ سلطان کا باج گزار تھا۔ تاہم ترکانی عثمانی اور تیمور لنگ کے درمیان ایک جنگ ہو چکی تھی۔ اس لیے وہ عثمانی ترکوں کے خلاف دل میں کدورت رکھتا اور جب موقع پاتا عثمانی ترکوں کی مخالفت کرتا۔ اس لیے سلطان نے 894ھ میں سینوب پر قبضہ کرلیا۔ یہیں سے ایک مستقل کدورت روزن حسن کے دل میں ترکوں کے خلاف پیدا ہوگئی۔ جس کے لیے وہ اکثر مواقع کی تلاش میں رہتا تھا جیسا کہ طرابزون کی مثال سامنے ہے۔

بندقیہ، یورپ کی سب سے عظیم الشان بحری اور تجارتی سلطنت تھی۔ اس کی ہمسری کا دعویٰ صرف جنیوا کو ہوسکتا تھا اس کے سوا یورپ کی کوئی سلطنت اس کے پائے کو نہیں پہنچ سکتی تھی۔

ترکان عثمانیہ اور اہل بندقیہ کے درمیان قدیم زمانے سے عداوت چلی آرہی تھی۔ اہل بندقیہ کا حال یہ تھا کہ وہ جب موقع پاتے ترکوں کو شدید نقصان پہنچاتے اور ان کی مخالفت کرنے سے کبھی باز نہ آتے تھے۔

مورہ جس پر سلطان نے قبضہ کرلیا۔ بندقیہ اسے سلطان کے قبضے سے نکالنا چاہتے تھے اور اس کے لیے وہ اکثر وہاں کے لوگوں کو ترکوں کے خلاف اکساتے اور طرح طرح سے بہکاتے رہتے تھے۔ اس سے بڑھ کر انہوں نے یہ کہا کہ ایک موقع پر بہت سے ترکوں کو ناحق مار ڈالا اور اپنے ساتھ جہازوں کو لے کر انیوز پر قبضہ کرلیا۔

اہل بندقیہ کا صریحاً ظلم اور بڑھتی ہوئی سرکشی دیکھ کر سلطان نے چڑھائی کر دی۔ 873ھ میں جزیرہ اغریبوز پر قبضہ کرلیا جو اہل بندقیہ کے جزائر بحر روم کی نوآبادیات کا صدر مقام تھا۔

اہل بندقیہ نے جزیرے والوں کی مدد کے لیے امیر البحر نکولس کو اسی (۸۰) جہازوں کا بیڑا دے کر روانہ کیا لیکن جزیرے والوں کو مدد کے لیے پہنچنے سے پہلے پہلے وہاں مسلمانوں کا جھنڈا لہرا چکا تھا۔ امیر البحر نکولس یہ ماجرا دیکھتے ہی الٹے پاؤں واپس پھر گیا اور مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کے بجائے اپنے جہازوں کے ہلاس پاندارس کی طرف بھاگ نکلا۔

۸۸۲ھ میں ترکان عثمانیہ نے اہل بندقیہ کے مقبوضات پر پھر حملہ کیا اور کروا سیا، ڈلماسیا دونوں اقالیم کو فتح کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ اہل بندقیہ یہ صورتحال دیکھ کر ڈرے کہ کہیں ایسا نہ ہو ترکان عثمانیہ ہمارے اصل شہر پر قابض ہو جائیں۔ لہٰذا انہوں نے ایک لاکھ اشرفی سالانہ خراج ادا کرنے پر صلح کر لی اور شہر کردیہ (آقچہ حصار) کو جو اسکندر بک البانی کا صدر مقام تھا ترکوں کے حوالے کر دیا۔ اس کے علاوہ اہل بندقیہ کے اور بہت سے شہر بھی سلطان کے قبضے میں آئے جن میں اشفودہ خاص کر بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ جنیوا کی سلطنت بھی یورپ کی ایک عظیم الشان سلطنت تھی چونکہ اہل جنیوا سے بھی ترکان عثمانی کی قدیم دشمنی چلی آ رہی تھی اور اہل جنیوا جب موقع پاتے ترکان عثمانیہ کو نقصان پہنچاتے تھے۔ اس لیے سلطان نے آئے دن کے خطرے کو روکنے کے لیے اپنے نئے وزیر اعظم ''احمد پاشا'' کو جنیوا پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کیا۔

جزیرہ نمائے کریمیا اور وہ تمام علاقے جو بحر اسود کے شمال میں واقع ہیں۔ ان پر چنگیز خان کے زمانے سے ان تاتاریوں کی حکومت چلی آتی تھی، جنہوں نے تیمور لنگ کے زمانے میں اسلام قبول کیا۔ تیمور لنگ نے ممالک تاران، اژدہان، کریمیا اور قبچاق کے تاتاریوں کو متحد کر کے قبچاق کی حکومت قائم کی اور یہ حکومتیں ایک عرصے تک طاقتور اور فاتحانہ شان کی مالک رہی۔ لیکن ایک مدت گزر جانے کے بعد ان میں کمزوریاں اور بدعنوانیاں پیدا ہو گئیں، جس سے فائدہ اٹھا کر اہل جنیوا نے آزاق، کفہ اور سکوب وغیرہ بندرگاہوں پر قبضہ کر لیا اور ان مقامات پر اپنے تجارتی گودام کھول دیئے۔ جن سے انہیں سب سے بڑھ کر فائدہ یہ پہنچا کہ وہ یہاں رہ کر اسلامی ملکوں میں فتنہ وفساد پھیلاتے اور پھر مسلمانوں کی باہمی نااتفاقی کا فائدہ اٹھانے میں پورے پورے کامیاب ہوتے رہے۔

سلطان نے اہل جنیوا کو یہاں سے نکالنے کے لیے ان پر حملہ کیا اور ''احمد پاشا'' کو تین سو جنگی جہازوں کا بیڑا دے کر بندرگاہوں کی طرف روانہ کیا۔ بالآخر کئی ایک لڑائیوں کے بعد اہل جنیوا کو وہاں سے نکال کر سلطان نے ان پر قبضہ کر لیا۔

اسی دوران قبچاق کے آخری حکمران ''حاجی کرائے'' فوت ہو گیا اور اس کے بارہ بیٹے

باپ کے تخت وتاج حاصل کرنے کے لیے آپس میں الجھ پڑے اور ان میں سخت خانہ جنگی ہونے لگی۔ علمائے اسلام نے ملک میں امن وامان بحال کرنے کی غرض سے ایک محضر نامہ سلطان کی خدمت میں پیش کیا اور درخواست کی کہ حاجی مرحوم کے بیٹوں میں مصالحت کرا کے ملک کو تباہی وبربادی سے بچایا جائے۔

سلطان اس وقت اہل جنیوا کو شکست دے کر واپس آ رہا تھا۔ اس کے ہمراہ بہت سے جنگی قیدی بھی تھے جن میں حاجی کرائے کا بیٹا منکلی کرائے بھی تھا۔ سلطان کو اس کے حالات کا علم ہوا تو نہایت شفقت سے پیش آیا اور علمائے اسلام کی طرف سے پیش کردہ محضر دکھا کر اسے خان کریمیا مقرر کر دیا اور اس وقت سے کریمیا کو ترکی مقبوضات کا ایک ممتاز صوبہ قرار دے دیا گیا۔

۸۸۴ھ میں سلطان نے پھر جنیوا کے مقبوضات پر چڑھائی کی اور اس کے ایک افسر نے تیس جنگی جہازوں کو لے کر قلعہ بونہ پر حملہ کر کے اسے فتح کر لیا۔

روڈس ایک جزیرہ ہے جس میں اس کے نام پر ایک شہر بھی ہے اور جزیرہ بھی۔ شہر کو قدیم فصیلوں اور برجوں نے گھیرا ہوا ہے کہتے ہیں اسے ''جومیری یوحنا'' کے نائٹوں نے تعمیر کیا تھا۔ اس شہر کے دو گھاٹ ہیں جو ایک دوسرے سے ایک تنگ اور سخت قطعہ زمین کے ذریعے سے جدا ہوتے ہیں۔ اس گھاٹ کے شمال غربی حصے کے کنارے پر گرینڈ نائٹ کا عالی شان محل واقع ہے اور وہی نائٹوں کے رہنے کی جگہ اور ایک قلعہ قدیم یادگاریں خیال کی جاتی ہیں۔ اس کے چھوٹے بندرگاہ کے دہانے پر ایک برج بنا ہوا ہے جس پر بولوں کا مشہور بت نصب تھا اور قدیم زمانے کی مستند یادگار تسلیم کیا جاتا تھا اور دنیا کے سات عجائبات میں شمار ہوتا تھا اور لوگ اسے روڈس کا تانبے والا بت کہتے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ یہ بت ان جنگی آلات سے بنایا گیا تھا جو سکندر اعظم کے جانشین دیمز یوس پولو کریٹ نے یادگار چھوڑے تھے۔ اسٹرابوں کا مؤرخ بیان کرتا ہے کہ شہر روڈس اپنے موقع کی خوشنمائی سے تمام دنیا کے شہروں سے فوقیت رکھتا تھا۔ روڈس کا امیر ان صلیبی جنگیں لڑنے والوں میں کسی امیر کی نسل سے تھا۔ جو شام کے ملک سے نکال دیئے جانے

پر یہاں جزیرے پر قبضہ کر کے رہنے لگے اور انہوں نے بیس برس کی مدت میں بہت سے مستحکم قلعے تعمیر کر لیے تھے۔

والیٔ روڈس نے دیرینہ اسلام دشمنی کی بنیاد پر اپنے جنگی جہازوں کو اشارہ کیا کہ وہ ترکان عثمانیہ کے جہازوں پر حملہ کریں اور لوٹ مار مچائیں۔ دوسری طرف یہاں کی عیسائی رعایا باوجود اس کے کہ ان کا حکمران روڈس عیسائی تھا۔ سلطان کے پاس روڈس کے ظلم وستم کی فریاد لے کر گئی اور درخواست کی کہ انہیں روڈس کے مظالم سے نجات دلائی جائے۔ چنانچہ ۸۸۵ھ میں سلطان نے ''مسیح پاشا'' کو جس کا اسلام قبول کرنے سے پہلے مسیئن نام تھا اور قیصر روم کے خاندان سے تھا۔ ایک سو ساٹھ جنگی جہازوں کا بیڑا دے کر جزیرے پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کیا۔ ان جہازوں پر کوئی ایک لاکھ کے لگ بھگ سپاہی تھے۔ راستے کے چھوٹے چھوٹے مقامات کو فتح کرتے ہوئے خاص اس شہر میں یہ بیڑا پہنچ گیا اور محاصرہ کر لیا جو برابر چار مہینے تک قائم رہا۔ آخر کار ترکان عثمانیہ نے فتح پائی اور ترکوں نے قلعہ کی چھت پر اسلام کا جھنڈا بلند کر دیا۔

''مسیح پاشا'' نے اعلان کیا کہ کوئی سپاہی رعیت کی جان و مال سے کسی قسم کا کوئی تعرض نہ کرے۔ پاشا کے اس علان پر ترک فوج ادھر ادھر منتشر ہوگئی جس سے اہل قلعہ کو ترکوں پر حملہ کرنے کا اچھا موقع مل گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ترک سپاہیوں کو اپنے جہازوں کی طرف بھاگ بھاگ کر جان بچانی پڑ گئی اور جزیرہ روڈس کی فتح پھر پچاس برس کے لیے پیچھے رہ گئی۔

سلطان محمد فاتح اسلام کا سچا شیدائی اور سپاہی تھا۔ اس کی زندگی نہایت سادہ تھی۔ وہ اپنا زیادہ تر وقت علمی و ادبی کتابیں پڑھنے اور فنون حرب کے متعلق جاننے میں صرف کرتا تھا۔ عیش و آرام کی زندگی اسے پسند نہ تھی۔ علمی و ادبی محافل اور میدان جہاد کی زندگی کو وہ پسند کرتا تھا۔

جہاں وہ ایک عظیم فاتح تھا وہیں اس میں تنظیمی صلاحیتیں بھی اعلیٰ درجے کی پائی جاتی تھیں۔ اس کے دور میں قسطنطنیہ بڑے بڑے عالموں، فاضلوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اس نے مملکت کے طول و عرض میں ہزاروں مدرسے قائم کیے۔ یہ مدارس مساجد کے ساتھ ملحق ہوتے تھے۔ جہاں لاکھوں بچے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ سلطان محمد فاتح کا عہد ہر اعتبار سے ایک

مثالی عہد تھا۔ یہ عہد ایک طرف فتوحات کے لیے مشہور ہے تو دوسری طرف علم وادی کی ترقی اور تہذیب وثقافت میں ممتاز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے تمام مسلمان سلطان محمد فاتح کا نام بڑے احترام سے لیتے ہیں اور اسے ملت اسلامیہ کا عظیم ہیرو قرار دیتے ہیں۔

❀❀❀



امیر البحر بار بروسہ رحمہ اللہ

ان مردان حق کا قصہ جنھوں نے اپنے زمانے میں ترکی کو دنیا کی سب سے بڑی طاقت بنا دیا تھا بحیرئہ روم، احمر اور بحیرئہ عرب میں ان کے نام کے ڈنکے بجتے تھے اور جبل الطارق سے لے کر ہندوستان کے مغربی ساحل تک ان کا نام انتہائی عزت و احترام کے ساتھ لیا جاتا تھا

عالم اسلام کے قابل فخر اور مایہ ناز امیر البحر

سمندر کے کافی وسیع علاقے پر ایک ڈاکو کا تسلط تھا۔ تجارتی بحری بیڑے اور مسافروں کے جہاز اس طرف سے بہت کم بچ کر نکلتے تھے۔ ایک دن اس ڈاکو نے ساحل کی ایک بستی کا رخ کر لیا۔ بستی کے بازار ویران ہو گئے۔ لوگوں نے اپنے گھروں کے کواڑ مضبوطی سے بند کر لیے۔ ڈاکو ننگی تلوار لیے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھی اس کے پیچھے تھے۔ اچانک ایک بڑھیا نے اس کا راستہ روک لیا۔ ڈاکو بڑھیا کی جرأت پر حیرت زدہ رہ گئے۔ ادھر بڑھیا نے چلا کر کہا:

''شرم سے ڈوب مرو، شیطان کے چیلو! تمھیں کسی کا خوف نہیں۔''

''احمق بڑھیا! تمھیں شاید معلوم نہیں، میں کون ہوں؟'' ڈاکو نے تلوار لہرا کر کہا:

''اچھی طرح جانتی ہوں۔ تو بار بروسا ہے، تو ظالم ہے، ڈاکو ہے۔'' بڑھیا کی آواز میں کھنک تھی۔ ڈاکو بار بروسا حیران رہ گیا۔ تاہم اس نے ہنس کر کہا:

''اچھا! میں ظالم ہوں، ڈاکو ہوں۔''

''ہاں! بالکل تو اللہ کا باغی ہے، تو غلام ہے شیطان کا، اپنی خواہشات کا غلام، جس کے اختیار میں کچھ بھی نہیں۔'' بڑھیا کی آواز میں گونج تھی۔

ایسی سچی اور کھری باتیں سن کر باربروسا اندر سے ہل گیا اور رونے لگا۔ وہ وہیں سے واپس مڑا اور اپنے جہاز پر جا پہنچا۔ اس نے اپنے گناہوں سے توبہ کی اور پھر اسلامی لشکر میں شامل ہوگیا۔ سمندر کا ماہر تو تھا ہی جلد ہی ترکی کی سلطنت عثمانیہ کی بحری فوج کا سپہ سالار بن گیا۔ اس زمانے میں سپین سمیت جرمنی اور اٹلی میں عیسائی حکومتیں تھیں۔ انہیں اسلامی حکومت اور سلطنت کا وجود ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ انہوں نے آپس میں اعتماد کر کے کئی بار ترکی پر حملے کیے مگر ترکی کا جانباز، اسلام کا سرفروش مجاہد باربروسا ہمیشہ بہادری دکھاتے ہوئے عیسائیوں کی دس گنا فوجوں کو شکست فاش دیتا رہا، یہاں تک کہ عیسائی سلطنتوں کو اپنا بچاؤ کرنے کے لالے پڑ گئے۔ ڈاکو کی زندگی کو خیر آباد کہہ کر خدمت اسلام کا بیڑہ اٹھانے والے یہ عظیم انسان عالم اسلام کے قابل فخر اور مایہ ناز امیر البحر خیر الدین باربروسہ تھے۔

پرتگالی زبان میں باربوزا لال داڑھی والے کو کہتے ہیں۔ عربوں میں اکثر رواج تھا کہ جب داڑھی اور سر کے بال سفید ہونے لگتے تھے تو اس میں دسمہ (مہندی) لگا کر انہیں لال کر لیا جاتا تھا۔ عربوں سے یہ رواج ترکوں میں بھی پھیل گیا۔ پرتگالی خود بڑے اچھے ملاح ہوتے تھے۔ جب وہ کسی سرخ داڑھی والے مسلمان ملاح یا امیر البحر کو دیکھتے تو اسے باربوزا کہنے لگتے تھے۔ اسی لفظ کو ترکی اور عربی میں باربروسہ کہا جانے لگا۔

ایوبیا یونان کے جنوب میں ایک چھوٹا سا جزیرہ تھا جسے عثمانی فرمانروا سلطان محمد ثانی نے سہ ۱۴۶۲ء میں فتح کر کے اپنی عملداری میں شامل کر لیا۔ سلطان محمد جزیرے کا انتظام یعقوب نامی ایک قابل اور وفادار افسر کے سپرد کر کے خود قسطنطنیہ واپس آگئے جو اب دار السلطنت تھا۔ یعقوب کی شخصیت بھی بڑی متنازعہ ہے ترک مورخوں نے انہیں مسلمان لکھا ہے جبکہ عیسائی تاریخ دانوں نے انہیں عیسائی ٹھہرایا ہے۔ چونکہ عثمانی سلاطین نے بہت سے غیر مسلموں کو بڑے بڑے عہدوں پر مامور کیا تھا اور انہوں نے بھی نہایت وفاداری سے خدمات انجام دی تھیں اس لیے اس کا بھی امکان ہے کہ عیسائی مورخوں کا دعویٰ درست ہو۔

یعقوب کے چار بیٹے تھے جن کے نام اسحٰق، الیاس عروج اور خضر تھے۔ یعقوب کا تو اسی عہدے پر انتقال ہوگیا۔ ان کی اولاد میں اسحٰق نے تجارت میں بڑی کامیابی حاصل کی

اور جلد ہی ایوبیا کا ملک التجار بن گیا۔ اور باقی تینوں بھائیوں نے بحری فوج میں شمولیت اختیار کرلی۔ سمندری سفر اور دور دراز ملکوں کی سیر کا شوق اس زمانے میں زیادہ تر جوشیلے نوجوانوں کو بحری ملازمت میں کھینچ لایا کرتا تھا۔ ان میں الیاس ابتدا ہی میں کسی بحری جنگ میں کام آیا البتہ عروج اور خضر دونوں نے بے حد ترقی کی اور امیر البحر کے جلیل القدر عہدوں تک پہنچے۔ عروج نے خود اپنے نام عروج سے شہرت پائی جبکہ خضر خیر الدین کے نام سے مشہور ہوئے۔

جس طرح بحری کارناموں کی تاریخ مسلمان امیر البحر کے کارناموں کے بغیر ادھوری ہے، اسی طرح مسلمان امیر البحر کا تذکرہ عروج الدین بروسہ اور خیر الدین بابر بروسہ کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ اس لیے ضروری ہے کہ امیر البحر خیر الدین بار بروسہ کے ساتھ ساتھ ان کے بڑے بھائی اور استاذ امیر البحر عروج الدین بار بروسہ کے حالات زندگی اور کارناموں سے واقفیت حاصل کی جائے۔ زیر نظر سطور میں دونوں عظیم بھائیوں کی خدمات کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ جب اندلس سے مسلمانوں کو نکالا جا رہا تھا اور یہ تباہ حال مسلمان چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں بیٹھ کر افریقہ کے ساحل پر پناہ لے رہے تھے۔ عیسائی سمندری ڈاکو ان مسلمانوں کی کشتیوں اور بستیوں پر حملہ کر کے انہیں لوٹ لیا کرتے تھے۔ چونکہ بحیرہ روم کی سب سے بڑی بحری طاقت کی حیثیت سے افریقی ساحلوں کی حفاظت بھی عثمانی سلطنت کی ذمہ داری تھی اس لیے سلطان وقت نے عروج کو عیسائی سمندری ڈاکوؤں کی سرکوبی کا کام سونپا۔ انہوں نے ان کے خلاف جارحانہ کارروائیوں کا ایک مربوط سلسلہ شروع کر دیا۔

امیر البحر عروج نے جنوبی یورپ کی عیسائی حکومتوں کے جنگی بیڑوں کو پے در پے عبرتناک شکست دی اور ان کی بحری طاقت کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ اسپین کے مظلوم مسلمانوں کو وہاں سے بچ نکلنے میں بھی انہوں نے ان کی بڑی مدد کی۔ جن مسلمانوں کے پاس کشتیاں نہیں ہوتی تھیں انہیں وہ اپنے بیڑے کے جہازوں میں بھر کر افریقہ کے ساحل پر لے آتے تھے اور جب اسپین کے جہاز مزاحمت کرتے تھے تو ان کا بھی مقابلہ کرتے تھے۔

عیسائی دنیا کا سب سے بڑا مذہبی رہنما پوپ کہلاتا تھا۔ اس کا اپنا بہت مضبوط بحری بیڑا تھا۔ قاعدہ یہ تھا کہ ہر عیسائی حکومت کچھ مسلح جہاز پوپ کے بیڑے کی نذر کرتی تھی اور سپاہیوں کی تنخواہ اور دیگر اخراجات بھی خراج یا نذرانے کے طور پر ادا کرتی تھی۔ یہ بیڑا اتنا مضبوط تھا کہ اب تک کسی مسلمان سلطنت نے اس سے ٹکر لینے کی جرات نہ کی تھی۔ لیکن ایک بار جب اچانک امیر البحر عروج کو پوپ کا بیڑا بحیرہ روم میں نظر آ گیا تو ان سے رہا نہ گیا اور اسی وقت حملہ کر کے سارے جہاز گرفتار کر لیے۔ پوپ کے سارے ملاحوں اور سپاہیوں کی گرفتاری سے پورے یورپ میں ہلچل مچ گئی۔ ادھر امیر البحر عروج نے ان ملاحوں کو تونس کی بحریہ کی ملازمت پیش کی جو انہوں نے قبول کر لی۔ یہ پوری عیسائی دنیا کے چنے ہوئے لوگ تھے۔ جن کے آ جانے کی وجہ سے تونس کی بحری طاقت میں گراں قدر اضافہ ہو گیا۔

اس کے بعد امیر البحر عروج نے اسپین سے ایک فیصلہ کن سمندری جنگ لڑنے کا فیصلہ کیا۔ ۱۵۰۴ء میں امیر البحر عروج نے اپنے مختصر بیڑے کی مدد سے ڈاکوؤں کی کئی ٹولیوں کو شکستیں دیں۔ ساحل پر خشکی کے قریب ایک محفوظ جگہ انہوں نے اپنا ہیڈ کوارٹر بنالیا تھا اور ان کی مخبر کشتیاں برابر بحیرۂ روم میں گشت لگایا کرتی تھیں۔ جب کبھی کوئی عیسائی بیڑا افریقہ کے ساحل کا رخ کرتا تو امیر البحر عروج کو فوراً خبر ہو جاتی تھی اور وہ اپنا بیڑا لے کر دشمن کے سامنے سینہ سپر ہو جایا کرتے تھے۔

تونس کی بندرگاہ آج بھی دنیا کی بہترین بندرگاہوں میں سے ایک ہے اسی لیے عروج نے اسی کو اپنا مستقر بنالیا تھا۔ بندرگاہ کے قریب خلق الوید کا چھوٹا سا قلعہ سلطان تونس نے ان کے حوالے کر دیا تھا۔ اسی میں وہ رہتے تھے اور اسپین سے لٹے ہوئے مسلمانوں کے قافلے یہیں پہنچتے تھے۔ چند روز یہاں رکھنے کے بعد ان کی آبادکاری کا کوئی مستقل انتظام کر کے انہیں اندرون ملک بھیج دیا جاتا تھا۔

اس سے پہلے حکومت تونس کو عیسائی بیڑوں کے حملوں سے کافی نقصان ہوتا رہتا تھا۔ امیر البحر عروج کے یہاں پہنچنے کے بعد تونس کا ساحل محفوظ ہو گیا اور اب تاجر پورے اطمینان اور بے فکری کے ساتھ اپنا مال لاتے اور لے جاتے، جس سے ملک کی معاشی حالت تیزی

سے سدھر رہی تھی، آخر سلطان تونس نے عثمانی سلطان سے اجازت لے کر امیر البحر عروج کو تونس کا امیر البحر مقرر کر دیا۔ یہ عہدہ سنبھالتے ہی وہ تونس کے بحری بیڑے کی تنظیم میں مصروف ہو گئے۔ جہاز سازی کے کارخانے کھولے اور بحری علوم کی درس گاہیں قائم کرائیں، بندرگاہوں کی مرمت اور توسیع کا کام کیا اور اس کے بعد عیسائی حملہ آوروں کے خلاف دفاعی جنگ کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے اس جنگ کی تیاریاں خاموشی سے کرنے کے بجائے علی الاعلان کیں اور اس کا موقع دیا کہ یہ خبریں اسپین پہنچ جائیں۔ اس کے بعد جب وہ اپنا بحری بیڑا لے کر نکلے تو اسپین کی عیسائی حکومت کا پورا جنگی بیڑا ایک جگہ موجود تھا۔ امیر البحر عروج کا مقصد بھی یہی تھا کہ اسپین کی پوری بحری طاقت ایک جگہ اکٹھی ہو جائے۔ جبرالٹر کے قریب دونوں بیڑوں میں بڑی خوفناک تاریخی جنگ ہوئی جس میں مسلمان فتح یاب ہوئے اور اسپین کی سمندری طاقت کی کمر ٹوٹ گئی۔

اس فتح نے ساری دنیا میں امیر البحر عروج کے نام کو عروج بخشا اور سلطان تونس نے خوش ہو کر جربہ نامی ایک جزیرہ انہیں بخش دیا تاکہ وہ وہاں مطلق العنانی کے ساتھ حکومت کر سکیں۔ امیر البحر عروج نے اپنے ذاتی جہازوں کو جربہ میں رکھا جبکہ حلقالوید کی بندرگاہ میں تونس کے آٹھ سو جنگی جہاز ہر وقت ان کے حکم کے منتظر رہا کرتے تھے۔

اسپین کے ساحل پر بوجھیہ نامی ایک بہت چھوٹی سی عیسائی ریاست تھی۔ اسپین کی حکومت نے فوجی طاقت کے بل پر اس ریاست پر قبضہ کر لیا۔ بوجھیہ کے حاکم نے اپنا ایک ایلچی امیر البحر عروج کے پاس بھیجا اور کہا کہ اگر آپ میرا تخت واپس دلوا دیں تو میں آپ کے اور آپ کے ساتھیوں کے جہازوں کے لیے بندرگاہ بوجھیہ کے دروازے کھول دوں گا اور ان سے کوئی ٹیکس نہیں لیا جائے گا۔ امیر البحر عروج نے سلطان تونس سے اجازت لینے کے بعد حملے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ تیونس کی بہترین فوجیں جہازوں میں سوار کی گئیں۔ چونکہ اسپین سے مسلمانوں کو بڑی بے عزتی کے ساتھ نکالا گیا تھا اس لیے ان مہاجر مسلمانوں نے بھی انتقامی طور پر اس جنگ کے لیے اپنے آپ کو پیش کیا۔ امیر البحر عروج نے بوجھیہ کے حاکم سے پہلے ایک تحریری معاہدہ کر لیا اور ساری شرطیں لکھوا لیں اس کے بعد اسلامی لشکر روانہ

ہو گیا۔ اسپین کی بحری طاقت تو پہلے ہی ختم ہو چکی تھی لہذا سمندری لڑائی کی نوبت نہیں آئی اور مسلمان آسانی سے بوجیہ کے ساحل پر اتر گئے۔ آگے بڑھ کر اسپین کی فوجوں سے مقابلہ ہوا لیکن مسلمان اتنے جوش میں بھرے ہوئے تھے کہ پہلے ہی حملے میں عیسائی لشکر کے پاؤں اکھڑ گئے اور اس نے بھاگ کر ایک بڑے قلعے میں پناہ لی۔ یہ ان کا پہلے سے سوچا سمجھا منصوبہ تھا اس لیے کہ قلعے میں کئی مہینے کا کھانے کا سامان اکٹھا کر لیا گیا تھا اور قلعہ بھی ایسا منتخب کیا گیا تھا جس میں میٹھے پانی کا ایک قدرتی چشمہ موجود تھا۔ مسلمانوں کی فوجیں دس روز تک قلعے پر گولہ باری کرتی رہیں مگر اس کی فصیلیں اتنی مضبوط تھیں کہ مسلمانوں کو اسے توڑنے میں کامیابی نہیں ہوئی۔ بدقسمتی سے دسویں دن امیر البحر عروج شدید طور پر زخمی ہو گئے۔ انہیں علاج کے لیے افریقہ بھیج دیا گیا تو فوج میں بددلی پھیلنے لگی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ محاصرہ ختم کر کے سب کو افریقہ واپس آ جانا پڑا۔ واپسی میں انہیں جنیوا کا ایک تجارتی جہاز تنہا جاتا ہوا مل گیا چنانچہ وہ اسے پکڑ کر تونس لے گئے جب جہاز کے لٹنے کی خبر جنیوا پہنچی تو وہاں کی حکومت نے مشہور عیسائی امیر البحر ڈوریا کی کمان میں ایک بحری بیڑا روانہ کیا۔ اس بیڑے نے تونس کی بندرگاہ پر حملہ کیا اور اسے لوٹ کر تباہ کر دیا۔ جاتے ہوئے وہ لوگ اپنا لٹا ہوا جہاز بھی لیتے گئے۔ امیر البحر عروج کی بیماری کے دوران ان کے بھائی امیر البحر خیر الدین باربروسہ پورے بیڑے کے انچارج تھے۔ انہیں اس شکست کا بڑا صدمہ ہوا۔ چنانچہ اپنے بھائی کو بیمار چھوڑ کر وہ جزیرہ جربہ پہنچے اور بحری بیڑے کو ٹھیک ٹھاک کرنے میں مصروف ہو گئے۔ چند روز بعد امیر البحر عروج بھی صحت یاب ہو کر وہاں پہنچ گئے۔ اس وقت تک جنگی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ امیر البحر خیر الدین باربروسہ نے یہ تیاریاں جنیوا کی سرکوبی کی غرض سے کی تھیں لیکن امیر البحر عروج کے دل پر اسپین کی شکست کا داغ تھا لہذا انہوں نے جنیوا کے بجائے دوبارہ اسپین ہی کے ساحل کا رخ کیا۔ اسلامی بیڑے نے لنگر اٹھایا اور تیزی کے ساتھ بوجیہ جا پہنچا۔ عیسائی فوجیں پھر اسی قلعے میں محصور ہو گئیں۔ امیر البحر عروج اس مرتبہ قلعہ سر کرنے کی تیاریاں کر کے آئے تھے۔ چنانچہ چند روز کی لڑائی کے بعد دیواریں ٹوٹنے لگیں اور امید بندھ گئی کہ جلد ہی قلعے پر قبضہ ہو جائے گا لیکن عین اس موقع پر اسپین کو بحری کمک پہنچ گئی۔ اسپین کی حکومت نے یورپ کی دوسری

عیسائی طاقتوں سے درخواست کر کے یہ کمک منگوائی تھی۔

اب جنگ کا پانسہ پلٹ گیا اور مسلمان لشکر کو پسپا ہونا پڑا۔ یہ موقع ایسا تھا کہ مسلمانوں کے بہت سے جہاز بھی پکڑے جاتے لیکن امیر البحر عروج نے دانشمندی سے کام لیتے ہوئے اپنے سارے زائد جہازوں میں آگ لگوادی اور فوج کو باقی جہازوں میں لے کر واپس چلے آئے۔ لیکن شرم کی وجہ سے وہ تونس نہیں گئے بلکہ جبل بنی ہلال کی پہاڑی کھاڑی میں پہنچ کر لنگر ڈال دیا۔ یہاں جو لوگ آباد تھے وہ اپنی سرکشی کی وجہ سے دور دور مشہور تھے اور آج تک کوئی افریقی حکومت انہیں مطیع نہ کر سکی تھی لیکن امیر البحر عروج نے ان کے ساتھ نرمی اور محبت کا برتاؤ کیا کہ ان کے دل موہ لیے اور انہوں نے خود ہی ان کی اطاعت قبول کر لی اس کے بعد وہ دل و جان سے ان کی بحری مہموں میں شریک ہوتے رہے۔

اسپین کے شہروں مثلاً غرناطہ، اشبیلہ، قادس اور الیمامہ وغیرہ سے بڑی تعداد میں مسلمان ہجرت کر کے افریقہ کے ساحل پر پہنچے تھے۔ ان کی اکثریت تونس میں آباد ہوگئی تھی۔ خود امیر البحر عروج نے ان کی آبادکاری کے سلسلے میں بڑی خدمات انجام دی تھیں لیکن ان کی ایک اور خاصی بڑی تعداد الجزائر کے ساحل پر بڑی کسمپرسی کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ کیونکہ مقامی حکومت ان کی آبادی کے لیے کچھ نہ کر سکی تھی۔ اسپین کے عیسائی لٹیروں کی ٹولیاں ان غریبوں کی بستیوں پر آئے دن حملے کر کے ان کا سب کچھ لوٹ لے جایا کرتی تھیں۔ الجزائر میں سلطان سلیم کے پاس بری فوج تو بہت طاقتور تھی لیکن بحری طاقت نہ ہونے کے برابر تھی اسی لیے اسپین کے سمندری لٹیروں کے آگے ان کی ایک نہ چلتی تھی آخر سلطان سلیم نے امیر البحر عروج سے مدد کی درخواست کی۔ انہوں نے یہ درخواست قبول کر لی اور فوراً تیاریاں شروع کر دیں۔ ۱۵۱۶ء میں ایک مختصر مگر مضبوط بحری بیڑا لے کر امیر البحر عروج روانہ ہوئے۔ اس بیڑے میں سپاہیوں کی تعداد چھ ہزار سے اوپر تھی۔

الجزائر کے دارالحکومت الجزیرہ کے قریب ایک قلعہ پر اسپین والوں کا قبضہ تھا۔ امیر البحر عروج نے وہاں جا کر مقابل سمندر میں پڑاؤ ڈالا اور تیر کے ذریعہ یہ پیغام قلعے والوں کو بھیجا کہ اگر تم قلعہ ہمارے حوالے کر دو گے تو آزادی اور حفاظت کے ساتھ تمہیں یہاں سے نکل

جانے کی اجازت دے دی جائے گی۔

قلعے کے عیسائی حاکم نے جواب دیا کہ بوجیہ کے قلعہ میں دوبار ہم آپ کو پرکھ چکے ہیں اور آپ ہمارا امتحان لے چکے ہیں لہٰذا دھمکیاں دینا بیکار ہے۔ امیر البحر عروج نے قلعے کا محاصرہ کر لیا اور بیس دن تک گولہ باری جاری رکھی۔ نہ ان کا گولہ زیادہ دور جاتا تھا اور نہ اس میں زیادہ طاقت ہوتی تھی۔ اتفاق سے عروج کے سپاہیوں اور اسپین سے آئے ہوئے مہاجروں میں کسی بات پر جھگڑا ہو گیا جس نے بڑھ کر بغاوت کی شکل اختیار کر لی مہاجروں نے امیر البحر عروج کی فوجوں کو الجزئر سے نکال باہر کرنے کی سازش شروع کر دی لیکن سازشیوں کو گرفتار کر کے موت کی سزا دے دی گئی۔ اس میں کئی دن ضائع ہو گئے۔

موقع سے فائدہ اٹھا کر قلعے کے عیسائی حاکم نے اسپین سے مدد منگوالی۔ چنانچہ سات ہزار جوانوں پر مشتمل ایک بحری بیڑا بھیج دیا گیا جس کا سالار مشہور عیسائی امیر البحر ڈان ڈی گوڈی ویرا تھا۔ الجزیرہ کے بالمقابل کھلے سمندر میں دونوں بیڑوں میں خوفناک جنگ ہوئی۔ شروع میں عیسائی بھاری پڑ رہے تھے مگر امیر البحر عروج نے اپنے بیڑے کا رخ پھیر دیا اور کچھ جہازوں کی پوزیشن اس طرح تبدیل کر دی کہ عیسائی بیڑا دو طرف سے گھر گیا۔ چار گھنٹے کے اندر اندر عیسائیوں کو شکست ہو گئی اور امیر البحر ڈان ڈی گوڈی ویرا اپنا ایک جہاز تک نہ بچا سکا۔

اس فتح سے الجزائر میں امیر البحر عروج کی مقبولیت بہت بڑھ گئی چنانچہ انہوں نے ایک بڑی فوج بھی تیار کی اور اس کی مدد سے الجزائر پر قبضہ کر لیا۔ الجزائر کے ساحل پر متعدد قلعے اسپین والوں کے قبضے میں پہنچ چکے تھے۔ امیر البحر عروج نے ایک ایک کر کے یہ سارے قلعے عیسائیوں سے خالی کروالیے۔

اس وقت افریقہ کے شمالی ساحل پر مصر وغیرہ کا علاقہ تو سلاطین عثمانیہ کے قبضے میں تھا اس کے علاوہ تونس، فیض اور مراکش کی حکومتیں تھیں لیکن اب الجزائر کی حکومت ان میں سب سے طاقتور بن چکی تھی۔ امیر البحر عروج نے فوراً نئے سر سے بحری بیڑے کی تنظیم کی اور اسپین کے ساحلوں پر لگاتار حملے شروع کر دیئے۔ ہر حملے میں ان کے جہاز اسپین سے

مسلمان مہاجروں کو نکال لاتے تھے۔ اگر یہ سہولت نہ ہوتی تو وہ سارے مسلمان یا تو زبردستی عیسائی بنا لیے جاتے یا پھر شہید کر دیئے جاتے۔ نہ صرف اسپین کی حکومت بلکہ جنیوا نیپلز اور وینس کی حکومتیں بھی امیر البحر عروج کا نام سن کر کانپ اٹھا کرتی تھیں۔ دنیا کے کسی جہاز کی مجال نہیں تھی کہ وہ الجزائر کی حکومت کو محصول دیئے بغیر بحیرہ روم سے گزر سکے خاص کر اسپین کے تجارتی بیڑوں کا تو کام ہی بند ہو چکا تھا۔ وہاں کے تاجر برابر اپنی حکومت پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ وہ امیر البحر عروج کا زور توڑنے کے لیے کارروائی کرے مگر اس کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔

کچھ عرصے بعد جب چارلس پنجم اسپین کے تخت پر بیٹھا تو اس نے سب سے پہلے یہ کیا کہ چپکے چپکے تیاریاں شروع کر دیں۔ اسپین کے بچے کھچے جہاز اکٹھے کیے۔ کچھ جہاز یورپ کی دوسری عیسائی حکومتوں نے دیئے۔ برّی فوجیں افریقہ لے جانے کے لیے تجارتی جہاز حاصل کر لیے گئے اور اس طرح پندرہ ہزار بحری اور دس ہزار برّی فوج لے کر اسپین نے الجزائر پر حملہ کیا۔ یہ حملہ بالکل غیر متوقع طور پر ہوا تھا۔ امیر البحر عروج اس وقت دار الحکومت الجزیرہ سے دور تلمسان نامی علاقے میں شکار پر گئے ہوئے تھے اور ان کے پاس صرف پندرہ سو سپاہی تھے۔ یہ اطلاع ملنے پر اسپینی سپہ سالار کا دل باغ باغ ہو گیا۔ اس نے اپنی بحری فوج کو تو الجزیرہ میں چھوڑا اور دس ہزار بری فوج لے کر سیدھا تلمسان کا رخ کیا۔ عیسائی دنیا کا خیال تھا کہ جیسے ہی ان کا لشکر وہاں پہنچے گا عروج یا تو راہ فرار اختیار کر لے گا یا ان کی من مانی شرطوں پر صلح کی درخواست کرے گا لیکن یہ دیکھ کر عیسائی سپہ سالار دنگ رہ گیا کہ امیر البحر عروج اپنی مختصر جمعیت کے باوجود جنگ پر تیار ہو گئے۔ ان پندرہ سو آدمیوں میں ملازمین اور دوسرے غیر فوجی لوگ بھی شامل تھے۔ ہتھیار بھی مکمل نہ تھے۔ شکار ذبح کرنے کی چھریوں اور چاقوؤں تک سے مسلح ہو کر انہوں نے عیسائیوں کا مقابلہ کیا۔ یورپین مورخین نے بڑی فراخدلی کے ساتھ مسلمانوں کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ پندرہ سو آدمیوں میں سے ایک نے بھی پیٹھ نہیں دکھائی سب کے سب شہید ہو گئے اور انہی میں خود سلطان عروج یا امیر البحر عروج باربروسہ بھی شامل تھے۔ ان کی شہادت ایک عظیم باب کا خاتمہ تھی۔ ایک

ایسا زریں باب جس پر نہ صرف اسلامی تاریخ بلکہ بحریہ کی عالمی تاریخ ہمیشہ فخر کرتی رہے گی شہادت کے وقت ان کی عمر صرف پینتالیس سال تھی۔

امیر البحر خیر الدین پاشا بار بروسہ:

میر البحر خیر الدین پاشا، امیر البحر عروج کے نہ صرف چھوٹے بھائی بلکہ شاگرد بھی تھے لیکن انہوں نے اپنے بھائی سے زیادہ شہرت پائی۔ لفظ بار بروسہ حالانکہ دونوں کے نام کا جز تھا مگر تاریخ میں جہاں صرف بار بروسہ لکھا ہو وہاں امیر البحر خیر الدین پاشا ہی مراد ہوتے ہیں۔ ابتدا میں وہ ذاتی جہاز لے کر بحیرہ روم میں عیسائی تجارتی جہازوں پر چھاپے مارا کرتے تھے۔ بعد میں جب ان کی طاقت بڑھ گئی تو انہوں نے افریقہ کے ساحلوں پر حملے شروع کیے اور الجزیرہ شہر اور اس کے آس پاس کے علاقے پر قبضہ کرلیا۔لیکن یہ دیکھ کر کہ وہ اپنی حکومت نہیں چلاسکیں گے انہوں نے یہ علاقے ترکی کے عثمانی سلطان سلیم کے حوالے کر دیئے۔ سلطان سلیم مشہور عثمانی سلطان محمد فاتح کا بیٹا تھا۔ اس کے بعد جب اس کا بیٹا سلیمان اعظم قانونی تخت پر بیٹھا تو اس نے خیر الدین پاشا کو پورے عثمانی بیڑے کا امیر البحر مقرر کیا۔

عثمانی ملازمت کے دوران سب سے پہلے انہیں شہنشاہ چارلس کے بیڑے پر حملے کا حکم دیا گیا تھا۔خیر الدین پاشا بار بروسہ نے عیسائیوں کے اس زبردست بیڑے کو تباہ کر کے کورن پڑاس اور دوسرے ساحلی شہروں پر قبضہ کرلیا اس کے بعد انہوں نے اٹلی کے ساحلوں پر کئی حملے کیے اور بہت سا علاقہ فتح کر کے عثمانی سلطنت میں شامل کر دیا۔ چارلس کے مشہور امیر البحر اینڈریوڈوریا کو انہوں نے متعدد بار شرمناک شکستیں دیں۔

اس عہد میں تونس کی الگ حکومت تھی لیکن شمالی افریقہ میں اس سے ملا ہوا الجزائر سلطنت ترکی کا علاقہ تھا۔ امیر البحر خیر الدین پاشا بار بروسہ نے سلیمان اعظم کی ہدایت پر تونس پر حملہ کیا اور سلطان حسن کی بحری اور برّی طاقت کو شکست دے کر اسے الجزائر میں شامل کر دیا۔ تونس کے حکمران سلطان حسن اور عیسائی شہنشاہ چارلس کے درمیان مشترکہ دفاع کا معاہدہ موجود تھا۔ اس کے تحت سلطان حسن نے اس سے مدد کی درخواست کی۔ عیسائی شہنشاہ چارلس

پانچوں جہاز کا زبردست جنگی بیڑا اور تیس ہزار فوج لے کر تونس پر حملہ آور ہوا۔ عیسائی فوجوں کی تعداد بہت زیادہ تھی چنانچہ خیرالدین پاشا کو شکست کھا کر تونس سے نکلنا پڑا۔ چارلس نے تونس کے تیس ہزار مسلمان مردوں عورتوں اور بچوں کو قتل کرا دیا اور ہزاروں خاندان جان بچانے کے لیے عیسائی بن گئے۔

اس شکست کے بعد سلیمان اعظم نے مصلحتاً فرانس سے معاہدہ کر لیا جس کے مطابق دونوں حکومتوں نے بوقت ضرورت ایک دوسرے کی مدد کرنے کا وعدہ کیا۔ کچھ دن بعد فرانس اور شہنشاہ چارلس کے درمیان ایک بڑی جنگ چھڑ گئی جس میں یورپ کی تقریباً تمام طاقتیں کسی نہ کسی طرح شریک تھیں سلیمان اعظم نے معاہدے کے مطابق فوراً خیرالدین پاشا کو ایک مضبوط بیڑا دے کر فرانس کی مدد کے لیے روانہ کیا۔ وہ اپنی پچھلی شکست کا انتقام لینے پر تلے ہوئے تھے۔ اس لیے ان کا اور ان کی بحری فوج کا جوش وخروش بہت بڑھا ہوا تھا۔ کافو نامی ایک جزیرے میں چارلس کا بہت بڑا بحری اڈہ تھا۔ خیرالدین پاشا نے کافو کا محاصرہ کر لیا اور چند ہی روز میں اسے فتح کر کے اس پر سلطان ترکی کا پرچم لہرا دیا۔ جنگ میں وینس کی حکومت بھی چارلس کی طرف سے شریک تھی۔ لہٰذا خیرالدین پاشا نے بحرہ ایجئین کے تمام جزیروں کو یکے بعد دیگرے فتح کر لیا۔ یہ سارے جزیرے وینس کے ماتحت تھے۔ کچھ عرصے بعد فرانس اور چارلس کے درمیان نیس کے مقام پر عارضی صلح ہو گئی مگر ترکی نے جو علاقے فتح کر لیے تھے، ان پر اسی کا قبضہ رہا۔ اس جنگ میں ترکی کو بہت سے مفتوحہ علاقے، اہم بندرگاہ اور ایسے جزیرے ہاتھ آئے جن کی وجہ سے سمندروں پر سلطنت عثمانیہ کی گرفت مضبوط ہو گئی۔

۹۴۵ھ میں پوپ فرڈینینڈ نے جو ہنگری کا شہنشاہ بھی تھا جمہوریہ وینس اور شہنشاہ چارلس سے مل کر ترکوں کے خلاف ''اتحاد مقدس'' قائم کیا۔ پوپ نے ایک فتوے کے ذریعہ اس جنگ کو مذہبی لڑائی یعنی ''صلیبی جنگ'' قرار دیا۔ چنانچہ یورپ کی دوسری عیسائی حکومتوں اور عام لوگوں نے بھی اتحادیوں کی مدد کی۔ اس طرح جو بحری بیڑہ فراہم کیا گیا وہ عثمانی بیڑے سے کئی گنا زیادہ بڑا تھا۔ اس کی کمان عیسائی دنیا کا سب سے بڑا امیر البحر انڈریا ڈوریا کر رہا تھا۔

عثمانی بیڑے کے انچارج امیر البحر خیرالدین پاشا باربروسہ تھے۔ جزیرہ پرویسیا کے

قریب یہ مشہور تاریخی جنگ ہوئی۔ جس میں اتحادی بیڑے کو شرمناک شکست سے دوچار ہونا پڑا اور ان کے سارے بحری مقبوضات ترکی کے زیرِنگین آ گئے۔ اسپین کے شہنشاہ چارلس کو اس شکست کا انتقام لینے کی فکر پڑ گئی۔ پھر الجزائر کی طرف سے اسے نہ صرف اسپین بلکہ اپنے اطالوی ساحلی مقبوضات کے لیے بھی خطرہ نظر آ رہا تھا۔ اس لیے ۹۴۶ھ میں اس نے ایک بڑا بحری بیڑہ الجزائر پر حملے کے لیے روانہ کیا لیکن خیر الدین پاشا نے اسے بری طرح شکست دے کر بھگا دیا۔

اس سے اگلے سال فرانس نے نیس کا معاہدہ ختم کر کے چارلس کے خلاف دوبارہ اعلان جنگ کر دیا۔ اس جنگ میں بھی ترکی نے معاہدے کے مطابق فرانس کا ساتھ دیا اور خیر الدین پاشا نے شہر نیس فتح کر لیا۔ ترک بیڑے کی ان خدمات کے اعتراف کے طور پر شہنشاہ فرانس نے ازخود اپنی طولون کی بندرگاہ ترکی کے حوالے کر دی۔

۹۵۱ھ تک خیر الدین پاشا نے بحرہ روم میں متعدد لڑائیوں میں حصہ لیا اور سب میں کامیابی حاصل کی۔ یورپ والے انہیں ناقابل شکست سمجھنے لگے اور پھر تو یہ عالم ہو گیا کہ عیسائی ملاح اور سپاہی بحری فوج میں بھرتی کے وقت پہلے یہ شرط رکھنے لگے کہ انہیں بار بروسہ سے لڑنے کو نہیں کہا جائے گا۔

۹۵۳ھ کے آخر میں امیر البحر خیر الدین پاشا بار بروسہ کا انتقال ہو گیا۔ انہوں نے اپنے زمانے میں ترکی کو دنیا کی سب سے بڑی طاقت بنا دیا تھا۔ بحیرۂ روم احمر اور بحیرۂ عرب میں ان کے نام کے ڈنکے بجتے تھے اور جبل الطارق سے لے کر ہندوستان کے مغربی ساحل تک ان کا نام انتہائی عزت و احترام کے ساتھ لیا جاتا تھا۔ ایک زمانے میں وہ عیسائی تجارتی جہاز لوٹنے کا کام کیا کرتے تھے۔ اس طرح انہوں نے بے شمار دولت اکٹھی کی تھی۔ پھر سلطنت عثمانیہ کی ملازمت کے دوران بھی انہوں نے تنخواہ کے علاوہ انعام و اکرام میں بڑی دولت حاصل کی۔ شہنشاہ فرانس نے بھی بہت کچھ دیا۔ یہ ساری دولت انہوں نے اپنے ساتھیوں میں بانٹ دی۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے سپاہی اور عملے کے لوگ ان پر جان چھڑکتے تھے اور جہاں ان کا پسینہ گرتا وہاں خون بہانے سے بھی دریغ نہ کرتے تھے۔ مرتے وقت ان کی عمر نوے

سال تھی۔ اس عمر میں بھی وہ بے حد چاق وچوبند تھے اور سخت سے سخت عملی محنت سے نہیں گھبراتے تھے۔

انتقال کے بعد سلطان نے ان کی قبر سمندر کے کنارے اس طرح سے بنوائی کہ اس کی لہریں ہر وقت قبر کی دیوار چومتی رہیں۔ درہ دانیال میں شاخ زرّیں کے سرے پر بکشطاش میں ان کی یہ قبر آج بھی موجود ہے اور ترکی کا بحری بیڑا جب بھی درہ دانیال سے گزرتا ہے، دنیا کے اس عظیم امیر البحر کو سلام پیش کرتا ہے۔

❀❀❀

رکن الدین بیبرس رحمۃ اللہ علیہ



مؤرخین نے سلطان بیبرس کی شجاعت' انصاف پروری' شوق جہاد سخت کوشی 'جو دوسخا' بیدار مغزی اور عسکری قابلیت کی بے انتہا تعریف کی ہے سلطان کی سخت کوشی کا یہ عالم تھا کہ وہ رات کو زرہ پہنے ہوئے سو جاتا تھا اور پاؤں سے مہمیزیں بھی نہ اتارتا تھا

تاریخ کی خونخوار سپر پاور کو شکست دینے والا عظیم کمانڈر

یہ ۶۵۸ھ کی ایک گرم دوپہر تھی۔ قاہرہ کے در و دیوار گرم لو کے تھپیڑوں سے جھلس رہے تھے۔ اس وقت دھوپ سے خائف سبھی کمروں میں تھے۔ سڑکیں دور دور تک سنسنان نظر آتی تھیں۔ البتہ تھوڑی دیر بعد حفاظت کے لیے متعین خلیفہ کے سپاہیوں کے قدموں کی آواز اس سناٹے کو ختم کر دیتی۔ ان کے گزر جانے کے بعد پھر ویسے ہی سناٹا چھا جاتا۔

اس خاموشی کو اچانک انتہائی بھاری بھرکم بوٹوں کی آواز نے متاثر کر دیا۔ چوکنے سپاہی فوراً اس آواز کے تعاقب میں بھاگ کر ادھر آئے۔ ان کے سامنے سفارتی لباس پہنے دو شخص کھڑے تھے۔ لمبے لمبے بال، میلے جیکٹ، کپڑے بھی انتہائی میلے، دانت میل سے پیلے، چہروں پر ظلم و بربریت کا عکس، انداز انتہائی وحشیانہ اور چلنے کا انداز بھی متکبرانہ تھا۔ یہ لوگ اپنے حلیے سے پہچانے جا رہے تھے کہ یہ تاتاری ہیں۔ وہ تاتاری جن کے ظلم وستم سے بچے کھچے لوگ قاہرہ میں پناہ گزین تھے۔ تاتاری اب تک دنیا کے بیشتر حصے کو اپنے وحشی پن کا نشانہ بنا چکے تھے۔ مسلمانوں کے ملکوں سے صرف ایک مصر ہی ان کی دست برد سے محفوظ تھا۔ مگر تاتاری سفیروں کی آمد کی خبر نے اہل قاہرہ کو بھی جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ تاتاریوں کے ہاتھوں تباہ ہونے والے علاقوں کے بچے کھچے تباہ حال مسلمانوں نے مصر کو جائے پناہ سمجھتے ہوئے

وہاں کا رخ کیا تھا۔ قاہرہ کے گلی کوچے پناہ گزینوں سے بھرے پڑے تھے۔ ان پناہ گزینوں نے تاتاریوں کی درندگی کے مظاہرے اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے، اس لیے وہ تاتاریوں سے خوفزدہ تھے۔ ان کی زبان سے یہی الفاظ نکلتے تھے۔

"تاتاری سفیروں کی آمد کا مطلب تباہی و بربادی"

"تاتاری خدا کا قہر ہیں"

"تاتاری ناقابل شکست ہیں"

"تاتاری انسان نہیں بلکہ کوئی اور مخلوق ہیں"

اس طرح کی مختلف آوازیں قاہرہ میں ہر طرف گونج رہی تھیں اور وہ لوگ جنہوں نے تاتاریوں کو نہیں دیکھا تھا، وہ بھی اپنے دلوں میں تاتاریوں کی وحشت محسوس کر رہے تھے۔ لیکن انہی گلیوں اور بازاروں میں کچھ نوجوان ایسے بھی تھے جن کے چہروں پر خوف وہراس کی بجائے غم وغصے کی سرخی تھی اور ان نوجوانوں کے ہاتھ بے اختیار تلواروں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ نعرے لگا رہے تھے کہ

"ہم بغداد کا بدلہ لیں گے"

"اللہ کی قسم تاتاریوں کو سبق سکھا دیں گے"

"ایک بھی تاتاری بچ کر نہیں جا سکے گا"

تاتاری سفیر، جن کی آمد کی خبر نے قاہرہ میں ہل چل مچا دی تھی۔ اس وقت مصر کے بادشاہ ملک المظفر سیف الدین کے دربار میں کھڑے تھے۔ ان کا انداز ایسا تھا کہ جیسے مصر ان کی جاگیر اور ملک المظفر ان کا غلام ہے۔ انہوں نے درباری آداب کی ذرا برابر بھی پرواہ نہ کرتے ہوئے نہایت گستاخانہ انداز میں اپنے آقا ہلاکو خاں کا خط ملک المظفر کے سامنے پھینک دیا۔ ملک المظفر نے ان کے اس گستاخانہ رویئے کو نہایت تحمل سے برداشت کرتے ہوئے ہلاکو خان کا خط پڑھوا کر سنا، خط میں لکھا تھا۔

"یہ اس کا فرمان ہے جو ساری دنیا کا آقا ہے۔ اپنی شہری پناہیں ختم کر دو اور اطاعت قبول کر لو۔ اگر ایسا کرو گے تو تمہیں امن وچین سے زندہ رہنے دیا جائے

گا، ورنہ تمہارے ساتھ جو ہوگا، اسے بلند و بالا آسمان کے سوا کوئی نہیں دیکھ سکے گا۔''

ابھی دربار میں خاموشی طاری تھی چند لمحے بعد سلطان نہایت نرم لہجے میں ایلچیوں سے یوں گویا ہوا ''ہلاکو کا ہم نے کچھ نہیں بگاڑا اس لیے اسے ہم پر حملہ کرنے سے باز رہنا چاہئے۔'' سلطان کے جواب سے تاتاریوں کے بگڑے ہوئے چہرے مزید بگڑے گئے اور وہ نہایت بدتہذیبی سے بولے۔

''تم نہایت خودسر اور ضدی حکمران ہو تم ہم سے واقف نہیں، ورنہ انکار نہ کرتے۔''

ایلچیوں کا لہجہ سلطان کی برداشت سے باہر تھا ''تم ایلچی ہو اور ایلچی ہی رہو، اپنا لہجہ درست رکھو اور ہمیں سبق نہ پڑھاؤ'' سلطان کی آواز میں غصہ تھا۔ سلطان کی بات سن کر تاتاری ایلچی غصہ سے چلانے لگے۔ ''تم ہماری بات نہیں مانو گے ہماری طاقت اور شجاعت کے افسانے شاید تم نے سنے نہیں۔'' ایلچیوں کے گستاخانہ جواب سن کر امرائے مصر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا ''خاموش''۔ پہلی صف میں بیٹھے ایک نوجوان امیر کی آواز سے دربار لرز اٹھا۔ اس کی تلوار میان سے باہر آ چکی تھی۔ ''اگر مجھے سلطان کا لحاظ نہ ہوتا تو اللہ کی قسم تمہاری گردنیں تمہارے دھڑ سے علیحدہ کر چکا ہوتا۔'' نوجوان کی آواز جوش غضب سے لرز رہی تھی۔

''سلطان معظم! ان کا رویہ سفارتی آداب کے منافی ہے شاید ہلاکو نے اپنے سپاہیوں کو نہتے انسانوں کے قتل کے سوا کچھ نہیں سکھایا۔ ورنہ یہ اس طرح یہاں چلا نہ رہے ہوتے۔ مجھے اجازت دیں کہ ان کے سر کاٹ کر لاشیں قاہرہ کے چوراہوں پر لٹکا دوں تاکہ آئندہ ہلاکو اپنے ایلچیوں کو مصر بھیجتے وقت سفارتی آداب ضرور سکھائے۔'' یہ امیر جس کی تلوار بھرے دربار میں تاتاریوں کے خلاف میان سے باہر آ گئی تھی اور جس نے تاتاریوں کی سر بریدہ لاشوں کو دیدہ عبرت نگاہ بنا کر مصر کے چوراہوں پر لٹکا دیا تھا۔ وہ مصری عوام کے لیے ناواقف نہیں تھا۔ ابھی چند ہی سال قبل منصور کے میدان میں لڑی جانے والی ساتویں صلیبی جنگ میں اس نوجوان کی حیرت انگیز حربی چالوں نے عیسائی لشکر کو عبرتناک شکست سے دوچار کیا تھا۔ منصور کا یہ مرد میدان جس کا بچپن غلاموں کی منڈیوں میں بکتے ہوئے گزرا، اہل مصر کی دھڑکنوں میں بستا تھا۔ لوگ اسے ''امیر رکن الدین بیبرس'' کے نام سے جانتے تھے جبکہ مورخین اسے

''صلاح الدین ایوبی ثانی، سلطان رکن الدین بیبرس'' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

سلطان رکن الدین بیبرس 619ھ (1213ء) میں دشت قپچان میں پیدا ہوا۔ اس کا اصل نام محمود تھا۔ جب تاتاریوں نے چنگیز خان کی قیادت میں ''خوارزم'' پر حملہ کیا تو بہت سے کم سن بچوں اور نوجوانوں کو غلام بنا کر اپنے ساتھ لے گئے۔ محمود بھی اسی دادا گیر میں گرفتار ہوا اور چند دینار کے عوض دمشق کے ایک مسلمان امیر نے اسے خرید لیا۔ اس امیر کی ایک بہن فاطمہ تھی۔ فاطمہ نامی اس مہربان خاتون کا ایک بیٹا جس کا نام بیبرس تھا اور جو محمود کا ہم شکل تھا، نوجوانی ہی میں وفات پا چکا تھا۔ محمود کی بیبرس سے مشابہت کی بنا پر فاطمہ خاتون اسے ''بیبرس'' کے نام سے پکارتی۔ اس نام کی خوبی دیکھیے کہ محمود تاریخ میں بیبرس کے نام ہی سے مشہور ہوا۔ فاطمہ کا ایک بھائی مصر کے حکمران ملک الصالح کے دربار میں کام کرتا تھا۔ اس نے اس بچے کی اعلیٰ خوبیوں کو دیکھتے ہوئے اسے ملک الصالح کی خدمت میں پیش کر دیا۔ مشہور مستشرق ''پروفیسر فلپ کے حتی'' نے تاریخ لبنان میں لکھا ہے کہ بیبرس 800 درہم کے عوض دمشق کی منڈی میں فروخت ہوا لیکن خریدار نے یہ کہہ کر سودا فسخ کر دیا کہ لڑکے کی کرنجی آنکھوں میں سقم ہے۔ پھر حکمران مصر نے اسے حماۃ کے ایک شخص سے خرید لیا۔ بیبرس نے ملک الصالح کی زیر سرپرستی کتابی علوم اور حربی فنون کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد حسب دستور فوج میں شامل ہو گیا۔ اپنی غیر معمولی ذہانت اور جسمانی قوت کی بدولت وہ بہت جلد فوج کے چند دستوں کا افسر بن گیا۔ لیکن ابھی وہ زیادہ مشہور نہیں ہوا تھا۔ مسلمان اس کے نام سے اس وقت واقف ہوئے جب فرانس کے بادشاہ لوئی نہم نے ساتویں صلیبی جنگ کا اعلان کر کے مصر کے سرحدی شہر ''دمیاط'' کا محاصرہ کر لیا۔ ملک الصالح ان دنوں سخت بیمار تھا اس لیے وہ ''دمیاط'' کی حفاظت کا معقول بندوبست نہیں کر سکا۔ چند سخت حملوں کے بعد عیسائیوں کے اس متحدہ لشکر نے ''دمیاط'' فتح کر لیا۔ ملک الصالح جو ان دنوں منصورہ کے مقام پر مقیم تھا۔ دمیاط کی فتح کے چند روز بعد انتقال کر گیا۔ ملک الصالح کی بیوی ''ملکہ شجرۃ'' ایک بلند حوصلہ اور شجاع خاتون تھی۔ اس نے لشکر سے اپنے خاوند کی وفات کی خبر چھپا لی اور ملک الصالح کے بڑے بیٹے نوران شاہ کو منصور بلا بھیجا۔ نوران شاہ کے منصورہ پہنچنے سے پہلے

ہی عیسائی افواج نے منصورہ پر حملہ کر دیا۔ اس موقع پر مصری فوج کے ایک نوجوان افسر نے شجاعت اور جانبازی کی حیرت انگیز مثال قائم کی۔ وہ ہاتھ میں نیزہ تھام کر اپنے عربی گھوڑے کو دوڑاتا ہوا آگے بڑھا اور آن کی آن میں عیسائی فوج کی صفیں درہم برہم کر دیں۔ عیسائی سپاہی پرے باندھ کر اس نوجوان کو پکڑنے اور قتل کرنے کے ارادے سے نکلے لیکن اس کی شہسواری اور نیزہ بازی کے آگے ان کی ایک نہ چلی اور وہ بانکا سپاہی عیسائی لشکر کی صفیں توڑتا ہوا قلب لشکر میں شاہ لوئی تک پہنچ گیا مگر لوئی کی قسمت اچھی تھی کہ شام کا اندھیرا اس وقت تک چھا چکا تھا۔ لہٰذا وہ شہسوار لوئی کے قریب سے گزرتا ہوا قلعہ میں داخل ہوگیا۔ یہ نوجوان ملک الصالح کا غلام ''امیر بیبرس بندقدار'' تھا۔ جس کی سپاہیانہ یلغار نے عیسائی لشکر پر لرزہ طاری کر دیا تھا۔ عیسائیوں میں شکست کے آثار نمودار ہو چکے تھے مگر لوئی کی موجودگی نے ان میں لڑنے کا حوصلہ باقی رکھا اور انہوں نے منصورہ کے باہر ڈیرے ڈال دیئے۔ اسی اثناء میں توران شاہ بھی منصورہ پہنچ گیا۔ توران شاہ کے پہنچتے ہی ''ملکہ شجرہ'' نے ملک الصالح کی موت کا اعلان کر دیا اور امرائے مصر نے توران شاہ کو ملک معظم کا خطاب دے کر تخت پر بٹھا دیا۔

لوئی نے جب محسوس کیا کہ کھلے میدان میں مسلمانوں کا پلڑہ بھاری ہے تو اس نے 2 محرم 648ھ کی شام ''دھباط'' کی طرف پسپا ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ کامیاب پسپائی کے لیے اس نے اپنی فوج کے تجربہ کار دستوں کو آگے بڑھایا تاکہ مسلمانوں کو جنگ جاری رکھنے کا دھوکہ دے سکے۔ لیکن اس کی یہ چال ''امیر بیبرس کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔'' بیبرس نے سالار لشکر سے اجازت لے کر اپنے دستوں کے ساتھ ایک لمبا چکر کاٹا اور عیسائی افواج کے عقب میں پہنچ گیا۔ عقب میں پہنچ کر بیبرس نے اپنے سپاہیوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک حصہ بھاگتے ہوئے عیسائی سپاہیوں کو قتل عام کرنے لگا جبکہ بیبرس دوسرے حصے کے ساتھ عیسائی لشکر کے قلب کی طرف بڑھا جہاں لوئی فوجوں کی کمان کر رہا تھا۔ فرانس کے نائٹ اپنے بادشاہ کو بچانے کے لیے جان توڑ کر لڑے لیکن بیبرس کے زوردار حملوں نے چند ہی لمحوں میں ان کی جمعیت کو تتر بتر کر دیا اور شاہ لوئی عین میدان جنگ میں بیبرس کے ہاتھوں

گرفتار ہو گیا۔ اس طرح ساتویں صلیبی جنگ عیسائیوں کی ذلت آمیز شکست پر ختم ہوگئی۔ اس جنگ میں صلیبی مقتولوں، زخمیوں اور قیدیوں کی تعداد 50,000 کے لگ بھگ تھی اور مال غنیمت کا تو کوئی حساب ہی نہیں تھا۔ شاہ لوئی کو ایک معزز قیدی کی حیثیت سے منصورہ کے امیر فخر الدین بن لقمان کے گھر نظر بند کر دیا گیا۔ ڈیڑھ ماہ کی قید کے بعد جب شاہ لوئی ایک خطیر زر فدیہ اور جنگی قیدیوں کی رہائی کے عوض وطن واپس روانہ ہوا ساتویں صلیبی جنگ نے بیبرس کو بام عروج پر پہنچا دیا۔ اس کی شجاعت کے قصے زبان زد عام ہو گئے اور لوگ دل سے اس غلام کی عزت کرنے لگے۔ جس کی شجاعت اور دلاوری نے جنگ کا پانسہ مسلمانوں کے حق میں پلٹ دیا تھا لیکن قدرت کو بیبرس سے اس سے بھی بڑا امتحان لینا مقصود تھا اور وہ امتحان تھا تاتاریوں کی یلغار کا مقابلہ، جس کا دوسرا دور چنگیز خان کے پوتے ہلاکو کے عہد حکومت سے شروع ہوا تھا۔

چنگیز خان کے عہد حکومت مین تاتاریوں کی فتوحات کا سیلاب جیحوں اور خوارزم سے بڑھ کر بغداد کی سرحدوں تک پہنچ چکا تھا۔ لیکن چنگیز خان کی ناگہانی موت نے بغداد کو تاتاریوں کی یورش سے محفوظ رکھا۔ چنگیز خان کے جانشین اپنے معروضی حالات کی بنا پر اسلامی ممالک پر یلغار کا سلسلہ جاری نہ رکھ سکے۔ اس کے برعکس اگلے تیس سالوں میں تاتاریوں کے گھوڑوں نے وسط یورپ اور روش سے ملحقہ کئی علاقوں کو روند ڈالا۔ مسلمانوں کی بدبختی کا آغاز اس وقت ہوا جب تاتاریوں کے خان اعظم نے ہلاکو کو مشرقی مقبوضات کا حاکم مقرر کیا۔ چنگیز خان کا یہ پوتا وحشت و بربریت اور اسلام دشمنی میں اپنے دادا سے کہیں آگے تھا۔ اسلام ایک بڑی وجہ اس کی عیسائی بیوی دوقوز خاتون اور وزیر نصیر الدین طوسی (یہ وہی نصیر الدین طوسی ہے جو مشہور سائنسدان بھی تھا نظریاتی طور پر شیعہ تھا) تھے۔ یہ دونوں ہلاکو خان کو اسلام اور خلیفہ بغداد کے خلاف مسلسل بھڑکاتے رہتے۔ آخر ان کی کوششیں رنگ لائیں اور ہلاکو خان نے بغداد کا محاصرہ کر لیا۔ بغداد پر حملہ سے قبل نصیر الدین طوسی، خلیفہ بغداد کے وزیر ابن علقمی (یہ بھی شیعہ تھا) سے ساز باز کر کے ہلاکو خان کو یہ یقین دلا چکا تھا کہ خلیفہ زیادہ دیر ہلاکو خان کا مقابلہ نہ کر سکے گا اور ابن علقمی خلیفہ کو ہلاکو سے صلح پر مجبور کر دے گا۔ ایسا

ہی ہوا خلیفہ مستعصم باللہ نے 40 دن تک ہلاکو کے حملوں کا مقابلہ کیا لیکن پھر ابن علقمی کے کہنے پر صلح کر لی اور سلطنت اس کے حوالے کر دی۔ اس کے بعد بغداد پر جو کچھ بیتی اس کی داستان ناگفتنی ہے۔ دارالسلام بغداد جس کا دروازہ صدیوں سے بڑے بڑے باجبروت بادشاہوں کے بوسوں کی زینت بنا ہوا تھا وہاں 4 ہفتوں تک زبان شمشیر کے علاوہ کوئی زبان نہیں بولی گئی۔ 20 لاکھ آبادی کے اس عظیم الشان شہر میں 17 لاکھ انسان نہایت بے دردی سے قتل کر دیئے گئے۔ خلیفہ معتصم سے جان بخشی کا وعدہ کیا گیا لیکن چوتھے ہی روز اسے ایک قالین میں لپیٹ کر لاتیں اور گھونسے مار مار کر قتل کر دیا گیا کیونکہ چنگیز خان کے ''یساق'' (مقدس قوانین کی کتاب) میں لکھا تھا کہ کسی بادشاہ کے خون سے تلوار رنگین نہیں ہونی چاہئے۔

ہلاکو خان کی قتل وغارت کی خبریں مصر پہنچ رہی تھیں۔ پناہ گزینوں کے تباہ حال قافلوں نے تاتاریوں کی وحشت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا تھا گویا وہ کوئی مافوق الفطرت شے ہوں۔ لہٰذا مصری مسلمان بھی خوف وہراس اور مایوسی کی اس فضاء کی لپیٹ میں آ رہے تھے جو قوموں کی زندگی کے لیے زہر ہلاہل سے بھی زیادہ مہلک ثابت ہوتی ہے۔

خوف اور مایوسی کی یہی وہ فضا تھی جسے دیکھتے ہوئے ''امیر بیبرس'' نے سلطان کو تاتاریوں کی لاشیں مصر کے چوراہوں میں لٹکانے کا مشورہ دیا تھا تاکہ مسلمانوں کے دلوں سے تاتاریوں کا خوف ختم ہو سکے اور واقعی بیبرس کا یہ مشورہ صائب اور درست ثابت ہوا اور مسلمانوں کے دلوں سے تاتاریوں کی ہیبت ختم ہونے لگی اور پھر جب مسلمانوں کو یہ علم ہوا کہ سلطان نے ''امیر بیبرس'' کو ہلاکو خان سے مقابلے کے لیے سالار مقرر کیا تو مسلمانوں کے دل یقین کے جذبوں سے معمور ہونے لگے۔ کیونکہ لوگوں کو اس بانکے جرنیل اور نڈر سپاہی کی شجاعت پر بھروسہ تھا جو تاتاریوں کی طاقت کے افسانے سن کر قہقہے لگایا کرتا تھا اور کہا کرتا تھا ''کہ تاتاریوں کو ہم سے ٹکرانے دو پھر ان کو پتہ چلے گا۔''

بیبرس نے مصری افواج کا سالار مقرر ہوتے ہی تاتاریوں کے خلاف اعلان جہاد کر دیا اور مصر کے ہر تندرست اور بالغ مرد پر فوجی خدمت لازمی قرار دے دی اور نہایت جوش وخروش

سے جنگی تیاریوں میں لگ گیا۔ اسی اثناء میں اسے خبر ملی کہ ہلاکو خان کو کچھ سیاسی وجوہات کی بنا پر وطن واپس جانا پڑا ہے اور وہ پیچھے اپنے سالار قطبوغا (Kitboga) کو ایک لشکر جرار دے کر اور اپنا نائب بنا کر چھوڑے جا رہا ہے۔ یہ خبر ملتے ہی ''بیبرس'' نے وہ فیصلہ کیا جو کسی کے وہم وگمان میں بھی نہیں آ سکتا تھا۔ اب تک بیبرس کی تمام تیاریاں دفاعی نوعیت کی تھیں لیکن اب اس نے آگے بڑھ کر تاتاریوں پر حملہ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ بیبرس نہایت سرعت سے فلسطین میں داخل ہوا اور اپنی فوج کے متعدد دستے صلیبی قلعوں کے گرد پھیلا دیئے تاکہ وہاں سے قطبوغا کو کوئی مدد نہ مل سکے۔ اس کے بعد اسلامی لشکر نے آگے بڑھ کر تاتاریوں کے قریب پڑاؤ ڈال دیا۔

بروز جمعہ 15 رمضان المبارک 458ھ کو دونوں لشکر عین جالوت (Ain Jalut) کے مقام پر متصادم ہوئے۔ بیبرس نے اپنی فوج کے آزمودہ کار دستوں کو گھات میں بٹھا کر، اپنے فوج کے ہلکے سواروں کو بڑے رقبے میں پھیلا کر آگے بڑھایا۔ تاتاریوں نے پوری قوت سے مصری سواروں پر حملہ کیا اور انہیں پیچھے دھکیلتے ہوئے اندھا دھند آگے بڑھنے لگے۔ مسلمان سواروں نے تھوڑی دیر تک تاتاری حملے کا جم کر مقابلہ کیا اور پھر آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگے۔ مسلمانوں کی پسپائی کی چال اتنی شاندار تھی کہ قطبوغا جیسا نامور جرنیل بھی یہ سمجھا کہ مسلمان شکست کھا کر پیچھے ہٹ رہے ہیں اور اس نے اپنے محفوظ دستوں کو بھی میدان جنگ میں جھونک دیا۔ بیبرس کی چال کامیاب ہو چکی تھی۔ قطبوغا فتح کے نشے میں اس مقام تک آ چکا تھا جہاں مصری فوج کے بہترین دستے اس کی گھات میں بیٹھے تھے۔ قطبوغا کو ہوش اس وقت آئی جب گھات میں بیٹھے مسلمان سپاہی اس پر حملہ آور ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی بھاگتے ہوئے مسلمان سپاہیوں نے اپنے گھوڑوں کا رخ موڑا اور پلٹ کر تاتاریوں پر حملہ کر دیا۔ مسلمانوں کا یہ حملہ اتنا غیر متوقع تھا کہ محض چند گھنٹوں کے اندر اندر ہزاروں تاتاری سوار لاشوں میں بدل گئے۔ قطبوغا نے سنبھلنے کی بڑی کوشش کی لیکن اس کی سب تدبیریں دھری کی دھری رہ گئیں اس کی فوج کے پیادہ دستوں کا حشر سب سے برا تھا۔ مملوک مسلمان شہسواروں نے انہیں بالکل ہی روند ڈالا تھا۔ قطبوغا اپنے کئی سرداروں سمیت میدان جنگ میں گرفتار ہو گیا۔ یہ شقی

القلب انسان جو مذہباً عیسائی تھا اور جس کی تلوار ہزاروں مسلمانوں کا خون پی چکی تھی کسی رعایت کا مستحق نہیں تھا۔ چنانچہ بیبرس نے اسے قتل کروا کے اس کا سر قاہرہ میں نمائش کے لیے بھجوایا۔

معرکہ عین جالوت کا شمار تاریخ کی فیصلہ کن لڑائیوں میں ہوتا ہے۔ اگر مسلمانوں کو اس لڑائی میں شکست ہو جاتی تو دنیا میں ان کے لیے کوئی جائے پناہ نہ تھی۔ مشہور عیسائی مؤرخ ہیرلڈلیم کے بقول ''اگر کہیں مصر پر تاتاری خون آشاموں کا قبضہ ہو جاتا تو مسلمانوں کے لیے عرب کے ریگستان اور شمالی افریقہ کے گمنام ساحلوں کے سوا دنیا میں کوئی ٹھکانہ نہ رہتا۔''

اس جنگ نے بیبرس کو پورے عالم اسلام کا ہیرو بنا ڈالا۔ قصہ گو اس کے نام کے ساتھ محیر العقل واقعات منسوب کرنے لگے۔ شاعروں نے اس کی شان میں قصیدے لکھے اور اس کی بہادری کے قصے چہار دانگ عالم میں پھیل گئے۔ اس کی مقبولیت کا یہ عالم کہ جب مصر کے حکمران سلطان سیف الدین ایک بغاوت میں مارا گیا تو امراء نے اتفاق رائے سے بیبرس کو نیا حکمران منتخب کر لیا۔ یوں یہ غریب الوطن غلام جس کے پاس سر چھپانے کی جگہ تک نہیں تھی مصر کے تاج و تخت کا وارث بن گیا۔

''ملک الظاہر سلطان رکن الدین بیبرس بندقدار'' نے 17 ذی قعد 658ھ کو مصر کا اقتدار سنبھالا جس وقت بیبرس نے حکومت سنبھالی اس وقت سب سے بڑا مسئلہ تاتاریوں کی ممکنہ یورش سے مسلمانوں کو بچانا تھا۔ سلطان بیبرس نے اس مسئلے سے نمٹنے کے لیے جو اہم اقدامات کیے وہ اس کی فراست اور دانائی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ سلطان نے سب سے پہلے حلب اور عراق سے ملحقہ گھاس کے تمام خطوں کو آگ لگوا دی تا کہ تاتاریوں کے گھوڑوں کے لیے رسد فراہم کرنا ممکن نہ رہے۔ اس کے بعد سلطان نے ہلاکو خان کے چچا زاد بھائی ''برکہ خان'' جو اسلام قبول کر چکا تھا سے خوشگوار تعلقات قائم کیے۔ برکہ خان ایک پر جوش نو مسلم حکمران تھا۔ اس نے سلطان بیبرس کی سفارت کو خوشدلی سے قبول کیا اور سلطان کو اپنی حمایت کا مکمل یقین دلایا۔ اب ہلاکو خان چکی کے دو پاٹوں کے درمیان آ چکا تھا۔ اس کے سامنے کی طرف مصر اور شام کا سلطان بیبرس ایک آہنی چٹان بنا کھڑا تھا جبکہ پشت پر ''برکہ خان''

طاقتور سلطنت تھی۔ ہلاکو خان نے اس صورتحال سے سٹپٹا کر عیسائی دنیا سے اپنے مددگار ڈھونڈنے کی کوشش شروع کر دی۔ اس نے ایک طرف تو پاپائے روم اور شاہ انگلستان کو خط لکھ کر مصر کے خلاف متحد کرنے کی کوشش کی اور دوسری طرف قسطنطنیہ کے فرمانروا قیصر سے اس کی بیٹی عیر یا کا رشتہ اپنے بیٹے کے لیے طلب کر لیا۔ سلطان بیبرس ہلاکو کی تمام شاطرانہ چالوں پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ اس نے جب قیصر کو ہلاکو سے ملتے دیکھا تو فوراً برکہ خان کو پیغام بھیجا کہ وہ اپنے بھتیجے کے لیے قیصر کی دوسری بیٹی کا رشتہ طلب کرے۔ برکہ خان نے اس پیغام کے مطابق عمل کرتے ہوئے قیصر کی دوسری بیٹی کا رشتہ مانگا۔ قیصر میں برکہ خان جیسے طاقتور حکمران کی بات رد کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ لہٰذا اس نے بلا چوں چرا برکہ خان کی بات مان لی۔ اس طرح سلطان بیبرس نے اپنی غیر معمولی خارجہ پالیسی کی بدولت قیصر کو عالمی طاقتوں میں بالکل غیر جانبدار بنا دیا سلطان کی خارجہ پالیسی کی بدولت اب ہلاکو خاں اس قابل نہیں رہ گیا تھا کہ مصر پر حملہ کرنے کے متعلق سوچتا۔

ہلاکو خاں کے قضیے سے فارغ ہو کر سلطان رکن الدین بیبرس نے قلعہ دار صلیبیوں کی طرف متوجہ ہوا جو شام اور فلسطین کے ساحلوں پر ایک بڑی طاقت بن چکے تھے۔ اس سے قبل سلطان صلاح الدین ایوبی ان عیسائیوں سے یہ قلعے چھین چکا تھا۔ لیکن اس کی وفات کے بعد عیسائیوں نے دوبارہ ان پر قبضہ کر لیا تھا۔ اب یہ علاقہ کسی اور صلاح الدین کا منتظر تھا جو اسے صلیبیوں کے خونی پنجہ سے چھڑائے۔ سلطان رکن الدین بیبرس کو مغربی اور عرب مؤرخین نے بجا طور پر صلاح الدین ایوبی ثانی کا لقب دیا ہے کیونکہ اس کا طریقہ جنگ اور ان قلعوں پر اس کی سرفروشانہ یلغار سے صلاح الدین ایوبی کی یاد تازہ ہو گئی تھی۔

1263ء کے وسط میں سلطان رکن الدین بیبرس نے صلیبیوں کے خلاف اپنی طوفانی یلغار کا آغاز کیا اور 2 سال میں صلیبیوں کے تین مضبوط ترین قلعے الکرک، قیساریہ اور ارسوف فتح کر لیے۔ اگلے سال سلطان پھر قاہرہ سے نکلا اور محاصرہ کر لیا۔ یہ قلعہ عیسائی جنونیوں کا ٹمپلرز کا گڑھ ٹمپلرز صلیبیوں کا ایک سفاک گروہ تھا مسلم دشمنی میں یہ لوگ تمام عیسائیوں سے بڑھ کر تھے۔ اس لیے سلطان نے قلعہ فتح کرنے کے بعد عام شہریوں کو تو پناہ دے دی لیکن

2000 ٹمپلرز کو اس کے حکم سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ صفد کی فتح کے بعد سلطان نے قلعۃ الشقیف کو تسخیر کیا اور پھر انطاکیہ کی طرف متواجہ ہوا جو عیسائیوں کے نزدیک ایک مقدس شہر کی حیثیت رکھتا تھا۔ مشہور مؤرخ ابوالفداء کا بیان ہے کہ ''انطاکیہ کی ریاست نہایت کمینہ خصلت اور شر پسند عیسائیوں کا گڑھ تھی'' اور اس کی حفاظت کے لیے دو لاکھ سپاہی ہمہ وقت موجود رہتے تھے۔ سلطان بیبرس نے جب انطاکیہ پر حملہ کیا تو چھ دن مسلمانوں اور عیسائیوں کے مابین نہایت خونریز جنگ ہوئی۔ آخر مسلمان مامون ہوئے۔ اس جنگ میں صلیبی مقتولوں کی تعداد سولہ ہزار تھی اور ایک لاکھ کے قریب جنگی قیدی بنا لیے گئے۔ انطاکیہ کی اس شکست کا بدلہ لینے کے لیے فرانس کے بادشاہ لوئی نہم نے مسلمانوں کے خلاف آٹھویں صلیبی جنگ کا اعلان کر دیا۔ لیکن راستے میں طاعون کی وبا پھیلنے کے سبب لوئی اور اس کے لشکر کی کثیر تعداد ہلاک ہوگئی۔

1271ء کے اوائل میں سلطان بیبرس نے عیسائیوں پر دوبارہ اپنی مجاہدانہ یلغار شروع کی اور یکے بعد دیگرے حصن الاکراد اور القرین (مانٹفورٹ Mont fort) کو فتح کر لیا۔ سلطان کی سرفروشانہ یلغار سے گھبرا کر عیسائیوں نے سلطان کی پیش کردہ شرائط پر اس کے ساتھ صلح کر لی۔ اس صلح کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ صلیبیوں کی طرف سے اس صلح کی تصدیق انگلستان کے بادشاہ ایڈورڈ نے کی تھی۔

مؤرخین نے سلطان بیبرس کے جن کارناموں کا ذکر سنہری حروف میں کیا ہے ان میں حسن بن صباح کے باطنی فرقے کی بیخ کنی بھی شامل ہے۔ گو کہ ہلاکو خان نے ان کے مرکز کو تباہ و برباد کر دیا تھا لیکن اب بھی کچھ مضبوط قلعے جو شام سے ملحق تھے ان باطنیوں کے قبضے میں تھے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنی کتاب سلاجقہ میں لکھا ہے کہ ''باطنی فدائیوں کے شر سے مسلمان بہت متاثر ہوئے۔ ان ظالموں نے بلاتخصیص ہر مسلمان کو دھوکے سے قتل کرنا اپنی زندگی کا مقصد بنا رکھا تھا۔ انہوں نے مجاہد اعظم سلطان صلاح الدین ایوبی پر بھی بے شمار حملے کروائے لیکن اللہ کو اس کی زندگی منظور تھی اس لیے کوئی حملہ کارگر نہ ہوسکا۔ عالم اسلام کی بڑی بڑی نابغہ روزگار شخصیات اور باجبروت حکمران ان کی سازشوں کا شکار ہو کر قتل ہوئے۔''

یہی وجہ تھی کہ صلیبیوں سے مؤثر طور پر نمٹ کر سلطان نے 1273ء میں باطنیوں کی طرف توجہ دی اور ان کے قلعوں کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دی جو لوگ امن کے طالب ہوئے انہیں امان دے کر مصر کے مختلف شہروں میں آباد کر دیا اور وہاں ان کو خاص نگرانی میں رکھ کر پرامن زندگی بسر کرنے کا عادی بنایا۔ اسطرح اس دہشت پسند گروہ کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا۔

سلطان رکن الدین بیبرس کے کارناموں میں ایک زریں کارنامہ خلافت کا احیاء بھی تھا۔ ہلاکو خاں کے ہاتھوں بغداد کی تباہی اور خلیفہ کے قتل سے مسلمان ایک روحانی خلاء محسوس کر رہے تھے۔ سلطان رکن الدین کی نظر سے مسلمانوں میں پائی جانے والی بے چینی پوشیدہ نہیں تھی۔ چنانچہ اس نے ایک عباسی شہزادے کو جو سقوط بغداد کے وقت قید خانے میں تھا اور جنگ کے ہنگامے میں دوسرے قیدیوں کے ساتھ فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا کو ڈھونڈ نکالا اور علمائے دین اور اکابرین مملکت کے مشورے سے اسے خلیفہ بنا کر اپنی سلطنت اعزازی طور پر اس کے سپرد کر دی۔ سلطان بیبرس کے بعد تین سو سال تک مصر خلاف کا مرکز رہا پھر خلافت کی یہ ذمہ داری ترکوں کو منتقل ہو گئی۔

1285ء میں سوڈان کے عیسائی بادشاہ ڈیوڈ نے سلطان بیبرس سے سرکشی اختیار کر کے اس کی فوج سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ سلطان کو یہ خبر ملنے کی دیر تھی کہ وہ طوفان کی طرح سوڈان کی طرف بڑھا اور ایک زبردست جنگ کے بعد ڈیوڈ کو گرفتار کر لیا۔ سوڈان کی فتح کے بعد سلطان بیبرس پھر تاتاریوں کی طرف متوجہ ہوا اور ابلستین کے مقام پر تاتاریوں کو عبرتناک شکست سے دوچار کیا اس کے بعد تاتاریوں کو کبھی مصر کی طرف دیکھنے کی جرأت نہ ہوئی۔

ابلستین کی جنگ میں سلطان کو ایک شدید زخم لگا تھا جس کے اثر سے اسے شدید بخار ہو گیا۔ طبیبوں نے اپنی طرف سے جو علاج بھی ہو سکتا تھا کیا لیکن سلطان کی بیماری دن بدن بڑھتی گئی اور کوئی علاج کارگر ثابت نہ ہو سکا۔ آخر 27 محرم 676ھ (1277ء) کو تاریخ اسلام کے اس بطل جلیل نے ستاون برس کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہا اور دمشق میں آسودۂ خاک ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

مؤرخین نے سلطان بیبرس کی شجاعت، انصاف پروری، شوق جہاد سخت کوشی، جودوسخا، بیدار مغزی اور عسکری قابلیت کی بے انتہا تعریف کی ہے۔ ''سلطان کی سخت کوشی کا یہ عالم تھا کہ وہ رات کو زرہ پہنے ہوئے سوجاتا تھا اور پاؤں سے مہمیزیں بھی نہ اتارتا تھا۔'' یہی وہ تمام خوبیاں تھیں جنہوں نے سلطان رکن الدین بیبرس کو اپنے وقت کا سب سے نمایاں حکمران بنایا تھا۔ سلطان بیبرس کی بیدار مغزی پورے عالم میں مشہور تھی۔ رعایا کی خبر گیری اور سلطنت کے امور کی دیکھ بھال کے لیے وہ اکثر بھیس بدل کر طویل دوروں پر نکل جاتا اور حیرت کی بات یہ کہ اس کی عدم موجودگی میں بھی کاروبار سلطنت اتنی ہی عمدگی سے چلتا رہتا جتنا کہ اس کی موجودگی میں چلا کرتا تھا۔ ہیرلڈلیم سلطان بیبرس کی اس قسم کی سرگرمیوں کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتا ہے۔

> ''اسے اپنے سوا کسی پر اعتبار نہیں۔ اس لیے وہ بھیس بدل کر گشت لگاتا ہے۔ وہ اپنے ساتھیوں کو دسترخوان پر چھوڑ کے تن تنہا نکل جاتا ہے اور اگلے روز فلسطین میں نمودار ہوتا ہے اور 4 یوم بعد دشت عرب میں نظر آتا ہے۔ اس میں خانہ بدوشوں کی سی تیز رفتاری ہے۔ اس کی صلاحیتوں کی وجہ سے لوگ اس سے محبت کرتے ہیں اور کسی حد تک اس سے خائف بھی ہیں کیونکہ معلوم نہیں بیبرس اس وقت کہاں ہو، کہیں وہ دراز قد مملوک جو فصیل کے برج سے ان کی طرف دیکھ رہا ہے بیبرس تو نہیں۔ کہیں وہ لمبا سا سوار ہو جو چیتوں کے ساتھ بارہ سنگھوں کا شکار کر رہا ہے۔ بیبرس نہ ہو یا قاضی کے زانو بہ زانو جو سمرقندی حاجی بیٹھا ہوا وظیفہ پڑھ رہا ہے کہیں سلطان تو نہیں۔ معرکہ عین جالوت کے بعد جب ہلاکو مصر پر انتقامی حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا سلطان بیبرس نے ایک تاتاری سپاہی کا لباس زیب تن کیا اور بھیس بدل کر شمال کی طرف غائب ہوگیا۔ کئی دن کے پرصعوبت سفر کے بعد وہ تاتاریوں کے علاقے میں نمودار ہوا اور قریہ قریہ پھر کے وہاں کے حالات کا جائزہ لینے لگا۔ چونکہ بیبرس کا بچپن غلاموں کی منڈیوں میں بکتے ہوئے گزرا تھا اس لیے وہ مختلف زبانیں بخوبی جانتا تھا اس بناء پر وہ ہر قسم کے لوگوں میں با آسانی گھل مل

جاتا تھا اس لیے کسی کو اس پر شبہ نہیں ہوا۔ ایک دن اس نے تاتاری علاقے میں کسی نانبائی کی دکان پر کھانا کھایا اور ایک برتن میں اپنی شاہی انگوٹھی اتار کر رکھ دی اس کے بعد وہ اپنے علاقے میں واپس آ گیا اور وہاں سے تاتاری فرمانروا ہلاکو خاں کو خط لکھا کہ ''میں تمہاری مملکت کے حالات کا معائنہ کرنے کے لیے فلاں فلاں جگہ گیا تھا، فلاں شہر میں فلاں نانبائی کی دکان پر اپنی شاہی انگوٹھی بھول آیا ہوں برائے مہربانی یہ انگوٹھی تلاش کر کے مجھے واپس بھجوا دو کیونکہ یہ مجھے بہت پسند ہے۔''

تاتاری حکمران، سلطان کی اس جرأت پر ششدر رہ گیا اور اس نے نانبائی سے انگوٹھی برآمد کر کے سلطان کو بھجوا دی۔ ہیرلڈ لیم لکھتا ہے کہ ''معلوم نہیں اس ستم ظریفی کا ہلاکو خاں پر کیا اثر ہوا لیکن قاہرہ کے بازاروں میں لوگ یہ قصہ سن سن کر قہقہے لگایا کرتے تھے۔''

بیبرس نے اس خفیہ دورے میں تاتاریوں کے طریق جنگ کے بارے میں بیش بہا معلومات حاصل کیں اور بعد میں اپنی افواج کو منظم کرنے میں ان معلومات سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا۔

ایک مرتبہ سلطان نے ایک قاصد کا بھیس بدلا اور ہرن کا شکار لے کر سیدھا انطاکیہ کے حاکم بوہمنڈ کے دربار میں جا داخل ہوا جو سلطان کے ہاتھوں انطاکیہ فتح ہونے کے بعد ٹریپولی آ گیا تھا۔ سلطان نے بوہمنڈ کے سامنے ایلچیوں کے انداز میں عرض کیا۔

''عالی جاہ! میرے بادشاہ ملک الظاہر سلطان رکن الدین بیبرس کو بہت افسوس ہے کہ آپ کو محصور ہونے کی وجہ سے اپنا شکار کا شوق پورا نہیں کر سکتے۔ انہوں نے یہ تازہ شکار آپ کی خدمت میں بطور ہدیہ بھیجا ہے۔ اسے قبول فرمائیے۔ میرے بادشاہ آپ کے شکر گزار ہوں گے۔''

جب سلطان قلعے سے باہر چلا گیا تو بوہمنڈ کو کسی نے آ کر بتایا کہ یہ قاصد خود الملک الظاہر سلطان بیبرس تھا۔ یہ سن کر بوہمنڈ پر لرزہ طاری ہو گیا۔

سلطان کی تیز فہم اور تدبر کا یہ عالم تھا کہ بعض اوقات وہ مختلف زبانوں کے کاتبوں کو اپنے سامنے بٹھا لیتا اور مختلف حکمرانوں کے نام بیک وقت خطوط لکھوانے شروع کر دیتا۔ لطف

یہ کہ ہر خط مضمون جدا گانہ ہوتا اور زبان بھی دوسری وہ چند فقرے ایک کاتب کو لکھواتا پھر پہلو بدلتا اور دوسرے کاتب کو کچھ فقرے لکھوا دیتا۔ ابھی وہ انہیں احاطہ تحریر میں بھی نہ لا پاتے کہ سلطان تیسرے کاتب کو لکھوانا شروع کر دیتا حتیٰ کہ جب وہ اٹھتا تو سارے خطوط مکمل ہو چکے ہوتے۔ امریکی مؤرخ ہیرلڈلیم سلطان کی ذہانت اور تدبر کی تصویر ان الفاظ میں کھینچتا ہے۔

''یہ شخص جو میدان جنگ اور بردہ فروشوں کے بازار کا فارغ التحصیل ہے زبانوں کی روک اور بندش سے آزاد ہے کیونکہ جب وہ خود جاسوسی کرتا ہے تو بڑے اطمینان سے یونانیوں سے یونانی میں، عربوں سے عربی میں اور دریائے نیل کے منبع کے حبشوں سے ان کی اپنی بولی میں باتیں کرتا ہے۔ کسی اور موقع پر اور کسی حیثیت سے وہ اپنے میر منشی سے انجو کے شاہ چارلس اور اہل وینس کے نام مراسلے لکھواتا ہے ادھر وہ اہل وینس کی تجارتی کشتیاں لوٹ کر نفع حاصل کرتا ہے۔ ادھر ان کے دشمنوں، اہل جنیوا سے بندرگاہوں پر محصول وصول کرتا ہے۔ ان مغرور شہروں کے سفیروں کو آپس میں لڑا کر مزے سے تماشا دیکھتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے تدبر سے ان دونوں شہروں کے مابین جنگ چھڑ جاتی ہے۔''

سلطان علمائے دین کو اس قدر اہمیت دیتا تھا کہ اس نے مملوکوں کی فوج کے ہر دستے کے لیے ایک عالم مقرر کر رکھا تھا جو ان کو قرآن وحدیث اور دینی مسائل کی تعلیم دیتا تھا۔ مؤرخ علامہ ابن خلکان سلطان کے ہم عصر تھے وہ عرصہ تک سلطان کی طرف سے شام کے قاضی القضاء رہے۔ اس کے علاوہ سلطان کے دربار میں مشہور محدث امام نووی، شیخ الاسلام علامہ عزالدین بن عبدالسلام، سبط ابن الجوزی، ابن النفیس اور شیخ القراء کمال الدین مصری جیسی نابغہ عصر شخصیات بھی موجود تھیں جن کے علمی کمالات کا ایک زمانہ معترف ہے۔

سلطان بیبرس کا عہد حکومت درحقیقت مسلمانوں کے عروج کا دور تھا۔ اس کے تدبر، معاملہ فہمی، عدل وانصاف اور شجاعت کی داستانیں صدیوں تک مصری قہوہ خانوں میں سنائی جاتی رہیں۔ سلطان کے دور حکومت میں وہ تمام ناجائز ٹیکس جو اس سے قبل عوام سے زبردستی وصول کیے جاتے تھے موقوف کر دیئے گئے۔ شراب اور جوئے کے تمام اڈے

بند کر دیئے گئے۔ عدالتی نظام جو عماد الدین زنگی اور سلطان صلاح الدین ایوبی کی وفات کے بعد زوال کا شکار تھا سلطان بیبرس نے دوبارہ از سر نو سے صحیح کیا۔ سلطان بیبرس صحیح معنوں میں عوام کا خادم تھا یہی وجہ تھی کہ سلطان کی وفات پر تمام اہل اسلام گہرے دکھ اور غم میں مبتلا ہو گیا جبکہ عیسائیوں نے خوشیوں سے کلیساؤں میں چراغاں کیا۔



ٹیپو سلطان شہیدؒ

وہ غیر معمولی خداداد ذہانت کے مالک تھے اور ہر شعبے میں ان کی جدت اور اختراع پسندی کے باعث نت نئی راہیں کھلتی چلی گئیں اور ان کی رعایا پر آسودگی اور خوشحالی کے در' وا ہو گئے

عالم اسلام کے جرأت مند اور صاحب تدبیر بطل جلیل

مسجد تیار ہو چکی تھی!

دریا کے کنارے ایک خوبصورت اور دلکش عمارت تھی جس کی منقش دیواروں سے شان وشوکت ٹپکتی تھی۔ اس عمارت کی مشرقی جانب یہ مسجد تھی جس کے دونوں مینار بڑے وقار سے سر اٹھائے کھڑے تھے۔ مسجد کی تعمیر میں نفاست کا خاص خیال رکھا گیا تھا۔

آج اس مسجد میں غیر معمولی ہجوم تھا۔ بڑے بڑے علماء کرام، سرکاری امراء اور اہم شخصیات بھی موجود تھیں۔ آج اس مسجد کا باقاعدہ افتتاح ہونا تھا۔

نماز کا وقت ہوا تو نمازیوں نے صفیں باندھ لیں۔ اس موقع پر یہ تجویز سامنے آئی کہ آج مسجد کے افتتاح کے دن وہ شخص جماعت کی امامت کروائے جو صاحب ترتیب ہو یعنی جس کی کوئی نماز قضا نہ ہوئی ہو اور اس نے تمام نمازوں کی ترتیب سے وقت مقررہ پر ادا کیا ہو۔ یہ سننا تھا کہ سناٹا چھا گیا۔ شاید کوئی بھی اس کڑے معیار کے مطابق خود کو امامت کا اہل نہیں پاتا تھا۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر ایک جواں سال شخص آگے بڑھا۔ گندمی رنگت کے حامل اس دراز قد شخص کا جسم مضبوط اور گٹھا ہوا تھا۔ اس کے بھرے بھرے چہرے پر قدرے خمارناک

اور پوری داڑھی بڑی بھلی محسوس ہوتی تھی اور اس کی بڑی بڑی روشن آنکھوں سے ذہانت جھلکتی تھی۔ اس شخص نے انکسار سے کہا۔

''الحمدللہ میں صاحب ترتیب ہوں۔''

تمام حاضرین کی ستائشی اور رشک بھری نظریں اس شخص کی جانب اٹھ گئیں۔ یقیناً امامت ایسے ہی شخص کو کرنا چاہئے تھی وہ شخص وقار کے ساتھ آگے بڑھا اور امام کی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ تکبیر پڑھی گئی اور اس شخص نے تکبیر کہہ کر ہاتھ باندھ لیے۔

سرنگاپٹم کی مسجد اعلیٰ میں نماز کی امامت کرنے والے یہ جواں سال رہنما تھے۔ عالم اسلام کے عظیم اولوالعزم جرأت مند اور صاحب تدبیر بطل جلیل ٹیپو سلطان تھے جن کی پوری زندگی جہد مسلسل سے عبارت ہے۔ ٹیپو سلطان کو عموماً لوگ محض ایک جنگجو سپہ سالار کی حیثیت سے جانتے ہیں جو بہادری سے لڑتے ہوئے شہید ہوگئے لیکن ٹیپو سلطان محض ایک جنگجو سپہ سالار نہ تھے۔ بلکہ وہ ایک ذی علم اور علم دوست شخصیت کے بھی مالک تھے۔ انہوں نے نہ صرف جنگی نقطہ نظر سے اپنی سلطنت کو مستحکم بنایا اور اس کا دفاع کیا بلکہ فلاحی اعتبار سے بھی نہایت اہم اور منفرد اقدامات کیے۔ وہ غیر معمولی خداداد ذہانت کے مالک تھے اور ہر شعبے میں ان کی جدت اور اختراع پسندی کے باعث نت نئی راہیں کھلتی چلی گئیں اور ان کی رعایا پر آسودگی اور خوشحالی کے در، وا ہو گئے۔

ٹیپو سلطان کا پورا نام فتح علی ٹیپو سلطان ہے۔ ان کے والد کا نام حیدر علی اور والدہ کا نام فخر النساء (فاطمہ) ہے۔ ٹیپو سلطان کے نام ''فتح علی'' میں ان کے والد حیدر علی اور دادا فتح محمد دونوں کے نام شامل ہیں۔

حیدر علی نے اپنے پیارے فرزند کی تعلیم و تربیت کا بہترین انتظام کیا۔ ننھے ٹیپو کو قرآن کریم فقہ عربی فارسی، فرانسیسی، انگریزی اور کنڑی (مقامی زبان) کی تعلیم دی گئی۔ اس زمانے میں اردو بھی رائج ہو رہی تھی۔ اس کا بھی علم حاصل کیا۔ ٹیپو سلطان کے اساتذہ میں علی حسین (بعد میں حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے عہد میں ملک اشعراء مقرر ہوئے) اور نصیر الدین اختر ترک شامل تھے۔

دینی اور دنیاوی تعلیم کے ساتھ ساتھ فنون حرب کی تعلیم و تربیت کا خاص اہتمام کیا گیا۔ ان تمام علوم وفنون کے نامور اساتذہ کی خدمات حاصل کی گئیں۔ ان اساتذہ کی خصوصی توجہ، لگن اور محنت کے نتیجے میں ٹیپو نے بہت جلد شہ سواری، تیغ زنی، نیزہ بازی، تیر اندازی، بندوق چلانے، بانک، بنوٹ لکڑی (گتکا) پیرا کی کشتی اور دو بدو جنگ لڑنے میں مہارت حاصل کر لی۔ بعد کے ادوار میں ٹیپو سلطان نے فن حرب میں مزید کمال حاصل کیا۔ حتیٰ کہ فنون حرب پر فتح المجاہدین جیسی جامع کتاب لکھی۔ ٹیپو سلطان نے خطاطی کے فن پر بھی عبور حاصل کیا تھا اور علم حکمت کے اعتبار سے بھی ان کا درجہ بہت بلند تھا۔

ٹیپو سلطان نے ایسے عہد میں ہوش سنبھالا جب برصغیر پاک و ہند کی عظیم اسلامی مملکت سیاسی خلفشار کا شکار ہو چکی تھی۔ مغل حکمراں اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد جگہ جگہ خود مختار ریاستیں وجود میں آ چکی تھیں اور ان میں کشاکش جاری تھی۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر انگریز ایک تجارتی ادارے ایسٹ انڈیا کمپنی کے بھیس میں اپنا جال پھیلا چکے تھے۔

۱۱۷۸ھ (۱۷۶۴ء) میں بنگال سے اودھ تک انگریزوں کی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ ٹیپو سلطان کے والد حیدر علی کی دور رس نظروں نے اس مہیب خطرے کو بھانپ لیا تھا جو بعد میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا باعث بنا اور جس کے نتیجے میں انگریز برصغیر کے سیاہ و سفید کے مالک بن بیٹھے۔ چنانچہ انہوں نے نو آبادیت پسند سامراج کی راہ روکنے کے لیے خود بھی جدوجہد شروع کر دی تھی اور اپنے باصلاحیت فرزند ٹیپو سلطان کو بھی اس عظیم مقصد کے لیے تیار کر رہے تھے۔ ٹیپو سلطان کو اپنی غیر معمولی شجاعت اور جنگی مہارت کا مظاہرہ کرنے کا موقع کمسنی ہی میں مل گیا۔ ان کے والد حیدر علی نے ۱۱۸۰ھ (۱۷۶۶ء) میں مالا بار پر حملہ کیا تو انہوں نے نوجوان ٹیپو کو بھی اس مہم میں ساتھ چلنے کا حکم دیا۔ اس وقت ٹیپو کی عمر صرف ۱۵ برس تھی۔ حیدر علی نے بڈنور کے جنوب میں کوہستانی علاقے بالم پر حملہ کیا وہاں کے حاکم کو شکست ہوئی لیکن اس نے اطاعت قبول کرنے سے انکار کر دیا اور گھنے جنگل میں پناہ لے لی۔ اس موقع پر ٹیپو صرف دو ہزار سپاہی لے کر گھنے اور تاریک جنگل میں بے دھڑک داخل ہو گئے

اور بالم کے حاکم اور اس کے ساتھیوں کو جالیا۔ یہ لوگ "پالیگار" کہلاتے تھے۔ پالیگاروں نے مجبوراً اطاعت کا یقین دلایا۔ ان کی دیکھا دیکھی مالا بار کے دیگر جاگیرداروں نے بھی حیدر علی کو اپنا فرمانروا تسلیم کرلیا۔ حیدر علی اپنے بہادر فرزند کی اس کارکردگی سے اتنے خوش ہوئے کہ انہوں نے نوجوان ٹیپو کو دو سو سواروں کا کمانڈر مقرر کر دیا۔ بہت جلد انہوں نے ان سواروں کی تعداد پانچ سو کر دی۔

انگریز حیدر علی کی بڑھتی ہوئی طاقت سے سخت خائف تھے۔ انہوں نے مرہٹوں اور نظام حیدر آباد دکن کو ساتھ ملا کر سلطنت میسور پر چڑھائی کر دی۔ پہلی اینگلو میسور جنگ کا آغاز ۱۱۸۱ھ (۱۷۶۷ء) میں ہوا۔ حیدر علی مرہٹوں کو اس اتحاد ثلاثہ سے الگ کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ پھر انہوں نے محرم ۱۱۸۱ھ (جون ۱۷۶۷ء) میں ٹیپو کو نظام الملک حیدر آباد دکن کے پاس تحائف دے کر بھیجا۔ ٹیپو سلطان نے اتنے سلیقے سے گفتگو کی کہ نظام حیدر علی کے ساتھ مل کر انگریزوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہوگئے۔

ٹیپو کو مدراس کی طرف پیش قدمی کا حکم ملا۔ وہ مدراس پہنچ کر مخالفوں کی سرکوبی کر رہے تھے کہ انہیں ان کے والد نے واپس بلا لیا۔ ترپا تور اور وانم باڑی کو فتح کرنے کی مہم اور انبور کے محاصرے میں وہ اپنے والد کے ساتھ رہے۔ جب انگریزوں نے بندر کوڑیال (بنگلور) پر قبضہ کرلیا تو ٹیپو کو ان کا راستہ روکنے کے لیے بھیجا گیا پھر حیدر علی بھی پہنچ گئے۔ دونوں بہادر باپ بیٹے نے مل کر پوری قوت سے حملہ کیا۔ ٹیپو کے حملوں میں ایسی شدت تھی کہ انگریز توپیں چھوڑ کر بھاگے اور قلعہ میں محصور ہوگئے۔ ٹیپو ان کا تعاقب کرتے ہوئے قلعے میں بھی جا پہنچے۔ انگریز قلعہ چھوڑ کر ساحل کی طرف بھاگے اور راستے میں ٹیپو کی فوج کے ہاتھوں یا تو مارے گئے یا قیدی بنا لیے گئے۔

انگریزوں سے لڑائی ختم ہوئی تو مرہٹوں نے رجب ۱۱۸۳ھ (نومبر ۱۷۶۹ء) میں میسور پر حملہ کردیا۔ حیدر علی نے ٹیپو سلطان کو حکم دیا کہ دشمن کو زچ کر دیا جائے چنانچہ ٹیپو نے مرہٹوں کی رسد کے راستے بند کر دیئے۔ دشمن کو پانی مل سکا نہ گھوڑوں کے لیے چارہ۔ یہ سلسلہ چلتا رہا لیکن شوال ۱۱۸۳ھ (فروری ۱۷۷۰ء) میں حیدر علی نے مرہٹوں کی پیش قدمی روکنے کے لیے

ٹیپو کو واپس بلالیا۔ مرہٹوں نے جنگ شروع کردی۔ حیدر علی ملکوٹہ میں تھے وہ سرنگا پٹم پہنچ گئے لیکن افراتفری میں ٹیپو ان سے الگ ہوگئے۔ حیدر علی سرنگا پٹم میں سخت بے چین تھے کہ ٹیپو کی کوئی خبر نہیں مل رہی تھی لیکن آخر کار ٹیپو ایک مفلس سبزی فروش کے بھیس میں سرنگام پٹم پہنچ گئے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ٹیپو موقع کی مناسبت سے کس قدر درست فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔

مرہٹوں نے ۳۳ دن تک سرنگا پٹم کا محاصرہ کیا آخر مرہٹے، رسد کی کمی کی وجہ سے محاصرہ اٹھانے پر مجبور ہوگئے۔ شعبان ۱۱۸۶ھ (نومبر ۱۷۷۲ء) میں مرہٹوں پیسوا ماھوراؤ کی وفات کے بعد حیدر علی نے ٹیپو کو مرہٹوں سے مقابلے کے لیے پھر بھیجا۔ ٹیپو نے مرہٹوں سے سیرا، مداگری، کوام کونڈا، چھنّا راہادرگا، ہوسکوٹ، بلاری وغیرہ چھین لیے۔

۱۱۹۴ھ (۱۷۸۰ء) میں انگریزوں سے پھر جنگ چھڑ گئی جو دوسری اینگلو میسور جنگ کہلاتی ہے۔ حیدر علی 90 ہزار سپاہیوں کے ساتھ کرناٹک پہنچ گئے۔ ٹیپو ساتھ تھے۔ انگریز سپہ سالار ہیکٹر منرو کانجی ورم پہنچ کر کرنل بیلی کی فوج کا انتظار کرنے لگا۔ حیدر علی نے ٹیپو کو دس ہزار سپاہی دے کر کرنل بیلی کی فوج پر حملے کے لیے بھیج دیا۔ ٹیپو نے کانجی ورم سے پندرہ میل پہلے ہی، کرنیل بیلی کی فوج پر حملہ کردیا۔ کانجی ورم سے نومیل دور، رات میں اس قدر شدید گولہ باری کی کہ کرنل بیلی نے ہتھیار ڈال دیئے۔ چار ہزار یورپی سپاہیوں میں سے صرف دو سو سپاہی زندہ بچے جنہیں قیدی بنالیا گیا۔ انگریزوں نے اعتراف کیا کہ اس وقت تک انگریزوں کو ہندوستان میں لگنے والی یہ شدید ترین ضرب تھی۔ ٹیپو سلطان نے انگریز قیدیوں سے بڑا نرم سلوک دیا۔ ہر قیدی کو کپڑا اور رقم دی۔ پھر انہیں سرنگا پٹم بھیج دیا۔ انگریز سالار ہیکٹر منرو نے مایوس ہوکر مدراس واپسی کا فیصلہ کیا۔ بھاری توپیں اور گولہ بارود واپس لے جانا مشکل تھا، چنانچہ انگریز یہ سامان ایک بڑے تالاب میں پھینک گئے۔

اس کے بعد ٹیپو نے ارکات، ست گڑھ، تیاک گڑھ فتح کیے۔ اس اثناء میں مغربی محاذ پر مالا بار میں انگریزی فوج کی کامیابیوں کی خبریں ملیں۔ ٹیپو کو اس محاذ پر بھیج دیا گیا۔ ٹیپو نے انگریزوں کو پسپائی پر مجبور کردیا۔ وہ انگریزوں پر دن بھر گولہ باری کرتے رہے۔ حتیٰ کہ شام کو

دریائے پونانی پر پہنچ گئے۔ انگریز دریا عبور کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ ٹیپو نے بھی دریا پار کیا اور شہر پونانی کی ناکہ بندی کردی۔ اسی دوران ٹیپو کو اپنے والد حیدر علی کی وفات کی اندوہناک اطلاع ملی۔

۳۰ ذی الحجہ ۱۱۹۶ھ (۶ دسمبر ۱۷۸۲ء) کو حیدر علی کا انتقال ہوا۔ ٹیپو سلطان اطلاع ملنے پر خاموشی کے ساتھ چکملور پہنچ گئے۔ جہاں حیدر علی کا لشکر ٹھہرا ہوا تھا۔ ٹیپو سلطان نے خود ہدایت کی تھی کہ اس کا رسمی استقبال نہ کیا جائے۔ ۲۰ محرم ۱۱۹۷ھ (۱۷۸۲ء) کو ٹیپو سلطان کی مسند نشینی عمل میں آئی۔ اب وہ اس وسیع سلطنت کے حکمران تھے جسے ان کے والد حیدر علی نے بڑے تدبر حوصلے اور جرات کے ساتھ حاصل کیا تھا۔

ٹیپو سلطان نے اقتدار سنبھالتے ہی حکم دیا کہ فوجیوں کی تنخواہیں اور واجبات فوراً ادا کر دیئے جائیں۔ انہیں اس بات کا خوب احساس تھا کہ ابھی انہیں بہت حریفوں سے برسرپیکار ہونا ہے اور آئندہ تمام معرکوں میں کامیابی کے لیے انہیں مضبوط فوج درکار ہوگی۔ چنانچہ ٹیپو سلطان نے ایک فرانسیسی افسر کو خصوصی ذمہ داری سونپی کہ وہ ان کی فوج کو جدید خطوط پر منظم کرے۔ ٹیپو سلطان نے ایک اور اہم فیصلہ یہ کیا کہ سامان خورد ونوش اور دیگر اشیاء کی قیمتیں از خود مقرر کرنے کا پرانا دستور منسوخ کردیا۔ اس کے نتیجے میں فوج کو رسد کی فراہمی آسانی سے ہونے لگی۔

مشرقی محاذ پر انگریزوں نے پیش قدمی کی تو ٹیپو خود فوج لے کر روانہ ہوئے اور زبردست حملہ کر کے دشمن کو ونڈی واش اور کرنگولی سے پسپائی پر مجبور کردیا۔ انگریزوں نے تیاری کر کے بڈنور کے قلعے پر قبضہ کرلیا۔

شعبان ۱۱۹۷ھ (جولائی ۱۷۸۳ء) میں ٹیپو ایک بڑی فوج کے ساتھ آندی اور طوفان کی مانند بڈنور کی سرحد پر جا پہنچے۔ انہوں نے حیدر گڑھ اور کیول درگ پر قبضہ کرلیا۔ پھر بڈنور شہر پر تسلط قائم کر کے قلعے کا محاصرہ کرلیا۔ تیرہ مقامات پر توپیں نصب کردیں اور گولہ باری شروع کردی۔ چند ہی دنوں میں انگریز فوج نے ہتھیار ڈال دیئے۔

انگریزوں نے ایک معاہدہ کر کے قلعہ چھوڑنا چاہا لیکن خود ہی اس معاہدے کی خلاف

ورزی کی، جس پر فوج نے دشمن کو گھیر کر مارنا شروع کیا۔ آخر انگریز فوج معافی کی خواستگار ہوئی لیکن انگریزوں نے چالاکی یہ دکھائی کہ قلعہ میں جتنا خزانہ تھا اسے بھیڑ بکریوں، مرغوں، کتوں تک کے جسموں میں چھپا کر لے جانے کی کوشش کی۔ ٹیپو کو یہ اطلاعت مل گئیں۔ انہوں نے تلاشی لینے کا حکم دیا اور تقریباً چالیس ہزار سونے کے سکے صرف افسروں ہی کے پاس سے برآمد کر لیے گئے۔ انگریزوں نے معاہدے کی پھر خلاف ورزی کی اور عوامی ذخائر لوٹ لیے۔ سرکاری دستاویزات جلائیں اور میسور کے جنگی قیدیوں کو آزاد نہ کیا۔ چنانچہ ٹیپو نے انہیں ہتھکڑیاں لگوا کر چیتل درگ بھیج دیا۔

بڈنور سے ٹیپو بنگلور پہنچے وہاں انگریزوں نے خود کو قلعے میں محصور کرلیا۔ قریب تھا کہ یہ قلعہ بھی فتح ہو جاتا، انگریزوں اور فرانسیسیوں میں جنگ بندی ہوگئی۔ چنانچہ فرانسیسی فوج ٹیپو کی مدد سے دست کش ہوگئی۔ ۱۸ ربیع الثانی ۱۱۹۸ھ (۱۱ مارچ ۱۷۸۴ء) کو ٹیپو سلطان اور انگریزوں کے مابین صلح کا معاہدہ ہوا۔ ایک ذمہ دار وفد لارڈ میکارٹنی نے خود اعتراف کیا کہ اگر یہ معاہدہ نہ ہوتا تو ہم اپنے مصارف کے بوجھ تلے ڈوب جاتے۔ معاہدے کے مطابق فریقین نے مفتوحہ علاقے واپس کر دیئے۔

ادھر انگریزوں سے جنگ ختم ہوئی اور ادھر مرہٹوں کے مذہبی پیشوا نانا فرنویس نے میسور پر حملے کے لیے نظام حیدر آباد دکن کو ترغیب دینا شروع کر دی۔ ٹیپو سلطان نے نانا فرنویس کو سمجھانے کی کوشش کی کہ ہمیں تو مل کر انگریز کا مقابلہ کرنا چاہئے لیکن وہ نہ مانا۔ ادھر نظام حیدر آباد نے مرہٹوں سے اتفاق کرلیا کہ حیدر علی نے جتنے علاقے پر قبضہ کیا تھا وہ سب واپس لے لیا جائے۔ ٹیپو سلطان نے ان دونوں رہنماؤں کو بہت کچھ سمجھایا لیکن انہوں نے اپنا فیصلہ برقرار رکھا۔ مجبور ہو کر ٹیپو کو بھی فوج لے کر مقابلے کے لیے نکلنا پڑا۔ چند معرکوں کے بعد آخر کار جمادی الاول ۱۲۰۱ھ (فروری ۱۷۸۷ء) میں صلح نامے پر دستخط ہو گئے جس کی رو سے ٹیپو سلطان اپنے بعض علاقوں سے دستبردار ہو گئے اور کچھ نئے علاقے انہیں مل گئے۔

ٹیپو سلطان نے ۱۱۹۸ھ (۱۷۸۴ء) میں عثمانی خلیفہ سے اپنی حکمرانی کی توثیق حاصل کی اور اپنا سفارت خانہ قسطنطنیہ میں قائم کیا۔ اس غرض سے ٹیپو سلطان نے جو سفارتی وفد قسطنطنیہ

میں روانہ کیا، اس کے ارکان کے ساتھ بڑے پیمانے پر تجارتی اشیاء بھی تھیں جن میں کپڑا، صندل کی مصنوعات، مسالے، سونے چاندی کے میسوری سکے، ملبوسات، جواہرات اور ہاتھی شامل تھے۔ گویا اس سفر سے ہر ممکن مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ سفراء نے راستے سے کچھ سامان فروخت کیا۔

وفد کے ارکان کو ٹیپو نے ہدایت کی تھی کہ خلیج فارس سے گزرتے ہوئے بوشہر میں اتریں اور شاہ فارس سے تجارتی مراعات حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ اس کے علاوہ وہ جن مقامات سے گزریں وہاں کے جغرافیائی، سماجی اور معاشی حالات کا مطالعہ کریں اور اپنے تجربات کو قلم بند کرتے رہیں۔ ٹیپو نے یہ ہدایت بھی کی کہ عثمانی حکومت سے ترکی مقبوضات میں کارخانوں کے قیام کا معاہدہ کریں کہ عثمانی حکومت ٹیپو کی مدد کے لیے فوج بھیجے۔ ایسے صنعت کار بھی بھیجیں گے جو بندوقیں اور توپیں ڈھال سکیں، شیشے اور چینی کے برتن بنا سکیں۔ ان کے بدلے ٹیپو اپنے ایسے کاریگر بھیجیں گے جن کی عثمانی خلیفہ کو ضرورت ہوگی تاہم وفد، ٹیپو کی حکومت کے لیے یہی اسناد حاصل کر سکا کہ عثمانی حکومت نے ٹیپو کو خودمختار بادشاہ تسلیم کیا اور انہیں اپنے سکے جاری کرنے اور اپنے نام کا خطبہ پڑھوانے کا حق حاصل ہوگیا۔

ادھر انگریز یہ بڑی شدت سے محسوس کر رہے تھے کہ برصغیر میں ان کی توسیع پسندی کی راہ میں اگر کوئی مؤثر قوت حائل ہے تو وہ ٹیپو سلطان کی میسوری ریاست ہے۔ چنانچہ انگریزوں نے مرہٹوں اور نظام حیدر دکن کے ساتھ مل کر ٹیپو کے خلاف اتحاد قائم کر لیا۔ فریقین کے درمیان لڑائی کے تین دور ہوئے۔ آخر جمادی الثانی ۱۲۰۶ھ (فروری ۱۷۹۲ء) میں سرنگاپٹم کا محاصرہ کر لیا گیا اور صلح نامے پر دستخط ہوگئے۔ اس صلح نامے کی رو سے ٹیپو سلطان کو اپنی نصف مملکت سے دستبردار ہونا پڑا۔ یوں جنگوں کے اس سلسلے کا اختتام ہوا جس کا آغاز ۱۰ رمضان المبارک ۱۲۰۴ھ (۲۴ مئی ۱۷۹۰ء) کو ہوا تھا۔ ٹیپو سلطان کو تین کروڑ ۳۰ لاکھ روپے کا تاوان ادا کرنا تھا۔ مخالفین کے قیدی رہا کرنے پڑے۔ معاہدہ کی ضمانت کے طور پر ٹیپو کے دو کمسن بیٹوں عبدالخالق اور معزالدین کو یرغمال بنایا گیا۔ جب دونوں شہزادے پورے سرکاری اعزاز کے ساتھ انگریز سالار کارنوالس کے کیمپ میں پہنچے تو انہیں ۲۱ توپوں کی سلامی دی گئی اور

کارنوالس نے انہیں گلے لگایا۔

ٹیپو سلطان کی شکست ان کی ریاست پر انگریزوں، مرہٹوں اور نظام کے اتحاد کی یہ بڑی کاری ضرب تھی۔ تاہم ٹیپو نے معاہدے کی شرائط کی پوری پابندی کی اور مطلوبہ رقم مقررہ وقت پر اتحادیوں کو ادا کر دی۔ شعبان ۱۲۰۸ھ (مارچ ۱۷۹۴ء) میں ٹیپو کے یرغمالی شہزادے رہا ہوکر واپس آ گئے۔

ٹیپو سلطان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید بقیہ نصف مملکت بھی جلد ہی گنوا بیٹھتا۔ ٹیپو ایک نئے عزم کے ساتھ اپنے نقصانات کی تلافی میں مصروف ہو گئے۔ یہ ان کی غیر معمولی خداداد ذہانت، لیاقت، تدبر اور حسن انتظام کی صلاحیت تھی کہ صرف چھ سال کے عرصے میں ٹیپو سلطان نے اپنی مملکت کو پھر سے خوشحال بنا دیا۔ اس غرض سے انہوں نے زراعت کو خصوصی ترقی دی۔ جنگی محاذ پر انہوں نے تمام قلعوں کی مرمت کروائی۔ فوج کی تنظیم نو کی۔ اس کے علاوہ اس عرصے میں ٹیپو سلطان نے اسلامی ممالک کو متحد کرنے کی غرض سے زمان شاہ والی کابل، سلطان روم، شاہ ایران اور خود برصغیر کے تمام حکمران کے پاس سفیر اور خطوط ارسال کیے۔

لارڈ ویلزلی ۱۲۱۲ھ (۱۷۹۸ء) میں گورنر جنرل مقرر ہوکر برصغیر آیا۔ ٹیپو سلطان کے اس قدر کم مدت میں سنبھالا لینے پر اس کو شدید تشویش تھی۔

لارڈ ویلزلی نے آتے ہی جنگی تیاریاں شروع کر دیں۔ ساتھ ساتھ وہ مرہٹوں اور نظام سے اتحاد قائم کرنے کی کوششیں بھی کرتا رہا۔ دوسری جانب اس نے ٹیپو سلطان کو بے دست پا کرنے اور انہیں ہر قسم کی امداد سے محروم کرنے کی کوششوں کا بھی آغاز کر دیا۔ داخلی طور پر بھی سازشوں کا ایک جال بچھایا گیا اور عوام کو یہ باور کروایا گیا کہ انگریز اسلامی رسوم کو بہت پسند کرتے ہیں۔ اس غرض سے ان غیر ضروری رسوم کا انگریزوں نے بڑا احترام کیا۔ جنہیں غیر اسلامی قرار دے کر ٹیپو سلطان نے ممنوع قرار دے دیا تھا۔ دوسری طرف سب سے زیادہ افسوسناک اور سنگین بات یہ ہوئی کہ انگریزوں کی ترغیب کے نتیجے میں کچھ مسلمان امراء اور ایک ہندو افسر درپردہ بغاوت پر آمادہ ہو گئے۔ ان باغیوں میں سرفہرست میر صادق تھا جو

مجلس (پارلیمنٹ جیسے "جماعت خاص" کہتے تھے) کا صدر اعظم تھا۔ دیگر باغیوں میں میر غلام علی، میر قمر الدین، میر قاسم علی بدر الزماں اور ہندو وزیر مالیات دیوان پورنیا شامل تھے۔

لارڈ ویلزلی نے ٹیپو سے مذاکرات شروع کر دیئے کہ وہ نیا معاہدہ کریں جس کی شرائط نہایت توہین آمیز تھیں۔ آخر لارڈ ویلزلی نے ۲۷ شعبان ۱۲۱۳ھ (۳ فروری ۱۷۹۹ء) کو جنرل ہیرس کو حکم دیا کہ وہ ٹیپو سے مذاکرات ختم کر کے میسور پر حملہ کر دے۔ اس نے الزام لگایا کہ ٹیپو سلطان، فرانسیسیوں سے مل کر برصغیر میں انگریزوں کو تباہ کر دینا چاہتے ہیں۔ اس نے وضاحت کے لیے ٹیپو کو صرف ۲۴ گھنٹے کا وقت دیا اور جواب کا انتظار کیے بغیر اعلان جنگ کر دیا۔ اس سے قبل وہ ٹیپو سلطان سے دوستانہ ماحول میں بات چیت کر رہا تھا جو درحقیقت اس کی ایک چال تھی۔ وہ گزشتہ کئی ماہ سے جنگی تیاریوں میں مصروف تھا۔

جنرل ہیرس کی قیادت میں ۲۱ ہزار سپاہیوں پر مشتمل ایک لشکر نے ۹ رمضان المبارک ۱۲۱۳ھ (۱۴ فروری ۱۷۹۹ء) کو میسور کی طرف کوچ کیا۔ ۲۸ رمضان (۵ مارچ) کو جنرل ہیرس میسور میں داخل ہوا اور ۷ شوال (۴ مارچ) کو بنگلور پر قبضہ جما لیا۔ ٹیپو سلطان نے انگریزوں کی اس پیش قدمی کے پیش نظر مقابلے کی تیاری شروع کر دی تھی۔ وہ پورنیا اور سید غفار کی قیادت میں کچھ فوج چھوڑ کر مشرق کی سمت بڑھے۔ انگریزوں کی فوج میں جانوروں کی کثرت تھی۔ جنرل ہیرس کی فوج میں ۶۰ ہزار بیل تھے اور نظام کی فوج میں ۳۶ ہزار۔ نجی افراد کے بیلوں، اونٹوں اور ہاتھیوں کی تعداد اس کے علاوہ تھی۔ نتیجہ یہ کہ چارے کی کمی کی وجہ سے بیل مرنے لگے۔ ٹیپو سلطان کی فوج دشمن کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا سکتی تھی لیکن چونکہ اس کے اعلیٰ افسر انگریزوں سے جا ملے تھے، اس لیے انہوں نے انگریزوں پر ضرب لگانے کے موقع سے جان بوجھ کر فائدہ نہ اٹھایا۔

جنرل ہیرس نے ۱۷ ذی قعدہ ۱۲۱۳ھ کو دوسرا مسودہ مصالحت ٹیپو سلطان کے حوالے کیا۔ اس کی شرائط پہلے سے بھی زیادہ سخت تھیں۔ یعنی یہ کہ نصف سلطنت سے دستبردار ہو جاؤ، دو کروڑ روپے تاوان دیا جائے چار بیٹے اور چار جرنیل بطور یرغمال دیئے جائیں۔ ٹیپو نے ان شرائط کو مسترد کر دیا۔

۲۳ذی قعدہ ۱۲۱۳ھ کو سرنگا پٹم کے باہر توپیں نصب کر دی گئیں اور گولہ باری شروع کر دی گئی۔ ۳ مئی کو قلعے کی فصیل میں چھوٹا شگاف پڑ گیا۔ جنرل ہیرس نے فوراً حملے کا فیصلہ کیا کیونکہ رسد کی کمی کی وجہ سے اس کی فوج فاقے کر رہی تھی اور وہ مزید انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ ایسے موقع پر غداران ملت انگریزوں کے کام آئے۔ میر صادق نے صلاح دی کہ ۴ مئی کی دوپہر حملہ کیا جائے۔ میر صادق نے تنخواہیں دینے کے بہانے ان سپاہیوں کو واپس بلا لیا جو قلعے کی فصیل کے شگاف کی حفاظت پر متعین تھے۔ چنانچہ انگریز فوج بلا تکلف اور مزاحمت شگاف کے راستے قلعے میں داخل ہو گئی۔ البتہ ایک اور سمت سے حملہ کرنے والی انگریز فوج کو شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔

ٹیپو سلطان دفاعی انتظامات میں بھرپور طریقے سے مصروف تھے۔ ۲۹ ذی قعدہ ۱۲۱۳ھ (۴ مئی ۱۷۹۹ء) کو دوپہر کا کھانا ان کے سامنے لایا گیا۔ انہوں نے لقمہ اٹھایا ہی تھا کہ انہیں اپنے نہایت وفادار افسر سید غفار کی شہادت کی اطلاع ملی۔ وہ کھانا چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور کہا ''ہم بھی عنقریب جانے والے ہیں۔'' ٹیپو سلطان پاپیادہ دوڑے اور اپنی منتشر فوج کو مجتمع کرنے کی سرتوڑ کوشش کی لیکن سپاہی اپنی قوت کھو بیٹھے تو ٹیپو سلطان گھوڑے پر سوار ہوئے اور ڈڈی دروازے (پانی دروازے) کی طرف بڑھے۔ اسے میر صادق نے بند کروا دیا تھا تاکہ ٹیپو سلطان باہر نہ جا سکیں۔ میر صادق یہ کہتے ہوئے نکلا کہ میں کمک لاتا ہوں لیکن سلطان کے وفادار ساتھی، میر صادق کی غداری کو بھانپ چکے تھے۔ انہوں نے تلواروں کے وار کر کے اس قابل نفرت شخص کو اسی وقت موت کے گھاٹ اتار ڈالا۔

ٹیپو سلطان اس دروازے کی طرف بڑھے جہاں سے قلعے کے اندرونی حصے کو راستہ جاتا تھا۔ اس دروازے سے گزرنے کی کوشش میں وہ تین بار زخمی ہوئے۔ ان کے گھوڑے نے بھی زخمی ہو کر دم توڑ دیا۔ ٹیپو اب بھی مردانہ وار لڑ رہے تھے۔ اتنے میں چند انگریز سپاہی دھر کو آئے۔ ایک نے ٹیپو کی تلوار کی قیمتی پیٹی چھیننے کی کوشش کی، زخمی سلطان نے تلوار کا وار کیا۔ ایک انگریز زخمی ہوا۔ انگریز سپاہیوں نے گولی چلا دی۔ سلطان ایک تنگ جگہ میں لڑ رہے تھے تین افراد کو ہلاک کیا۔ اس اثناء میں ان کی کنپٹی پر گولی لگی اور یہ عظیم مرد مومن مقام

شہادت پر فائز ہوگیا۔عینی شاہدین کے مطابق ٹیپو کے چہرے پر غیر معمولی طمانیت تھی اور کسی قسم کے جذباتی ہیجان یا غضب کا تاثر نہ تھا۔

دوسرے دن سہ پہر کو محل سے اس دلیر و جانباز جرنیل کا جنازہ اٹھایا گیا۔کسی ردِ عمل کا مقابلہ کرنے کے لیے چار یورپین کمپنیاں ساتھ ساتھ تھیں۔ جنازے کا جلوس جس راستے سے گزرتا وہاں دونوں جانب کھڑے شہریوں کا جم غفیر دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ لال باغ کے مقبرے میں ٹیپو سلطان کو ان کے والد حیدر علی کے پہلو میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

❀❀❀



امام شمویل رحمہ اللہ

"جنگ میں کسی ایک فریق کی فتح لازمی امرہے ویسے بھی تم یہ جنگ غداروں اورتوپوں کے بل بوتے پر جیتنا چاہ رہے ہو تم سمجھ رہے ہو کہ ہم جنگ ہار چکے ہیں لیکن یہ تمہاری بھول ہے یادرکھنا ہم یہ جنگ ہار بھی گئے تو بھی جیت ہماری ہی ہوگی کیونکہ ہمارا مقصود شہادت ہے"

جدید گوریلا جنگ کے بانی کی ولولہ انگیز سرگزشت

''جنگ میں کسی ایک فریق کی فتح لازمی امر ہے۔ ویسے بھی تم یہ جنگ غداروں اور توپوں کے بل بوتے پر جیتنا چاہ رہے ہو۔ تم سمجھ رہے ہو کہ ہم جنگ ہار چکے ہیں لیکن یہ تمہاری بھول ہے۔ یادرکھنا! ہم یہ جنگ ہار بھی گئے تو بھی جیت ہماری ہی ہوگی کیونکہ ہمارا مقصود شہادت ہے۔ تم ہمارے لیے عزت کی زندگی کا راستہ بند کرسکتے ہو مگر عزت کی موت کا راستہ ہمارے لیے کھلا ہے۔ تم اپنے سپاہیوں کو آگے بڑھنے کا حکم دو، ہماری تلواریں نیاموں سے باہر نکلنے کو بے قرار ہیں۔''

سعادت کی زندگی اور شہادت کی موت کی ترجمانی کرتے یہ الفاظ کہ جن سے ایمان کی حرارت اور جذبہ شہادت کی مہک اٹھ رہی ہے عالم اسلام کے عظیم گوریلا کمانڈر اور جدید گوریلا جنگ کے بانی امام شمویل کے ہیں۔ ان الفاظ کا پس منظر اور اس عظیم کمانڈر کے حالات سے آگاہی تاریخ ہمیں ان الفاظ میں بیان کرتی ہے۔

انیسویں صدی کے ربع اول میں کفر واسلام کے مابین عظیم ترین معرکے ہوئے۔ یہ وہ وقت تھا جب عظیم اسلامی سلطنتیں غیروں کی سازشوں اور اپنوں کی ریشہ دوانیوں کی بدولت اپنا وقار کھو رہی تھیں اور کفر اپنے تمام حربوں سے لیس ہوکر مسلمانوں کو للکار رہا تھا۔ خلافت عثمانیہ کی بنیادیں کھوکھلی ہو چکی تھیں اور اس کی حالت آندھی میں ٹمٹماتے ہوئے دیئے کی مانند تھی جو

کسی بھی وقت بجھ سکتا تھا۔ ہندوستان میں انگریز اپنے قدم جما چکے تھے۔ روس ایک عظیم عیسائی مملکت کے طور پر اپنا وجود منوا چکا تھا اور اب زاران روس کی نظریں قفقاز پر تھیں۔لیکن یہاں ان کا واسطہ اس مردِ مجاہد سے پڑا جسے تاریخ جدید گوریلا جنگ کا بانی اور امام تسلیم کرتی ہے۔قفقاز کے اس مرد مجاہد کا نام ''امام شیموئیل'' تھا جو 1796ء میں داغستان کی ایک چھوٹی سی بستی ''غمری'' میں پیدا ہوا۔

قفقاز میں جہاد کی تحریک، شیموئیل کے قائد جہاد بننے سے چند سال پہلے ہی شروع ہو چکی تھی۔ اسے شروع کرنے والا شیموئیل کا ہی ایک ہم مکتب ''غازی محمد'' تھا۔لیکن ''غازی محمد'' کے دور میں قفقاز میں تحریک جہاد کو وہ پذیرائی نہ مل سکی جو ملنی چاہیے تھی۔ اس کی ایک بڑی وجہ تو کوہستانیوں کا قبائلی نظام تھا۔قفقاز کے قبائل آپس کی رنجشوں اور قبائلی عصبیتوں کی بناء پر کسی ایک حکمران کی ماتحتی قبول نہیں کرتے تھے جبکہ دوسری وجہ مجاہدین اور روسی مملکت کے درمیان وسائل کا امتیاز تھا۔اس زمانے میں روس ایک عظیم الشان عیسائی سلطنت تھا۔اس کی سپاہ کی تعداد لاکھوں میں تھی۔ اس کے پاس جدید ترین جنگی اسلحے کے لاتعداد ذخائر تھے۔ پچھلی چند دہائیوں میں زاران روس عثمانی مسلمانوں کو شکست دے کر ان کے کئی علاقے روسی مقبوضات میں شامل کر چکے تھے جبکہ دوسری طرف مجاہدین کی وہ مٹھی بھر جماعت تھی۔ جس کے پاس نہ تو جدید اسلحے کے ذخائر تھے اور نہ ہی اسے کسی حکومت کا سہارا حاصل تھا۔ اکثر مجاہدین قفقاز کی عام آبادی سے تعلق رکھتے تھے لہٰذا کوئی مقامی خان یا بیگ بھی انہیں التفات قابل نہیں سمجھتا تھا۔مجاہدین کا ''امام غازی محمد'' بھی کوئی مشہور ومعروف شخصیت نہیں تھا۔لیکن جہاد کا اپنا ایک مزاج ہوتا ہے۔اپنے کھرے مزاج کی بدولت یہ کفر اور نفاق کے درمیان اپنی جگہ خود بناتا ہے۔ سو مجاہدین کی تعداد میں بھی آہستہ آہستہ اضافہ ہونے لگا۔ زارِ روس کو جب مجاہدین کی تعداد میں اضافے کی اطلاع ملی تو اس نے لاکھوں کا لشکر مجاہدین کی سرکوبی کے لیے بھیج دیا۔غمری کی بستی میں روسیوں اور مجاہدین کے درمیان شدید ترین معرکہ ہوا۔مجاہدین نہایت بہادری سے لڑے لیکن ایک پہریدار حمزہ بیگ کی غداری نے جنگ کا پانسہ روسیوں کے حق میں پلٹ دیا۔''امام غازی محمد'' اور تحریک جہاد کے دوسرے سرکردہ لوگ اس لڑائی میں

شہید ہو گئے صرف شمویئل بچ سکا لیکن اس کا جانبر ہونا بھی مشکل نظر آتا تھا کیونکہ اس کی تین پسلیاں کٹی ہوئی تھیں جسم پر سنگینوں کے 22 زخم تھے۔ دو گولیاں پیوست تھیں لیکن اللہ احکم الحاکمین جسے زندہ رکھنا چاہے پوری دنیا مل کے بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ ''شمویئل'' جس کے بچنے کی امید بھی نظر نہیں آتی تھی کچھ ہی عرصہ میں تندرست ہو کر روسیوں کے لیے موت کا پیغام بن گیا۔

امام شمویئل نے جب قائد جہاد کا منصب سنبھالا اس وقت تحریک جہاد عملی طور پر تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ مقامی خوانین کی اکثریت کھلم کھلا روسیوں کی حلیف بن چکی تھی۔ کچھ ایسے تھے جو غیر جانبداری کی پالیسی اپنائے ہوئے تھے۔ ایسے میں جب غیر تو ایک طرف اپنے بھی دشمنی پر کمر بستہ تھے۔ تحریک جہاد کو کامیابی سے آگے بڑھانا نہایت مشکل کام تھا۔ اس کام کے لیے ایسے شخص کی ضرورت تھی جو ایک طرف تو مقامی لوگوں کو جہاد پر آمادہ کر کے انہیں نظم کی لڑی میں پرو دے اور دوسری طرف غیر معمولی جرات کا مظاہرہ کر کے روس کے خلاف سینہ سپر ہو جائے اور اللہ نے امام شمویئل کو ان تمام خوبیوں سے نوازا تھا۔ جن کی ان حالات میں اشد ضرورت تھی۔ آنے والے وقت نے امام شیمویئل کو نہ صرف ایک کامیاب قائد اور دانشمند سردار ثابت کیا بلکہ ایک ایسا جہادی کمانڈر بھی ثابت کیا جس نے گوریلا جنگ کے تمام مروجہ اصولوں کو بدل کر اسے نئے تقاضوں سے آشنا کیا۔ انہیں اپنے مقصد کی صداقت اور اللہ کی رحمت پر پختہ یقین تھا۔ ان کے دن گھوڑے کی پیٹھ اور راتیں مصلے پر اپنے رب کے حضور رکوع و سجود میں گزرتیں تھیں کہ اتنے خوفناک دشمن کے مقابلے پہ ان کا سب سے بڑا سہارا یہی تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو اپنی زندگی مقصد حیات کی خاطر جدوجہد میں گزار دیتے ہیں۔ مقصد کی یہی عظمت تھی جس سے انہوں نے اپنے ساتھیوں کو روشنا کروایا تو یہ مٹھی بھر مجاہد اللہ کا قہر بن کر دشمن پر ٹوٹے۔ امام اور ان کے ساتھیوں کے ایمان کی پختگی کا اس سے بڑھ کر اور کیا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دنیا میں جب بھی کسی قوم پر مصیبت آتی ہے تو وہ تمام دشمنیاں بھلا کر بلا تفریق مذہب دوسری اقوام سے مدد کا مطالبہ کرتی ہے۔ لیکن ان لوگوں نے مدد مانگی بھی تو صرف اپنے ان مسلمان بھائیوں سے مانگی جن کے پاس بڑی بڑی سلطنتیں

اورقوت واقتدار تھا۔ان کے مسلک میں یہ بات شامل نہیں تھی کہ ''ایک مسلمان کسی دوسرے مذہب والوں سے مدد مانگے لیکن افسوس کسی نے ان کی آواز پر کان نہیں دھرے۔ اس کے باوجود انہوں نے ہمت نہیں ہاری اور اللہ کے راستے میں لڑتے رہے۔بغیر کسی طمع اور لالچ کے،انہیں نہ تو کسی صلے کی پرواہ تھی اور نہ ہی کسی تمنا نے انہیں اللہ کی راہ میں لڑنے سے باز رکھا۔''

کامیاب گوریلا جنگ کے دوسرے اصول میں اس علاقے سے مکمل واقفیت جس میں جنگ لڑی جارہی ہو اور مقامی آبادی کا تعاون شامل ہے۔ روسیوں کے مقابلے میں امام شیموئیل کو یہ Advantage حاصل تھا کہ وہ قفقاز کو اپنے ہاتھ کی لکیروں کی طرح جانتے تھے۔جبکہ زار روس اس معاملے میں ان مقامی خوانین کا محتاج تھا۔ جو اس کے حلیف بن چکے تھے۔ دشمن کی اس کمزوری سے امام نے خوب فائدہ اٹھایا۔ روسی لشکر کے مقابلے میں مجاہدین کی تعداد خوفناک حد تک کم تھی۔ امام شیموئیل نے اپنی اس کمزوری کو چھپانے میں قفقاز کے پہاڑی ندی نالوں اور سرسبز درختوں سے بھرپور مدد لی۔قفقاز کا ہر درخت مجاہدین کا دوست تھا۔خصوصاً ایسے علاقے جو درختوں کی کثرت کی وجہ سے زیادہ دشوار ہوتے ان میں امام شیموئیل کے شبخون اور گھاتیں اتنی قاتل ہوتیں کہ شاذ ہی کوئی روسی سپاہی زندہ بچ پاتا۔ جہاں تک مقامی آبادی کے تعاون کی بات تھی تو شروع میں مسئلہ بڑا گھمبیر تھا۔لیکن امام شیموئیل کے قائد جہاد بننے کے بعد یہ مسئلہ بھی کسی حد تک حل ہوگیا تھا۔ کیونکہ امام شیموئیل کو پورا داغستان ''شیرِ غمری'' کے نام سے جانتا تھا۔ پھر غمری کے معرکے کے بعد امام کی مقبولیت میں مزید اضافہ ہوگیا تھا۔ لہٰذا مقامی لوگوں کی تحریک جہاد میں شمولیت کی رفتار خاصی تیز ہوگئی تھی۔

کامیاب گوریلا جنگ کا تیسرا اصول جاسوسی اور پیغام رسانی کا بہترین اور قابل اعتماد نظام ہے۔خوش قسمتی سے مجاہدین کو وہ قائد ملا تھا جس کی نگاہ سے جنگ کا یہ پہلو بھی اوجھل نہیں تھا۔ قائد جہاد بننے کے شروع میں امام کی اولین ترجیحات میں سے ایک اپنے لشکر سے غداروں اور مخبروں کا صفایا تھا۔ کیونکہ غمری کی جنگ میں صرف ایک پہریدار کی غداری کی وجہ

سے مجاہدین کو نا قابل تلافی نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ غداروں کے خاتمہ کے بعد امام شیموئیل نے جاسوسی اور پیغام رسانی کے نظام کی طرف خصوصی توجہ دی۔ امام کے لشکر میں قاصد اور جاسوس ایک ہی شخص کے دونام ہوتے تھے۔ قاصد بنانے کے لیے امام نے اپنے لشکر سے ایسے نوجوانوں کا انتخاب کیا جو غیر معمولی حد تک جری، نڈر اور جان پر کھیل جانے والے تھے۔ پھرانہیں تربیت کے سخت ترین مراحل سے گزارا گیا۔ ان قاصدوں کی سواری کے لیے امام نے اعلیٰ نسل کے صبار فتار گھوڑے خریدے اور انہیں سخت ترین موسم میں بھی بھاگنے کی پریکٹس کروائی۔ ان تمام مراحل سے گزرنے کے بعد امام کے قاصد روسیوں کے لیے صحیح معنوں میں موت کے پیامبر ثابت ہوئے۔ ان کی تیز رفتاری کا یہ عالم تھا کہ روسی لشکر ابھی امام شیموئیل پر حملہ کی تیاری کررہا ہوتا کہ یہ اس کی اطلاع امام کو پہنچا دیتے۔ قفقاز کی اس جنگ میں امام کے صبارفتار قاصدوں نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ مقامی لوگ ان کی تیز رفتاری کی بدولت انہیں ''ہواؤں کے بیٹے'' کہا کرتے تھے۔

امام شیموئیل نے روس کے خلاف کم وبیش ایک ہزار معرکوں میں حصہ لیا۔ ان معرکوں میں سب سے زیادہ مشہور وہ معرکہ ہے جو داغستان کی بستی ''اخلگو'' میں لڑا گیا اور مسلسل باسٹھ دن جاری رہا۔ اس معرکے کا ایک ایک لمحہ مجاہدین کے پختہ عزم اور اللہ پر ان کے نا قابل بیان یقین کا مظہر ہے۔ اس معرکے کا آغاز 28 جون 1839ء کو ''اخلگو'' پر روسیوں کی گولہ باری سے ہوا۔ 15 جولائی کو مسلسل ساٹھ گھنٹے کی گولہ باری کے بعد روسی لشکر کے کمانڈر ''جنرل گریب'' نے اپنے سپاہیوں کو اخلگو پر پیش قدمی کا حکم دیا۔ جن روسی سپاہیوں نے اخلگو کی طرف پیش قدمی کی ان کا استقبال مجاہدین کی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں نے کیا جنہوں نے اپنی شناخت چھپانے کے لیے مردانہ کپڑے پہن رکھے تھے۔ ان مجاہد خواتین نے روسیوں کے خلاف اس مہارت سے شمشیر زنی کہ کہ کسی بھی روسی کو زندہ بچنے کا موقع نہیں مل سکا۔ اس معرکے کے بعد روسی سپاہی مجاہد خواتین کو ''کڑکتی بجلیاں'' کے نام سے یاد کرنے لگے۔

17 اگست کو مجاہدین کے پاس پانی اور خوراک کے ذخائر مکمل طور پر ختم ہو چکے تھے۔ 18 اگست کو روسیوں نے ایک نئی چال چلی اور امام کو صلح کی پیشکش کی۔ صلح کی شرط روسیوں

نے یہ رکھی کہ امام شیمویل اپنے بڑے بیٹے ''جمال الدین'' کو ایک ایسے جانبدار سردار ''عبدل'' کے حوالے کردیں جو اس لڑائی میں نہ روسیوں کا حلیف تھا اور نہ ہی مجاہدین کا۔ اس کے بدلے امام اور ان کے مجاہد ساتھیوں کے خلاف روس جنگ بندی کا اعلان کردے گا۔ امام شیمویل روسیوں کی اس چال میں کبھی نہ آتے لیکن مجاہدین کے پاس رسد کے ذخائر مکمل طور پر تباہ ہوچکے تھے اور امام شیمویل کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ توہین آمیز شرائط پر روس سے صلح کرلیں۔ اسی شام امام نے اپنا لخت جگر ''عبدل'' کے حوالے کردیا۔ لیکن ''جمالِ الدین'' کو اپنے قبضے میں کرتے ہی روسی جنرل کی نیت بدل گئی اس نے جمال الدین کو روس کے دارالحکومت کی روانہ کردیا اور مجاہدین پر دوبارہ گولہ باری شروع کردی۔ روسیوں کی بدعہدی کا علم ہونے کے بعد امام شیمویل کے تابعین نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ اپنے اہل و عیال کے ہمراہ ''اخلگو'' سے نکل جائیں کیونکہ اگر خدانخواستہ امام شیمویل کو کچھ ہوگیا تو تحریک جہاد اسی وقت دم توڑ جائے گی۔ امام شیمویل جیسے شخص کے لیے یہ بات ناقابل برداشت تھی کہ ان کے ساتھی میدان جہاد میں قربانیاں پیش کر رہے ہوں اور وہ میدان سے دور ہوں۔ دو دن اسی مباحثے میں گزر گئے۔

20 اگست کو امام شیمویل نے اپنے ساتھیوں کا مشورہ مان لیا۔ اسی رات امام شیمویل اپنی دو بیگمات فاطمہ بیگم (جو ایک ماہ بعد بچے کی ماں بننے والی تھیں) اور زاہدہ بیگم، دو کمسن بیٹوں غازی محمد اور محمد شفیع، والدہ بہن اور دس جانثاروں کے ساتھ، رسوں کی مدد سے اخلگو کے پہاڑ کی پشت سے دریا میں چھپے ہوئے پتھروں پہ اترے۔ دریا کا بہاؤ انتہائی تیز تھا اور اس کے خلاف تیرنا انتہائی مشکل، لیکن مجاہدین کا عزم دریا کے تھپیڑوں پر غالب آ گیا۔ کنارے پر پہنچ کر امام کو پتہ چلا کہ ان کی والدہ دریا میں پڑے ہوئے کسی لکڑی کے شہتیر سے ٹکرا کر وفات پا چکی تھیں۔ بہن بھی کسی روسی سپاہی کی چلائی ہوئی گولی کا نشانہ بن چکی تھیں۔ امام کے چند سالہ بیٹے غازی محمد کی ٹانگ میں گولی لگی تھی۔ خود امام شیمویل کا دایاں بازو شدید زخمی تھا۔ گیارہ دن بعد جب روسی فوج نے اخلگو پر قبضہ کرلیا تو جنرل گریب وہاں امام کو نہ پا کر سخت جھنجھلایا۔ وہ حیران تھا کہ امام کو زمین کھا گئی یا آسمان لیکن اخلگو میں پڑی۔ 25000 پچیس

ہزار روسیوں کی بے گوروکفن لاشیں اسے امام شموئیل کا پتہ بتانے سے قاصر تھیں۔

بظاہر اس معرکے نے امام شیموئیل اور ان کے ساتھیوں کی کمر توڑ دی تھی۔ روسی گماشتے پورے داغستان میں امام شیموئیل اور ان کے بچے کھچے ساتھیوں کو شکاری کتوں کی طرح ڈھونڈ رہے تھے۔ ان حالات میں امام شیموئیل نے چیچنیا کا رخ کیا جہاں ان کے کچھ ہم مکتب موجود تھے اور چھ ماہ بعد وہاں سے جہاد کا اعلان کر دیا۔ امام شیموئیل کے اعلان جہاد سے قفقاز کے طول وعرض میں خوشی کی لہر دوڑ گئی کیونکہ اخلگو فتح کرنے کے بعد روسی فوج نے یہ سمجھ کر کہ امام شیموئیل یا تو قفقاز چھوڑ کر کہیں اور چلا گیا ہے اور یا وہ کسی جگہ شدید زخمی حالت میں پڑا ہوا زندگی کی آخری سانسیں لے رہا ہوگا۔ قفقاز کے لوگوں پر اپنے مظالم کا سلسلہ دوبارہ شروع کر دیا تھا۔ اب قفقاز کے ان قبائل کو جو اس سے پہلے روسیوں کے حلیف یا غیر جانبدار تھے شدت سے اس بات کا احساس ہوا کہ انہوں نے امام کا ساتھ نہ دے کر شدید غلطی کی تھی۔ چنانچہ ایسے حالات میں جب امام شیموئیل نے روس کے خلاف اعلان جہاد کیا تو یہ تمام قبائل جوق در جوق امام کے جھنڈے تلے اکٹھے ہونے لگے۔ دوسری طرف روسی سپاہیوں کے مورال پر امام کی زندگی کی خبر نے بہت برا اثر کیا۔ امام شیموئیل کی زندگی میں انہیں اپنی موت نظر آ رہی تھی۔ اب وہ برملا روسی جنرلوں اور زار کو کوسنے دیتے جن کی ہوس ملک گیری نے ان سپاہیوں کو قفقاز کے پہاڑوں میں دھکیل رکھا تھا۔

1840ء میں امام شیموئیل نے اپنے طوفانی حملوں کا آغاز کیا اور روسی فوج کو مختلف میدانوں میں یکے بعد دیگرے عبرتناک شکستیں دے کر ان کے مضبوط ترین قلعوں لازارف، دیلیا مینوف نکولائی اور میخالودسکی پر قبضہ کر لیا۔ ان لڑائیوں نے "فاتح اخلگو جنرل گریب" کی ساکھ کو بہت نقصان پہنچایا حتیٰ کہ لوگ سر عام اس کا مذاق اڑانے لگ گئے اور جنرل گریب نے خود زار روس سے درخواست کی کہ وہ اب لڑنے کے قابل نہیں رہا لہٰذا اسے واپس بلا لیا جائے۔ ان لڑائیوں میں امام کی کامیابی کی بڑی وجہ مجاہد قاصدوں کی حیرت انگیز برق رفتاری اور مجاہدین کا آپس میں بہترین رابطہ (Coordination) تھا۔ مسلسل کامیابیوں کے باوجود مجاہدین کی ایک کمزوری ایسی تھی جس کو چھپانا امام کے بس سے باہر تھا یہ کمزوری

جدید اسلحے کی عدم دستیابی تھی۔ کئی بار روسیوں کو صرف ان کی توپوں نے مجاہدین کے قاتل خنجروں سے بچایا تھا۔ امام شیمویئل نے بار بار عثمانی خلیفہ کے دربار میں یہ درخواست بھیجی تھی کہ اگر خلیفہ زیادہ نہیں تو صرف چند توپیں اور ان کے چلانے والے ماہرین امام شیمویئل کو دستیاب کر دے تو وہ روسیوں کو نہ صرف قفقاز سے باہر نکال دیں گے بلکہ انھیں زار روس سے بھی دستبردار ہونا پڑے گا۔ لیکن خلیفہ ایسے خوشامدی اور جی حضوری لوگوں میں گھرا ہوا تھا جنھوں نے کبھی امام شیمویئل کے قاصدوں کو خلیفہ تک پہنچنے ہی نہیں دیا اور اگر کوئی قاصد خلیفہ کے دربار تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو بھی گیا تو خلیفہ نے محض ان لوگوں کی ناراضگی کے خوف سے مجاہدین کو ٹال دیا۔ آنے والے وقت میں مجاہدین نے اپنی اس کمزوری کی بدولت بہت نقصان اٹھایا۔

امام کا بڑا بیٹا جمال الدین زار روس کے قبضے میں تھا۔ روسیوں نے 1839ء میں اخلگو کے معرکے میں ''جمال'' کو دھوکے سے چھینا تھا۔ امام کو اپنے بیٹے سے بچھڑے 14 سال کا طویل عرصہ گزر چکا تھا۔ اس دوران امام کی چہیتی بیوی ''فاطمہ بیگم'' اپنے بیٹے کی جدائی کے غم میں گھل گھل کر وفات پا چکی تھیں۔ زار نے ''جمال'' کی واپسی کی ایک ہی شرط رکھی تھی وہ یہ کہ'' امام شیمویئل جہاد بند کر کے ہتھیار پھینک دیں اور روسی حکومت کے تحت قفقاز کا وائسرائے بننا قبول کر لیں۔'' لیکن اللہ کے سپاہی کو بیٹے سے جدائی تو گوارا تھی زار کی یہ شرائط قبول نہیں تھیں۔ 1854ء میں مجاہدین نے ایک زبردست یلغار کر کے جارجیا کی شہزادی اینا کو گرفتار کر لیا۔ شہزادی کی واپسی روسی سلطنت کے وقار کا مسئلہ تھی۔ اب زار کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارا نہیں تھا کہ وہ شہزادی اینا کے بدلے ''جمال الدین'' کی واپسی کی شرط مان لے۔ ''جمال الدین'' کی واپسی مجاہدین کی بہت بڑی کامیابی تھی۔ اپنی اس شکست سے زار بہت دل برداشتہ ہوا اور کچھ ہی عرصہ بعد قفقاز فتح کرنے کی حسرت دل میں لیے اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

نئے زار کے تخت نشین ہوتے ہی جنگ ایک نئی صورت اختیار کر گئی۔ کیونکہ قفقاز کے حالات پر گہرے غور و خوض کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ قفقاز جنگ جیتنے کا ایک ہی

طریقہ ہے اور وہ یہ کہ امام کے ساتھی خوانین کو دولت کا لالچ دے کر امام سے علیحدہ کرلیا جائے۔ اس کے مخبر اسے اس بات کی اطلاع دے چکے تھے کہ یہ خوانین اور بیگ دولت واقتدار کے لالچی اور ہوس کے مارے ہوئے لوگ ہیں امام شمویئل کے خوف نے انہیں مجاہدوں کا لبادہ اوڑھنے پر مجبور تو کیا ہوا ہے لیکن تھوڑی سی شہہ اور اقتدار کا لالچ انہیں امام سے غداری پر آمادہ کرسکتا ہے۔ زار کی نظر میں یہ تمام کام روس کا صرف ایک ہی شخص سرانجام دے سکتا تھا اور وہ تھا روسی فوج کا ہر دلعزیز جنرل ''جنرل بیریا غنسکی'' لہٰذا اس نے جنرل بیریا غنسکی کو قفقاز کی روسی افواج کا کمانڈر انچیف مقرر کردیا۔

قفقاز پہنچ کر روسی جنرل پر اس بات کا انکشاف ہوا کہ خوانین کی غداری کے باوجود بھی ''امام شمویئل'' کو شکست دینا آسان ثابت نہیں ہوگا کیونکہ مجاہدین تک پہنچنے کے لیے راستے میں بے شمار جنگلات آتے تھے اور مجاہدین کو یقینی شکست سے دوچار کرنے کے لیے ضروری تھا کہ ان جنگلات کا صفایا کردیا جائے۔ لہٰذا ایک طرف تو اس نے توپوں اور ڈائنامیٹ کی مدد سے جنگلات کو ختم کرنا شروع کردیا اور دوسری طرف امام کے ساتھیوں کی وفاداری خریدنے کے لیے اشرفیوں کی بوریوں کے منہ کھول دیئے۔

اب تک جنگلات اور درخت درحقیقت مجاہدین کے لیے قدرتی قلعوں کا کام دے رہے تھے۔ اگر یہ درخت کٹ جاتے تو مجاہدین کے لیے اپنا وجود برقرار رکھنا مشکل ہوجاتا۔ لہٰذا امام اپنے جانبازوں کے ساتھ فوراً جنگلات کو بچانے کے لیے میدان میں آگئے۔ روسی جنرل امام شمویئل کے مخصوص طریقہ جنگ سے واقف تھا۔ اسے معلوم تھا کہ مجاہدین اچانک حملہ کرتے ہیں اور روسیوں کا قتل عام کرکے غائب ہوجاتے ہیں اور ایسے تنگ درے اور گھاٹیاں جہاں چھپنے کی جگہیں بکثرت ہوں مجاہدین کے شبخونوں کے لیے کمین گاہوں کا کام دیتے ہیں۔ لہٰذا اس نے اپنی عددی برتری کی بناء پر محاذ جنگ داغستان سے چیچنیا اور چیچنیا سے قبائل کے علاقوں تک پھیلا دیا۔ اب امام شمویئل کی چالیں بے اثر ہونے لگیں اور محاذ جنگ کی طوالت نے امام کو اتنا مصروف کردیا کہ وہ اپنے اندرونی معاملات پر نظر نہ رکھ سکے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مجاہدین میں قبائلی عصبیتیں دوبارہ سر اٹھانے لگیں۔ روسی چالیں رنگ لانا شروع ہوگئی تھیں۔

سب سے پہلے نذران کے لوگوں نے روسیوں سے وفاداری کا اعلان کیا۔ پھر کبارداد اور اوستیا کی باری آئی۔ ابھی ان خبروں کی بازگشت باقی تھی کہ طیطل کے ''خان قلیط'' نے بھی روسیوں کی حمایت کا اعلان کر دیا۔

اب لڑائی فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ درختوں کو روسی فوج کے حملوں سے بچانے کی ساری تدابیر ناکام ہو چکی تھیں اور روسی فوج مسلسل آگے بڑھ رہی تھی۔ امام کا بیٹا ''جمال الدین'' سخت بیمار تھا۔ لیکن ایک مجاہد کے فرائض امام کو اتنی مہلت نہیں دے رہے تھے کہ وہ بیٹے کی تیمارداری کر سکیں۔ ایمان فروش اپنا کردار الگ ادا کر رہے تھے۔ امام شیموئیل کے لیے یہ حالات کوئی نئے نہیں تھے۔ اس سے پہلے بھی امام شیموئیل کو سخت سے سخت حالات سے سابقہ پڑ چکا تھا۔ لیکن اس وقت مجاہدین کی آنکھیں جواہرات کی چکا چوند سے خیرہ نہیں ہوئی تھیں اور غداری کا تصور بھی سوہان روح تھا۔ ایک مضبوط مسلمان گوریلا کمانڈر کی طرح امام شیموئیل کے حوصلے ابھی بھی بلند تھے۔ اس مشکل صورتحال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے امام کے ذہن میں ایک اچھوتا آئیڈیا آیا۔ وہ آئیڈیا یہ تھا کہ کسی طرح روسی فوج کے کمانڈر انچیف جنرل بیریاٹنسکی کو اغوا کر لیا جائے۔ روسی جنرل کے اغوا کے بہت گہرے اثرات ہوتے اور کمانڈر کی عدم موجودگی کی وجہ سے روسی سپاہ میدان میں زیادہ دیر کھڑی نہ رہ سکتی۔ جب تک نیا کمانڈر میدان میں آتا مجاہدین روسیوں کو واپس دھکیل چکے ہوتے۔ لیکن آنسو کے امیر دانیال بیگ کی غداری کی بدولت یہ منصوبہ پایہ تکمیل تک نہیں پہنچ سکا اور روسی جنرل کو پہلے ہی اس کی خبر ہو گئی۔

اگست 1859ء میں روسی لشکر مجاہدین کے آخری مورچے غنیب تک پہنچ چکا تھا۔ امام کے ساتھ صرف 400 مجاہد باقی تھے۔ باقی تمام مجاہد ایک ایک کر کے جام شہادت نوش کر چکے تھے۔ 25 اگست کو روسی جنرل نے غنیب کی پہاڑی پر گولہ باری شروع کروا دی یہ گولہ باری اس غضب کی تھی کہ دن کے گیارہ بجے تک امام کے 300 ساتھی شہید ہو چکے تھے۔ صرف 100 نفوس باقی بچے تھے جن میں سے 50 عورتیں، بچے اور بوڑھے تھے۔ درحقیقت اب یہ مقابلہ 50 مجاہدوں اور روس کی دو لاکھ افواج کے درمیان تھا۔ جنرل بیریاٹنسکی نے دوربین

سے مجاہدین کے نقصان کا اندازہ کرنے کے بعد امام کو پیغام بھیجا۔

"آپ جنگ ہار چکے ہیں لہٰذا بہتر یہی ہے کہ ہتھیار ڈال دیں۔ آپ کی جان اورعزت کی حفاظت میرے ذمہ ہے لیکن اگر اب بھی آپ مقابلے پر بضد رہے تو نتائج کی ذمہ داری آپ پر ہوگی۔"

امام نے روسی جنرل کے اس پیغام کا جو جواب دیا وہ تاریخ میں سنہری حروف سے لکھنے کے قابل ہے۔ امام نے کہا" جنگ میں کسی ایک فریق کی فتح لازمی ہے۔ ویسے بھی تم نے یہ جنگ غداروں اورتوپوں کے بل بوتے پر جیتی ہے تم یہ سمجھ رہے ہو کہ ہم جنگ ہار چکے ہیں لیکن یہ تمہارے بھول ہے۔ یاد رکھنا! کہ ہم جنگ ہار کر بھی جیت جائیں گے کیونکہ ہمارا مقصود شہادت ہے۔ تم ہمارے لیے عزت کی زندگی کا راستہ بند کر سکتے ہو لیکن عزت کی موت کا راستہ ہمارے لیے کھلا ہے تم" اپنے سپاہیوں کو آگے بڑھنے کا حکم دو ہماری تلواریں نیاموں سے نکلنے کو بے قرار ہیں۔"

روسی جنرل امام کا جواب پڑھ کر دم بخود رہ گیا۔ اسے زمین پر بسنے والے کسی بھی انسان سے جوان حالات کا شکار ہو اس جواب کی توقع نہیں تھی۔ ایسے میں ان خوانین نے جو امام سے غداری کے بعد روسیوں کے حلیف بن کر اس لڑائی میں شریک تھے روسی جنرل کو امام پر حملہ کے لیے کہا تو وہ ان پر غصے سے پھٹ پڑا۔

"حملہ، حملہ! کس پر حملہ، جنرل بیریاتنسکی دو لاکھ سپاہیوں کے ساتھ ان چند آدمیوں پر حملہ کرے جن کے پاس تلواروں اور خنجروں کے علاوہ کچھ نہیں۔ تم لوگ نہیں سمجھتے کہ ان لوگوں کو مارنا کتنا مشکل ہوتا ہے جو خود موت کے طلب گار ہوں۔"

پیغامات کے اس تبادلے کے بعد روسی جنرل نے مجاہدین پر گولہ باری بند کروادی۔ وہ جانتا تھا کہ مجاہدین کئی دنوں سے بھوکے پیاسے لڑ رہے ہیں۔ ان کے پاس سامان رسد کے ذخائر ختم ہو چکے ہیں۔ لہٰذا وہ زیادہ دن نہیں لڑ سکیں گے۔ اس کا یہ خیال واقعی صحیح تھا۔ امام اوران کے ساتھی کئی دنوں سے بھوکے پیاسے لڑ رہے تھے۔ عورتوں اور بچوں کی حالت سب سے زیادہ بری تھی۔ آخر 20 دن بعد جب عورتوں اور بچوں کی حالت نا قابل برداشت ہوگئی تو

امام نے اس شرط پر روسیوں سے صلح کر لی کہ انہیں مکہ معظمہ جانے کی اجازت دے دی جائے تاکہ وہ اپنی زندگی کے باقی ماندہ دن اس اللہ کی یاد میں گزار سکیں جس کے دین کی خاطر وہ 30 سال تک بے سروسامانی کے عالم میں لڑتے رہے۔

لیکن امام کے ہتھیار ڈالتے ہی زار روس حسب روایت اپنے وعدوں سے مکر گیا اور اس نے امام کو مکہ معظمہ بھیجنے کی بجائے ''کلوگا'' بھیج دیا۔ جو آب و ہوا کے لحاظ سے روس کا بدترین علاقہ تھا۔ کلوگا کی آب و ہوا نے جلد ہی اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا اور چند ہی سال میں امام شموئیل کے خاندان کے 34 افراد میں سے 17 اللہ کو پیارے ہو گئے۔ چند سال بعد زار نے دوبارہ امام شموئیل کو روس کی جانب سے قفقاز کا وائسرائے بننے کی پیشکش کی لیکن امام نے اسے ٹھکرا دیا۔ آخر زار نے اس شرط پر امام کو مکہ معظمہ بھیجنے کی اجازت دے دی کہ وہ اپنے دونوں بیٹوں غازی محمد اور محمد شفیع کو اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتے۔ امام اپنے دونوں بیٹوں سے مشورہ کر کے ترکی کے راستے مکہ معظمہ روانہ ہو گئے۔ راستے میں قسطنطنیہ سے کچھ فاصلے پر امام کے دونوں بیٹے بھی زار کی قید سے فرار ہو کر امام کے پاس پہنچ گئے۔ سعودیہ پہنچ کر امام نے چند دن مدینہ منورہ میں گزارے اور پھر فریضہ حج کی ادائیگی کے لیے مکہ معظمہ جانے کا ارادہ کیا۔ امام کی صحت گر چکی تھی۔ امام کے میزبان الشیخ احمد الرفاعی نے ان کے لیے اونٹنی پر تخت رواں کسوا دیا۔ ابھی یہ لوگ مدینہ سے باہر نکلے ہی تھے کہ امام کی اونٹنی ٹھوکر کھا کے گر پڑی۔ امام کو معمولی چوٹیں آئیں۔ ان کی نظریں مسجد نبوی کے میناروں پر جمی ہوئی تھیں اور وہ کچھ سوچ رہے تھے چند لمحوں بعد انہوں نے اپنے ساتھیوں سے کہا ''قدرت کو شاید میرا مدینہ سے باہر جانا منظور نہیں واپس چلو۔''

چنانچہ یہ مختصر سا قافلہ مدینہ واپس پلٹ گیا اور وہ چنگاری جو قفقاز کی یخ بستہ فضاؤں میں مسلسل 30 سال تک بھڑکتی رہی 25 ذی القعد 1287ھ، 4 فروری 1871ء کی شام ہمیشہ کے لیے بجھ گئی۔ امام شموئیل کو جنت البقیع میں دفن کیا گیا۔ امام کی وصیت کے مطابق ان کے خاندان کے باقی افراد قسطنطنیہ چلے گئے۔

امام شموئیل نے جہاد کی جو چنگاری آج سے ڈیڑھ صدی قبل قفقاز کی فضاء میں سلگائی

تھی وہ آج آگ بن کر چیچن مجاہدین کی صورت میں بھڑک رہی ہے۔ چیچنیا کے مجاہد ایک بار پھر اپنے سے کئی گنا بڑی استبدادی قوت، روس کے خلاف سینہ سپر ہیں۔ شہادتوں کے قافلے جنت کے راستوں پر چل پڑے ہیں اور وہ دن آیا ہی چاہتا ہے جب مجاہدین کی اذانیں روس کے لینن گراڈ اور ماسکو کی فضاؤں میں گونج رہی ہوں گی۔ ان شاء اللہ

❀❀❀



سید احمد شہیدؒ

شاہ ولی اللہ کا خاندان مسلمانوں کے سیاسی، معاشرتی اور دینی زوال پر خون کے آنسو رو رہا تھا ان بزرگوں کو دن رات یہی فکر تھا کہ کسی ترکیب سے امت مسلمہ کی گرتی ہوئی دیوار کو سنبھالا جائے سید احمد کی ذات میں انہیں ایک ایسا مسلمان نظر آیا جس کے دل میں وہی درد تھا جو انہیں بھی ہر لمحہ تڑپاتا تھا

بے سروسامانی کے عالم میں آزادی کی جوت جگانے والے سرفروش

قافلہ جب مرزا پور پہنچا تو وہاں سات گھر اینٹ پکانے والوں کے تھے۔ چونکہ وہ اینٹیں پہنچانے کے لیے گدھے بھی رکھتے تھے اس لیے گدھے والوں کے نام سے مشہور ہو گئے تھے۔ شہر کے وہ خاندان جو شرفاء کہلاتے تھے۔ انہیں ذلیل اور کمین سمجھتے تھے اور یہ تو بہت عار کی بات سمجھی جاتی تھی کہ ان کے یہاں جا کر کچھ کھایا پیا جائے۔

ان غریب گدھے والوں کو بھی شوق ہوا کہ سید صاحب اور آپ کے قافلے والوں کی دعوت کریں لیکن اول تو انہیں عرض کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی اور جب ہمت کر کے یہ درخواست پیش کی تو قافلے کے میزبانوں نے سختی سے مسترد کر دینا چاہا مگر انہیں اور شہر کے تمام لوگوں کو سخت حیرت ہوئی جب سید صاحب نے خندہ پیشانی سے ان کی دعوت قبول کر لی، بڑے شوق سے ان کے محلے میں گئے اور بڑی شفقت سے دعوت تناول فرمائی۔ دعوت کے بعد ان لوگوں نے ایک طشت میں چار سو روپیہ نقد اور دوسرے طشتوں میں کمخواب، گلبدن وغیرہ اعلیٰ قسم کے چند تھان پیش کیے تو سید صاحب نے اس کو قبول کرنے سے معذرت کر لی اور فرمایا کہ اگر آپ کا ہدیہ قبول کر لیا گیا تو شہر والے سمجھیں گے کہ اس ہدیے کے لالچ میں دعوت کھائی تھی، اس طرح اصلاح کا مقصد فوت ہو جائے گا۔ عام لوگوں سے مختلف یہ سید

صاحب کون تھے۔ آیئے جانتے ہیں۔

لارڈ ویلزلی کا سات سالہ دور حکومت (جو کہ 1798ء سے شروع ہو کر 1805ء پر ختم ہوا) ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقدامات کا دور تھا۔ 1799ء میں سلطان ٹیپو کو شہید کر کے ان کی تحریک کو ختم کر دیا گیا۔ پھر وہ دور جو 1808ء سے شروع ہوا، ہندوستانی حکمرانوں اور انگریزوں کی قوت آزمائی کا آخری اور نازک ترین دور تھا۔

اس نازک موقع پر شاہ ولی اللہ کے فرزند شاہ عبدالعزیز جو کہ ایک ملت کا درد رکھنے والے مجاہد تھے اور وہ اس حقیقت کو خوب سمجھتے تھے کہ برصغیر میں انگریزوں کا سکہ جم چکا ہے اور مسلمان بادشاہ کی کوئی حیثیت نہیں۔ کسی ریاست کا حاکم بھی اس قابل نہیں کہ انگریزوں کو دیس سے نکال سکے۔ دوسری طرف عوام بھی پست ہمت ہو چکے تھے، اور حیران و پریشان کھڑے آنسو بہا رہے تھے، ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کریں۔

ایسے حالات میں شاہ عبدالعزیز آگے بڑھے، وہ سوئی ہوئی قوم کو انگریزوں کے خلاف جہاد کے لیے تیار کرنا چاہتے تھے مگر تھے دور اندیش! انگریزوں سے کھلم کھلا ٹکرانا نہیں چاہتے تھے، اس مقصد کے لیے انہوں نے ایک فتویٰ جاری کیا۔

''مسلمان اب دارالحرب میں ہیں''

دارالحرب سے مراد ایسا ملک ہے، جہاں غیر مسلموں کی حکومت ہو اور مسلمانوں کو مذہبی کام کرنے سے روکا جائے۔ اس فتوے کے مطابق مسلمانوں کے لیے اب دو ہی راستے تھے، یا تو ہجرت کر جائیں یا پھر آزادی حاصل کریں۔ ظاہر ہے وطن چھوڑ کر جانا ممکن نہیں تھا، انہیں لازمی طور پر یہیں رہنا اور آزاد رہنا تھا۔

اس فتویٰ کے بعد بھی شاہ عبدالعزیز خاموش نہیں بیٹھے بلکہ انہوں نے اپنے آدمیوں کو اپنے خاص مرید سید احمد کے ساتھ نواب امیر علی خاں کی فوج میں بھرتی کرا دیا یوں جہاد کے اپنے فتوے کی عملی شکل مسلمانوں کے سامنے پیش کر دی۔

سید احمد شہید رائے بریلی کے رہنے والے اس خاندان کے چشم و چراغ تھے، جو اپنے تقدس اور بزرگی کے لحاظ سے پورے اودھ میں خاص شہرت رکھتا تھا۔ آپ 1786ء میں پیدا

ہوئے۔ آپ کے مورث اعلیٰ شاہ علم اللہ کی درسگاہ بہت مشہور تھی جس کے فیوض کم وبیش سو سال سے اودھ کے تشنہ لبوں کو سیراب کررہے تھے۔ شاہ ولی اللہ نے اس درس گاہ کو اپنے نظریات کی تعلیم وتربیت کا مرکز بنایا تھا اور شاہ ابوسعید، جنہیں انہوں نے اس مرکز کا منتظم بنایا، وہ سید احمد شہید کے نانا تھے اور یہ خاندان اپنے تقویٰ وطہارت، زہد وورع، صبر وتوکل اور ریاضت وعبادت میں خاص شہرت رکھتا تھا۔ خاندانی رسم ورواج کے مطابق آپ کو چار سال کی عمر میں مکتب میں بٹھایا گیا۔ لیکن آپ کی توجہ حصول تعلیم کی طرف پوری طرح مبذول نہ ہوسکی اور اس عرصہ میں آپ صرف قرآن مجید کی چند سورتیں ہی یاد کرسکے۔

سید احمد شہید کو بچپن ہی سے مردانہ وار، سپاہیانہ کھیلوں کا شوق تھا۔ ان کے بڑے بھائی جن کا نام اسحاق تھا، سید صاحب کی تعلیم کی طرف توجہ نہ دینے سے سخت پریشان رہتے تھے مگر ان کے والد صاحب نے ان کو کہا کہ سید احمد کو ان کے حال پر چھوڑ دو اور اللہ تعالیٰ پر توکل کرو۔ بچپن ہی سے آپ کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ آپ کو کافروں سے جہاد کرنا ہے۔ آپ کے خاندان کے افراد جب ان کے منہ سے اس قسم کی باتیں سنتے تو حیران رہ جاتے۔ کیونکہ نسل ہا نسل سے ان کے بزرگ صرف وعظ وتلقین کے ذریعے دین کی خدمت کرتے آرہے تھے۔

سید صاحب کو سپہ گری اور جہاد سے دلچسپی تھی، اس کی وجہ سے آپ نے سخت ورزشیں کرکے اپنے جسم کو سختیاں برداشت کرنے کا عادی بنایا۔

آپ رات کے پچھلے پہر اٹھ کر ورزش شروع کردیتے اور سورج نکلنے کے بعد بھی گھنٹوں تک اس کا سلسلہ جاری رکھتے۔ اپنے ایک بھانجے کو پاؤں پھر کھڑا کرکے پانچ پانچ سو ڈنڑ پیلتے۔ پھر اسے نیچے اتار کر تھوڑی دیر سستاتے۔ اس کے بعد پھر ڈنڑ پیلنے شروع کردیتے۔

آپ نے پہلے بیس سیر کے مگدر ہلانے شروع کیے۔ کچھ دن بعد تیس سیر کے ہلانے لگے اور پھر من من بھر کے ہلائے۔ آپ کی قوت برداشت اور شہ زوری کا یہ عالم تھا کہ اتنے بھاری مگدر چار چار گھنٹے تک ہلاتے رہتے اور اس درمیان میں دم لینے کو پل بھر بھی نہ رکتے۔

اسی طرح آپ نے تلوار، تیر کمان اور بندوق چلانے میں بھی مہارت حاصل کرلی تھی۔

تیراکی میں بھی کمال حاصل تھا۔ پانی کے بہاؤ کے خلاف بے تکلف تیر لیتے تھے اور رفتہ رفتہ دم اتنا بڑھا لیا کہ غوطہ مار کر پانی کی تہہ میں بیٹھ جاتے تو کافی دیر تک وہیں بیٹھے رہتے۔

آپ کا جسم پہلے ہی قوی اور مضبوط تھا۔ اس قسم کی سخت ورزشوں سے تو فولاد کا کندہ بن گیا۔

آپ کا معمول تھا کہ روز صبح شام بیواؤں، اور بے سہارا عورتوں کے گھر جا کر ان کا حال پوچھتے اور جس چیز کی انہیں ضرورت ہوتی فوراً لا دیتے۔

پاس پڑوس اور محلے کے یہ لوگ جن کی سید صاحب نوکروں کی طرح خدمت کرتے تھے، ان کے خاندان کے مرید اور خادم تھے۔ وہ بار بار کہتے تھے کہ ہم تو آپ کے بزرگوں کے خدمت گزار ہیں، آپ ہمیں کیوں شرمندہ کرتے ہیں، مگر آپ نہ مانتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ رشتے داروں اور ہمسایوں کے گھروں میں پہنچ کر جو برتن خالی دیکھتے، اسے اٹھا کر لے جاتے اور باہر سے پانی بھر کر لے آتے یا اگر کسی کو ایندھن کی ضرورت ہوتی تو جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لا دیتے۔

آپ کے خاندان کے لوگ آپ کو ایسے کاموں پر لعنت ملامت کرنے لگے، کیونکہ ان کے نزدیک یہ رذیل لوگوں کے کام تھے جو آپ جیسے عالی خاندان نوجوان کو نہیں کرنے چاہیے تھے۔ مگر آپ نے ان باتوں کی پروانہ کی اور برابر خدمت خلق میں مشغول رہے۔

آپ کی والدہ بھی مجاہدانہ مزاج رکھتی تھیں۔ ایک دفعہ آپ کی جوانی کے دنوں میں رائے بریلی کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں جھگڑا ہو گیا جس نے لڑائی کی شکل اختیار کر لی۔ مسلمان مقابلے کو نکلے تو آپ بھی چلے۔ والدہ نماز پڑھ رہی تھیں۔ ان سے اجازت لینے کے لیے کچھ دیر رکے۔ اتنے میں والدہ نے سلام پھیرا ملامت کی اور آپ سے کہا ''جاؤ، لیکن یاد رکھو، مقابلے میں پیٹھ نہ دکھانا، ورنہ عمر بھر تمہاری صورت نہ دیکھوں گی۔'' لیکن لڑائی کی نوبت نہ آئی۔ جھگڑا بات چیت سے طے ہو گیا۔

سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں آپ اپنے کچھ رشتے داروں کے ساتھ لکھنؤ گئے۔ آپ کے رشتے داروں کا مقصد ملازمت تلاش کرنا تھا، مگر سید صاحب اس غرض سے گئے تھے کہ کسی

رئیس کے ہاں رہ کر سپہ گری کا فن سیکھیں۔

وہاں ایک رئیس ایسا نکل آیا جو آپ کے بزرگوں کا بڑا معتقد تھا۔ اس نے آپ کو اپنے پاس ٹھہرا لیا۔ اچانک اسے دربار اودھ کی طرف سے ایک ہزار کا لشکر جمع کرنے کا حکم ملا۔ اس نے سید صاحب کو بھی اس لشکر میں شامل کر لیا اور وعدہ کیا کہ آپ کے رشتے داروں کے لیے بھی موقع نکالے گا۔ مگر یہ کام آپ کو پسند نہ آیا اور ایک روز چپکے سے شاہ عبدالعزیز سے کسب فیض کے لیے دلی روانہ ہو گئے۔

اس وقت آپ کی مالی حالت اتنی پتلی تھی کہ آپ کی جیب میں صرف تین پیسے تھے۔ آپ نے انھی تین پیسوں کے بل پر لکھنؤ سے دلی تک کا طویل سفر پاپیادہ طے کیا، مگر راہ میں کسی کے آگے دست سوال دراز نہ کیا۔ دلی پہنچ کر آپ شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے آپ سے حسب نسب پوچھا۔ آپ نے بتایا کہ آپ کون ہیں، کس خاندان کے ہیں اور کس غرض سے شاہ صاحب کی خدمت میں آئے ہیں۔

اس زمانے میں ہندوستان کے مسلمانوں کی جو بری حالت تھی، شاہ عبدالعزیز اسے درست کرنے کے لیے جہاد کا فیصلہ کر چکے تھے۔ جب آپ نے سید احمد سے تبادلۂ خیالات کیا تو معلوم ہوا کہ ان کی رائے میں بھی مسلمانوں کی حالت درست کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ جو بری رسوم ان میں سرایت کر گئی ہیں، ان کے خلاف لسانی جہاد کیا جائے اور جو کفار اور مشرک ہندوستان سے اسلام کو مٹانے کے درپے ہیں، ان کے خلاف تلوار سے جہاد کرنا چاہیے۔ آپ نے ان کے خیالات کو بے حد پسند فرمایا اور انہیں اپنے بھائی شاہ عبدالقادر کے پاس بھیج دیا۔

شاہ ولی اللہ کا خاندان مسلمانوں کے سیاسی، معاشرتی اور دینی زوال پر خون کے آنسو رو رہا تھا۔ ان بزرگوں کو دن رات یہی فکر تھا کہ کسی ترکیب سے امت مسلمہ کی گرتی ہوئی دیوار کو سنبھالا جائے۔ سید احمد کی ذات میں انہیں ایک ایسا مسلمان نظر آیا جس کے دل میں وہی درد تھا جو انہیں بھی ہر لحظہ تڑپاتا تھا۔ اس لیے انہوں نے سید احمد کو فوراً اپنے پاس رکھ لیا۔

سید صاحب شاہ عبدالقادر کے پاس رہنے لگے اور ان سے عربی اور فارسی کی کتابیں

پڑھنے لگے۔ ہر چند آپ رائج الوقت علوم میں پوری دستگاہ حاصل نہ کر سکے، مگر آپ نے اپنے فطری جوش وخروش کے بل پر عالموں سے بھی اونچا درجہ حاصل کرلیا۔ آپ عالم باعمل تھے۔آپ نے اپنی پوری زندگی اسلامی شریعت کے سانچے میں ڈھال لی اورتہیہ کرلیا کہ جو روح شاہ ولی اللہ کے خاندان والوں کی صحبت اورتربیت سے آپ میں پیدا ہوگئی ہے، وہی ہر مسلمان میں پیدا کریں گے۔

آپ نے شاہ عبدالعزیز سے بیعت کرلی تھی۔کافی دن دلی میں رہنے کے بعد آپ نے اُن سے وطن جانے کی اجازت طلب کی توانہوں نے اجازت دے دی۔

جب آپ رائے بریلی پہنچے توچونکہ پانچ برس بعد وطن میں قدم رکھا تھا اور ڈاڑھی مونچھیں بھی نکل آئی تھیں، اس لیے شروع میں لوگ آپ کو پہچانے تک نہیں۔

اس وقت آپ کی عمر بائیس سال کی تھی۔ اگلے برس آپ کی شادی ہوگئی۔ اس سے اگلے سال (۱۸۱۰ء میں) آپ نے نواب امیر خاں کے لشکر میں ملازمت کرلی اور سات برس تک وہیں رہے۔

نواب امیر خاں ایک طاقت ور مسلمان نواب تھا۔ وہ اس وقت انگریزوں کے اثر سے آزاد تھا۔ قیاس ہے کہ سید احمد اس کی فوج میں اس غرض سے شامل ہوئے تھے کہ ایک وہی ہندوستان میں اسلام کی آزادی کے لیے جہاد کرنے کی طاقت اور صلاحیت رکھتا تھا۔ چنانچہ اسلام کے احیاء اور جہاد فی سبیل اللہ کا ولولہ آپ کواس کے لشکر میں لے پہنچا تھا۔

آپ ایک معمولی سپاہی کی حیثیت سے بھرتی ہوئے تھے، مگر جب امیر خاں کوآپ کی صلاحیتوں کا علم حسب نسب کا حال معلوم ہوا اور اس نے آپ کے جوہر دیکھے تو اپنا مشیر خاص بنالیا۔

جن دنوں آپ نواب کے لشکر میں تھے، اس زمانے میں بھی آپ لشکریوں کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرتے رہے۔جس سے اس لشکر کی کایاپلٹ گئی اوراس میں دینی فضا پیدا ہونے لگی۔آپ اس زمانے میں بھی بڑی بڑی ریاضتیں کرتے رہے اور خدمت خلق کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔

جب امیر خاں نے انگریزوں سے صلح کرنی چاہی تو آپ نے اسے منع کیا، مگر وہ اپنے حالات کی وجہ سے مجبور تھا۔ اس پر آپ اس سے علیحدہ ہوگئے، کیونکہ آپؒ کا نصب العین ہندوستان کی سرزمین پر آزاد اسلامی حکومت قائم کرنا تھا۔

امیر خاں کے لشکر سے الگ ہونے کے بعد آپ جون ۱۸۱۸ء میں ایک بار پھر شاہ عبدالعزیز کے پاس دلی چلے گئے۔

اب سید احمد کی خداداد صلاحیتیں کمال کو پہنچ چکی تھیں اور وہ بڑے سچے اور پکے مجاہد بن چکے تھے۔ امیر خاں کا لشکر ان دنوں ہندوستان کی سیاست کا مرکز تھا۔ اس میں سات برس رہنے کے بعد آپ کو یہ اندازہ بھی ہوگیا تھا کہ ملک میں اس وقت کیا ہو رہا ہے اور آپ نے یہ نکتہ خوب اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ اگر اب بھی حالات کا رخ نہ بدلا گیا تو مسلمانوں کی رہی سہی سیاسی برتری بھی ختم ہو جائے گی۔

آپ نے یہ نصب العین بنایا کہ مسلمانوں کو حقیقی معنوں میں مسلمان بنانا چاہیے۔ جہاد کے اس جذبے کو دوبارہ زندہ کرنا چاہیے جس نے خلفائے راشدین کے دور میں مسلمانوں کو کفار پر غالب کر دیا تھا اور ہندوستان میں خالص اسلامی حکومت قائم کرنے کے لیے جہاد بالسیف کرنا چاہیے۔

یہ نصیب العین سامنے رکھ کر آپ نے ایک ایسی جماعت بنانے کی ٹھانی جو اس کو عملی جامہ پہنائے اور بیعت لینے کا سلسلہ شروع کر دیا۔

شاہ ولی اللہ کے خاندان نے اس معاملے میں سبقت کی۔ سب سے پہلے اس خاندان کے ایک فرد مولوی محمد یوسف پھلتی نے آپ کی بیعت کی۔ پھر شاہ عبدالعزیز کے بھانجے اور داماد مولوی عبدالحق نیز شاہ اسمٰعیل اور شاہ اسحاق وغیرہ نے بھی آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔

یہ لوگ دلی میں علم و فضل اور دین کے ستون سمجھے جاتے تھے۔ جب یہ خبر عام ہوئی کہ ان جید بزرگوں نے سید احمد کے ہاتھ پر بیعت کر لی ہے تو ایک دنیا ٹوٹ پڑی اور لوگ آپ کے حلقے میں جوق در جوق شامل ہونے لگے۔ پہلے دلی کے آس پاس آپؒ کا شہرہ ہوا تو وہاں

سے لوگ آئے۔ پھر جہاں جہاں یہ خبر پہنچی، وہاں سے بھی لوگوں کے گروہ کے گروہ آ کر آپ کے ہاتھ پر بیعت جہاد کرنے لگے۔

جو لوگ دہلی آکر آپ سے بیعت ہو سکتے تھے وہ دہلی آ گئے، مگر ہزاروں لوگ ایسے بھی تھے جو دہلی نہ آ سکتے تھے۔ اس کے لیے سید احمد کو ان کے شہروں اور بستیوں میں جانے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ جگہ جگہ سے بلاوے آنے لگے۔

اب آپ معتقدوں کے بلاووں پر دورہ کرنے نکلے اور اس علاقے میں شہر شہر پھرے، جسے دوآبہ کہتے ہیں۔ یہ گنگا اور جمنا کے درمیان کا علاقہ ہے۔ آپ نے اس دورے میں ایک تو مسلمانوں کے اعمال و عقائد کی اصلاح کی۔ دوسرا یہ اندازہ لگایا کہ اگر آپ کفار اور مشرکوں کے خلاف جہاد کا علم بلند کریں تو کتنے مسلمان آپ کا ساتھ دیں گے۔

یہ دورہ چھ مہینے میں ختم ہوا۔ نومبر ۱۸۱۸ء میں دہلی سے روانہ ہوئے تھے۔ مئی کے مہینے میں دہلی واپس تشریف لے آئے۔ آپ جہاں جہاں گئے، وہاں لوگ سینکڑوں کی تعداد میں آپ کے عقیدت مندوں کے حلقے میں شامل ہوئے۔ ظاہر میں آپ کے طور طریق پیر زادوں جیسے ہی تھے، مگر آپ کا یہ دورہ پیروں کے دوروں سے بالکل مختلف تھا۔ آپ نے ہر جگہ وعظ میں مسلمانوں کو یہ تلقین کی کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کا اتباع کریں اور بدعتوں سے پیچھا چھڑائیں۔ آپ نے اس پر زور دیا کہ مسلمان اپنی زندگی اسلام کے سانچے میں ڈھالیں، اس کے احکام کو زبانوں تک نہ رکھیں بلکہ دلوں میں اتاریں اور ان پر سختی سے عمل کریں۔ آپ نے وہ رسمیں ترک کرنے کی نصیحت کی جو مسلمانوں نے ہندوؤں کے اثر سے اختیار کر لی تھیں۔

آپ کی شخصیت میں اتنی کشش اور زبان میں ایسا جادو تھا کہ جو شخص آپ سے ایک مرتبہ مل لیتا یا آپ کا وعظ سن لیتا وہ ہمیشہ کے لیے آپ کا ہو جاتا۔

یہ دورہ ختم کر کے آپ ۲۳ جون ۱۸۱۹ء میں کو اپنے وطن رائے بریلی کو چلے گئے۔ وہاں آپ نے دو برس دو مہینے اصلاحی اور تبلیغی کاموں میں گزارے۔ دوآبے کے دورے اور ان سرگرمیوں سے آپ کو اندازہ ہو گیا کہ اگر آپ نے جہاد شروع کیا تو مسلمان ساتھ

آپ کا ساتھ دیں گے۔ چنانچہ آپ نے اپنے رفیقوں کو حکم دے دیا کہ وہ اپنا بیشتر وقت جنگی فنون کی مشق میں صرف کیا کریں۔ گویا اب آپ جہاد کی زبانی دعوت کی منزل سے گزر چکے تھے اور عملی دعوت جہاد کے مرحلے میں قدم رکھ رہے تھے۔

آپ تبلیغ اور جہاد کی تیاریوں میں ہمہ وقت منہمک رہتے تھے۔ مسلمانوں میں جو اخلاقی اور اعتقادی خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں، انہیں دور کرنا بے حد ضروری تھا، کیونکہ ان کی موجودگی میں وہ سچے مجاہد اسلام نہ بن سکتے تھے۔ آپ نے اپنا ہر لمحہ ان خرابیوں کو دور کرنے کے لیے وقف کر دیا تھا۔ آپ کا انداز اس زمانے کے پیروں جیسا ہی تھا، مگر عقائد اور اعمال کی اصلاح نیز اسلام کی خدمت کا جو جذبہ آپ میں پایا جاتا تھا، وہ قرنوں سے کسی مصلح میں نظر نہ آیا تھا۔ اس لیے آپ کی سرگرمیوں سے مسلمانوں میں حرارت ایمان کی برقی رو دوڑنے لگی اور عوام تو عوام امیر گھرانوں کے افراد میں بھی دین کی خدمت کی سچی تڑپ پیدا ہوگئی۔ انہی دنوں ہندوستان کے علماء کے ایک گروہ نے یہ فتویٰ جاری کر دیا کہ حج فرض نہیں رہا، کیونکہ بحری سفر میں حاجیوں کے لٹنے اور ہلاک ہو جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔

ان کا یہ فتویٰ مذہب اسلام کے پانچویں رکن سے انکار کے برابر تھا، اس لیے یہ ایک فتنہ تھا۔ سید صاحب نے اس فتنے کا سر کچلنے پر کمر باندی اور نہ صرف خود حج کیا بلکہ سینکڑوں لوگوں کو حج کروایا۔

حج سے واپس آنے کے بعد سید صاحب نے خود کو جہاد کی تیاریوں کے لیے وقف کر دیا۔ یہاں تک کہ ایک ایسی جماعت تیار کر لی جو آپ ہی کی طرح ہندوستان کو دارالاسلام بنانے کے لیے جہاد پر کمربستہ ہوگئی اور جس نے تہیہ کر لیا کہ یا تو یہ مقصد حاصل کرے گی یا اسے حاصل کرنے کی جدوجہد میں اپنی جانیں دے دے گی۔

یہ جہاد شروع کرنے سے ان لوگوں کی غرض یہ نہیں تھی کہ اپنے لیے کوئی سلطنت بنائیں۔ وہ صرف اسلامی علاقوں کو کافروں اور مشرکوں کے تسلط سے چھڑا کر ان میں اسلامی حکومت کا قیام اور اسلامی شریعت کا اجرا چاہتے تھے۔ سید صاحب نے صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ "میں ہفت اقلیم کی سلطانی کو پرکاہ کے برابر وقعت نہیں دیتا۔ جب دین کی نصرت کا

زور شروع ہو جائے گا اور غیروں کے اقتدار کی جڑ کٹ جائے گی تو میری سعی کا تیر خود بخود نشانے پر بیٹھ جائے گا۔'' یہ تھا سید احمد شہید کا نصب العین، جس کے سوا ایک سچے مسلمان کا اور کوئی نصب العین ہو ہی نہیں سکتا۔

بہت سے لوگوں نے آپ پر اعتراضات کیے۔ ایک تو یہ کہا گیا کہ جہاد فرض کفایہ ہے۔ اگر مسلمانوں کی ایک جماعت جہاد شروع کر دے تو باقی مسلمانوں کے سر سے اس فرض کا بوجھ اتر جاتا ہے۔ پھر آپ سب مسلمانوں کو جہاد میں شریک ہونے کی دعوت کیوں دے رہے ہیں؟ سید صاحب نے اس اعتراض کا یہ جواب دیا کہ کفایہ کا مطلب یہ ہے، مسلمان مجاہد موقع اور جگہ کے لحاظ سے کافی ہوں۔ یہ نہیں ہے کہ صرف چند سو کافی ہوں گے۔

دوسرا اعتراض یہ تھا کہ جہاد کے لیے جیسا قائد ہونا چاہئے، ویسا اس زمانے میں پیدا ہی نہیں ہوسکتا۔ اس لیے جہاد کرنا غیر ضروری ہے۔ گویا لوگ یہ کہنا چاہتے تھے کہ سید صاحب جہاد کی قیادت کے لیے موزوں نہیں ہیں۔ لیکن آپ نے اپنی جان اسلام پر قربانی کر کے یہ بات ثابت کر دی کہ آپ اس منصب کے اہل تھے۔

جب آپ نے سب تیاریاں کر لیں تو ہندوستان کے شمال مغربی سرحدی علاقے کو جہاد کا مرکز بنایا۔ اس کی کئی وجوہات تھیں۔ ایک تو ہندوستان میں ایسا کوئی آزاد مقام اور نہ تھا۔ دوسرے یہ علاقہ پورے کا پورا مسلمانوں کا تھا۔ وہاں کے لوگ جنگ جو تھے اور انہوں نے امداد کا یقین بھی دلایا۔ تیسرے یہ کہ وہ سکھوں سے تنگ آئے ہوئے تھے۔

جنگی تدبیروں کے لحاظ سے بھی یہی علاقہ موزوں تھا۔ اس کے شمال مغرب میں اسلامی ملک تھے، ان سے امداد کی امید ہوسکتی تھی۔ یا کم سے کم مخالفت کا اندیشہ نہ ہوسکتا تھا۔ پھر اس پر عقب سے دشمن کا حملہ نہ ہوسکتا تھا اور یہاں سے پنجاب میں بھی گھسا جاسکتا تھا، جہاں سکھوں کی حکومت تھی اور وہ مسلمانوں پر بے پناہ مظالم کر رہے تھے۔ سید احمد صاحب شہید سیاسی قیادت کی اہلیت کے علاوہ بہت سی ایسی خوبیوں کے مالک تھے جو کسی ایک انسان میں کم ہی جمع ہوتی ہیں۔

آپ کی سب سے بڑی انسانی خوبی یہ تھی کہ گو جسمانی طور پر بڑے قوی اور شہ زور

تھے، مگر لوگوں سے بڑی نرمی سے بات کرتے تھے۔ اس نرم گفتاری کی وجہ سے آپ کی باتوں میں ایسا جادو پیدا ہو گیا تھا کہ جو ایک بار مل لیتا، آپ کا معتقد ہو جاتا۔ آپ کی طبیعت میں حلم اور انکسار غضب کا تھا۔ اکثر لوگوں نے آپ کو سخت باتیں کہہ دیں، مگر آپ نے جواب میں ان پر کبھی غصہ نہ کیا۔

آپ جنگی فنون میں مہارت رکھتے تھے، مگر آپ کے مزاج میں وہ وحشت اور درندگی نام کو نہ تھی جو بعض مشہور جرنیلوں کے مزاج کا خاصہ تھی۔ آپ دل کے بے حد نرم تھے۔ حد یہ کہ سکھوں کے خلاف جہاد کے دوران میں ان کے حق میں یہ دعا کیا کرتے تھے کہ اللہ انہیں مسلمان کر دے۔

ان خوبیوں کی بنیاد اس للّٰہیت پر تھی جو آپ میں شاہ عبدالعزیز کی دینی تربیت نے کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی۔ آپ کا جینا بھی اللہ کے لیے تھا اور موت بھی اسی کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے آئی۔ آپ نے ظاہری علوم میں کوئی اونچا مقام حاصل نہیں کیا، لیکن دین کی روح کو سمجھنے اور اس کا عملی نمونہ بن کر دکھا دینے کے معاملے میں پوری تاریخ اسلام میں آپ کے درجے کے قائد چند ہی نظر آتے ہیں۔

آپ احکام خداوندی اور سنت نبوی پر استقامت سے عمل کرتے۔ نتیجہ یہ تھا کہ آپ ہر دنیاوی لالچ اور غیر اللہ کے خوف سے بلند تھے۔ دولت آپ کو اپنے نصب العین کی تکمیل سے باز نہ رکھ سکی اور سخت ترین مصیبتوں میں بھی اپ کو کبھی ایک لمحے کے لیے بھی باطل سے صلح کرنے کا خیال نہ آیا۔ دشمن کی بڑی سے بڑی فوج آپ کو کبھی ہراساں نہ کر سکی اور اپنی فوج کی کم تعداد اور سامان کی قلت سے آپ کبھی پریشان نہ ہوئے۔

اللہ کا دین پھیلانے اور مسلمانوں کی زندگیوں کو شریعت کے سانچے میں ڈھالنے کا جو ولولہ آپ کے دل میں تھا، اس نے آپ کو سچے مسلمان کا قابل اطاعت نمونہ بنا دیا تھا۔ چنانچہ بنگال سے لے کر گجرات تک آپ کی اس خوبی نے قدم قدم پر لوگوں کے دلوں کو دین کی روشنی سے منور کیا۔ ہر اس سرزمین میں جہاں آپ کے قدم پہنچے، الٰہی احکام جاری ہو گئے اور مشرکانہ رسمیں مٹ گئیں۔

آپ کی خوبیوں میں سے ایک بڑی خوبی مساوات پسندی تھی جو ایک سچے مسلمان کے کردار کا جز و لاینفک ہے۔ آپ نے امیر لشکر ہونے کے باوجود کبھی کسی کو یہ محسوس نہ ہونے دیا کہ آپ خود کو اوروں سے اونچا سمجھتے ہیں۔ آپ کی طبیعت میں درگزر کا مادہ اس قدر تھا کہ جن درّانی سرداروں نے زہر دلوایا، انہیں بھی کچھ نہ کہا بلکہ اپنے عقیدت مندوں کو بھی ان کے خلاف کارروائی سے منع فرمایا۔

مروّت کا یہ عالم تھا کہ لوگ بار بار آپ کے ساتھ دغا کرتے رہے، مگر جب معافی مانگی تو انہیں فوراً معاف کر دیا۔

آپ شجاعت میں بھی بے مثال تھے۔ واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ کا اپنے بارے میں یہ کہنا غلط نہ تھا کہ میرے لیے جان دے دینا ایسا ہی ہے، جیسے کوئی تنکا توڑ کر پھینک دے۔ گھمسان کے رن میں بھی ہونٹوں پر ہنسی کھیلتی رہتی اور چہرے سے شادمانی ٹپکی پڑتی۔

سخاوت آپ کو اپنے بزرگوں سے ورثے میں ملی تھی۔ زندگی کے ہر دور میں دولت اور سامان ان کی ٹھوکروں سے لگا رہا، مگر آپ نے اپنے پاس کبھی کچھ نہ رکھا۔ جو ملا، اسے دوسروں کی ضرورتیں پوری کرنے پر خرچ کر دیا بلکہ جو ترکہ ملا تھا، وہ بھی اوروں کو دے دیا۔

صبر و استقامت کا جو نمونہ آپ نے پیش کیا، اس کی مثال تاریخ میں ملنی مشکل ہے۔ جب آپ جہاد کرنے کے لیے گھر بار چھوڑ کر سرحد کی طرف روانہ ہوئے تو راستے میں بے انداز مشکلات اور مصیبتیں پیش آئیں، مگر اس پیرزادے نے جو آرام و راحت کی زندگی بسر کرتا رہا تھا، کبھی اف تک نہ کی۔ سرحد میں بعض دفعہ مٹھی بھر جوار پر قناعت کرنی پڑی، بلکہ کبھی کبھی فاقے بھی ہوئے، مگر صبر کیا اور جبین نیاز شکن آلود نہ ہونے دی۔ آپ کانٹوں بھرے راستے پر اس طرح چلے جیسے یہ پھولوں سے پٹا ہوا ہے۔

آپ کے توکل کا یہ حال تھا کہ ہزاروں انسانوں کے روٹی کپڑے کا ذمہ لے رکھا تھا۔ مگر کبھی اس خیال سے پریشانی نہ ہوئی کہ یہ ذمہ داری پوری کرنے کے لیے روپیہ کہاں سے آئے گا۔ آپ کو اللہ کی ذات پر اٹل بھروسہ تھا اور وہ آپ کے کام بنا ہی دیتا تھا۔

لوگ آپ کے پاس سپاہ کی کمی اور سامان کی قلت دیکھ کر اس سوچ میں پڑ جاتے تھے کہ آپ جہاد میں فتح کس طرح حاصل کر سکیں گے، مگر آپ نے اسی حال میں بڑی بڑی فوجوں کو شکست دی۔

آپ نے اپنی ذاتی خوبیوں اور بلند نصب العین سے ایک ایسی تحریک اٹھائی تھی جس کا مقصد ہندوستان میں اسلامی حکومت قائم کرنا اور شرعی قوانین رائج کرنا تھا اور اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ اگر اپنوں ہی کی غدّاریوں، دغابازیوں، منافقت اور کوتاہ نظری سے یہ تحریک ناکام نہ ہوگئی ہوتی تو آج اس برصغیر کا نقشہ مختلف ہوتا۔



شاہ اسمٰعیل شہیدؒ

اس خانوادے کے مایہ ناز رکن جس کے فیض سے برصغیر کا شاید ہی کوئی دینی گھرانہ ایسا ہو جو محروم رہا اور جس کا سلسلہ تلمذ اس نامور خانوادے تک نہ پہنچا ہو شاہ ولی اللہ کے بیٹے عبدالغنی کے صاحبزادے اور شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین کے بھتیجے

تحریک آزادی کے عظیم مجاہد کا قصہ بے مثال

عشاء کی نماز ہو چکی ہے۔ نمازی جامع شاہجہانی کے مختلف دروازوں سے نکل کر گھروں کو جا رہے ہیں۔ ایک دبلا پتلا میانہ قامت شخص قلعے میں عام سا آدمی لگتا ہے مگر یہ عام آدمی نہیں ہے۔ یہ وہ شخص ہے جس کا نام لال قلعہ سے لے کر جھونپڑیوں تک ہر زبان پر ہے۔ گھر گھر اس کا چرچا ہے کہیں بھلائی سے کہیں برائی سے اور جیسا کہ اس دنیا کی ریت ہے بھلے لوگوں کو برائی سے یاد کرنے والے ہمیشہ زیادہ ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ انہیں ان کی غلطیوں پر ٹوکتے ہیں انہیں نیکی اور بھلائی کی ترغیب دیتے ہیں اور حق پرستی اور اچھی باتوں کی تلقین کرتے ہیں پھر حق کی تلقین اور باطل کی تردید سے بڑھ کر جرم اور کیا ہو سکتا ہے؟

یہی حال اس شخص کا ہے۔ یہ لوگوں کو قرآن وسنت کی طرف بلاتا اور بدعت اور ضلالت کی تردید کرتا ہے۔ مسلمان جن غیر اسلامی رسوم میں جکڑے ہوئے ہیں اور جن کے بوجھ تلے ان کی کمر جھکی جا رہی ہے ان کے خلاف آواز بلند کرتا ہے۔ انہیں کہتا ہے اللہ کے بندو جو بوجھ اللہ اور اس کے رسولؐ نے تم پر نہیں ڈالا اسے تم نے کیوں اٹھا رکھا ہے؟ وہ بوجھ جس نے تمہاری معاشرتی زندگی دوبھر کر دی ہے اسی طرح وہ ان عقائد پر تنقید کرتا ہے جن کی اللہ کی کتاب اور رسول اللہ ﷺ کی سنت میں کوئی سند نہیں۔ لوگوں کے لیے ان کی آواز بالکل نئی ہے حق کھول کر صاف صاف بیان کرتا ہے۔ باطل کو باطل اور غیر اسلام کہنے میں کسی لاگ

لپیٹ سے کام نہیں لیتا۔ نتیجہ یہ کہ وہ لوگ اس کے دشمن ہو گئے ہیں جنہوں نے عام مسلمانوں کو مشرکانہ عقائد، گوناگوں بدعتوں اور رسم ورواج کے جال میں پھنسا کر اپنی دکانیں چمکا رکھی ہیں۔ اسے سر بازار گالیاں دی جاتی ہیں۔ دلی کے شہدے اور غنڈے اس کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ اور اسے ہر وقت جان کا خطرہ رہتا ہے۔ دوست احباب اور خیر خواہ اس سے لوگوں کے اس ردعمل کا ذکر کرتے ہیں، تو کہتا ہے بھائی یہ لوگوں کا قصور نہیں ہمارے علماء کا قصور ہے جنہوں نے اسلام کی تعلیمات ان کے سامنے کبھی واشگاف بیان نہیں کیں اور اب میری زبان سے سنتے ہیں تو انہیں وحشت ہوتی ہے یہ شخص کون ہے؟ شاہ محمد اسماعیل۔ اس خانوادے کے مایہ ناز رکن جس کے فیض سے برصغیر کا شاید ہی کوئی دینی ایسا ہو جو محروم رہا اور جس کا سلسلہ تلمذ اس نامور خانوادے تک نہ پہنچا ہو۔ شاہ ولی اللہ کے بیٹے عبدالغنی کے صاحبزادے اور شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین کے بھتیجے۔

چونکہ ایک دنیا ان کی دشمن ہو چکی ہے دہلی کے بدمعاش اور شہدے ان کی جان کے درپے ہیں اس لیے ان کے خاندان والے ان کی بہت حفاظت کرتے ہیں۔ جہاں جاتے ہیں کوئی نہ کوئی ان کے پیچھے ہوتا ہے۔

شاہ اسماعیل جامع شاہجہانی کی سیڑھیوں پر پہنچتے ہیں تو پیچھے سے ایک سایہ لپک کر انہیں جالیتا ہے۔ شاہ صاحب مڑکر دیکھتے ہیں۔ یہ مولانا محمد یعقوب ہیں شاہ عبدالعزیز کے نواسے۔ وہ پوچھتے ہیں۔ اسماعیل کہاں جاتے ہو؟ اس وقت تمہیں تنہا نہ جانے دوں گا

جہاں جاؤ گے تمہارے ساتھ جاؤں گا شاہ صاحب کہتے ہیں میں ایک خاص کام سے جارہا ہوں مجھے جانے دو اور میرے ساتھ نہ آؤ مولانا یعقوب اصرار کرتے ہیں مگر شاہ صاحب نہیں مانتے اور تنہا چل دیتے ہیں۔ مولانا یعقوب بھی ذرا فاصلے سے ان کے پیچھے پیچھے ہو لیتے ہیں۔

شاہ صاحب خانم بازار پہنچتے ہیں اور موتی نامی ایک مشہور طوائف کے مکان کے سامنے جارکتے ہیں اور دروازے پر آواز دیتے ہیں..... کچھ دیر بعد ایک لڑکی اندر سے نکلتی ہے اور کہتی ہے ایک فقیر کھڑا ہے۔ طوائف کچھ پیسے دیتی ہے کہ جا کر دے دے۔ لڑکی پیسے لا کر

دیتی ہے۔ لو میاں یہ پیسے لیں شاہ صاحب کہتے ہیں۔ میں ایک صدا کہا کرتا ہوں اور بغیر صدا کہے کچھ نہیں لیتا اپنی بی بی سے کہو میری صدا سن لیں وہ جا کر فقیر کا پیغام دیتی ہے۔ طوائف کہتی ہے اچھا بلا لے۔ وہ انہیں بلا کر لے جاتی ہے۔ شاہ صاحب صحن میں رومال بچھا کر بیٹھ جاتے ہیں اور والتین والزیتون وطور سینین وھذا البلد الامین لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم ثم رددنہ اسفل سافلین تک تلاوت فرماتے ہیں۔ اتنے میں مولانا محمد یعقوب بھی آ کر شاہ صاحب کے پیچھے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

رات کا سماں شاہ صاحب کی دل میں اترتی ہوئی پر تاثیر زبان اور پھر آیات الٰہی۔ اس ماحول کے عین مطابق جس میں شاہ صاحب حق کی دعوت پہنچانے آئے۔ ان آیات میں ذکر ہے کہ فطری جمال جسمانی اور روحانی انحطاط کا تذکرہ ہے کہ جب وہ اس عظیم بلندی سے گرتا ہے تو انتہائی پستیوں میں پہنچ جاتا ہے۔ ایسی پستیاں جن کے بعد کسی اور پستی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ شاہ صاحب کی آواز آہستہ آہستہ بلند ہوتی جاتی ہے۔ موتی کے گھر کی ساری طوائفیں اور ارد گرد کے دوسرے کے لوگ جمع ہو چکے ہیں اور دم بخود سن رہے ہیں۔ شاہ صاحب انسان کی پیدائش اور اس کے اخلاقی عروج و زوال کا ذکر اس قدر بلیغ اور موثر پیرائے میں کرتے ہیں کہ جنت اور دوزخ کا نقشہ سننے والوں کی آنکھوں میں کھنچ جاتا ہے۔ دلوں کے پردے چاک ہو جاتے ہیں اور یہ اثر ہوتا ہے کہ چیخ چیخ کر رونے لگتے ہیں اور کہرام مچ جاتا ہے۔ عالم وارفتگی میں وہ اپنے ڈھول ستار اور آلات موسیقی توڑ دیتے ہیں۔ موتی اور اس کے ساتھ کئی اور طوائفیں اور ان کے مرد گناہ کی زندگی سے تائب ہو جاتے ہیں۔

رات بھیگ چکی ہے چودھویں رات کا چاند سر پر کھڑا مسکرا رہا ہے۔ اس کی نورانی کرنیں صحن میں چاندنی بکھیر رہی ہیں۔ موتی کے گھر پر یہ چاندی پہلے بھی بکھرتی ہو گی مگر آج دلوں میں پھیلنے والے نور نے اس گھر کے کے ظاہر و باطن کو اجالے کے لہریں لیتے ہوئے سمندر میں نہلا دیا ہے۔ شاہ صاحب اٹھتے ہیں اور اپنا رومال کندھے پر ڈال کر اور گھر والوں کو سلامتی کی دعا دے کر چل دیتے ہیں۔ مولانا یعقوب بھی پیچھے پیچھے ہیں۔ دل ہی دل میں کٹ رہے ہیں کہ اتنے عالی گھرانے کا فرزند اور ایسے بدنام کوچے میں۔ آخر دل کی بات زبان پر

آ جاتی ہے۔ شاہ صاحب جامع مسجد پر پہنچتے ہیں تو یہ ان سے جا ملتے ہیں اور کہتے ہیں میاں اسماعیل تمہارے دادا ایسے تھے تمہارے چچا ایسے اور تم ایسے خاندان کے ہو جس کو بادشاہ سلامی دے رہے ہیں مگر تم نے اپنے آپ کو بہت ذلیل کر لیا ہے اتنی ذلت اچھی نہیں۔ شاہ صاحب ان کی طرف حیرت بھری نظروں سے دیکھتے ہیں جیسے انہوں نے کوئی بہت ہی غیر متوقع بات کہہ دی ہو پھر چلتے چلتے رک جاتے ہیں ٹھنڈی سانس بھرتے ہیں اور کہتے ہیں مولانا! یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟ آپ اس کو میری ذلت سمجھتے ہیں! یہ تو کچھ بھی نہیں۔ میں تو اس روز سمجھوں گا کہ میری عزت ہوئی جس روز دلی کے شہدے میرا منہ کالا کر کے اور گدھے پر سوار کر کے مجھے چاندنی چوک میں نکالیں گے اور میں پکار پکار کر کہہ رہا ہوں گا اللہ نے یہ فرمایا اور اللہ کے رسولؐ نے یہ فرمایا۔ مولانا محمد یعقوب خود کہتے ہیں یہ جواب سن کر میں مارے شرم کے پانی پانی ہو گیا میری زبان بند ہو گئی اور اس کے بعد مجھے بھر ان سے آنکھ ملانے کی جرات نہ ہوئی۔

شاہ اسماعیلؒ ۱۱۹۳ھ میں پیدا ہوئے ان کے والد شاہ عبدالغنیؒ شاہ ولی اللہؒ کے سب سے چھوٹے فرزند ارجمند تھے۔ اپنے والد گرامی اور نامور بھائیوں کی طرح صاحب علم وفضل اور متورع اور متقی اور حسن عمل کی متاع گراں بہا سے مالا مال تھے۔ تاہم ان کی زندگی اپنے بھائیوں میں سب سے کم تھی۔ شاہ اسماعیل شہید دس برس کے تھے کہ وہ عین عالم شباب میں جنت کو سدھار گئے۔ شاہ عبدالقادرؒ نے یتیم بھتیجے کو اپنے دامن شفقت و تربیت میں لے لیا۔ ابتدائی کتابیں انہیں سے پڑھیں۔ پھر شاہ رفیع الدینؒ اور شاہ عبدالعزیزؒ کے فیضان علم سے بھی بہرہ اندوز ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں غیر معمولی ذہانت و ذکاوت سے نوازا تھا۔ ان کے اس جوہر کو دیکھ کر بڑے بڑے اصحاب علم وفضل دنگ رہ جاتے تھے۔ معقولات کی وہ کتابیں جنہیں پڑھتے وقت ذہین سے ذہین طالب علم کا پتہ پانی ہوتا تھا، ان کا مطالعہ اس انداز میں کرتے جیسے بہت بڑا شناور طویل وعریض گہرے پانیوں میں شناوری کرتا چلا جاتا ہے۔ سرسید کے بقول ایسے فرد کامل کا پیدا ہونا خدائے ذوالجلال کی قدرت کا

نہ تھا۔ سبق لیتے وقت صفحے کے صفحے چھوڑتے چلے جاتے اور جب شاہ عبدالقادرؒ ٹوکتے تو کہتے کہ کتاب کا یہ حصہ آسان تھا۔ اس لیے چھوڑ دیا اور کبھی ایسا ہوتا کہ پڑھے ہوئے سبق کو دوبارہ پڑھنے لگتے۔ شاہ صاحب فرماتے میاں صاحبزادے! یہ سبق تو پہلے پڑھ چکے ہو۔ عرض کرتے کہ اس حصے کے بعض مسائل سمجھ میں نہیں آئے اور پھر ایسے اعتراضات وارد کرتے کہ استاد گرامی کو انہیں دور کرنے میں کافی سوچ و بچار کرنا پڑتی۔

شاہ ولی اللہؒ کا گہوارہ علم ہو اور شاہ عبدالعزیزؒ، شاہ رفیع الدینؒ اور شاہ عبدالقادر ایسے اساتذہ ہوں اور شاہ اسماعیلؒ جیسا غیر معمولی دماغ رکھنے والا انتہائی ذکی و فہیم شاگرد۔ پندرہ سولہ برس کی عمر میں رسمی تعلیم سے فارغ ہوئے تو عالم بے بدل بن چکے تھے۔ پھر وہ محض عالم فاضل نہ تھے بلکہ معقول و منقول دونوں میدانوں میں مسائل پر مجتہدانہ نظر رکھتے تھے اور اگر انہیں مسند درس و تدریس پر بیٹھنے اور تصنیف و تالیف کا موقع ملتا تو سید ابوالحسن علی ندوی کے بقول ''بہت سے علوم و فنون میں امام یا مجدد کا منصب آپ کو دیا جاتا۔'' معقولات میں جو گہرا ادراک حاصل تھا، اس کی زمانہ طالب علمی کی ایک جھلک پیش کی جا چکی ہے۔ تحصیل علم سے فارغ ہوئے تو نوعمری کے باوجود، دور دور سے علم کے پیاسے اس چشمہ علم سے سیراب ہونے کے لیے حاضر ہوتے اور شاہ صاحبؒ کسی شرح سے کمک لیے بغیر پٹی ہوئی ڈگر سے ہٹ کر امہات الکتب کی تعلیم دیتے اور وہ نکتے اٹھاتے اور ان پر بحث کرتے کہ شاہ عبدالعزیزؒ کے نامور شاگرد مولانا رشید الدین کہا کرتے تھے کہ اگر ارسطو اور افلاطون بھی قبر سے نکل کر آ جاتے تو شاہ صاحب کی بحثوں اور اعتراضات کا کوئی جواب نہ دے سکتے۔ شاہ صاحب نے منطق پر ایک رسالہ بھی قلمبند فرمایا تھا۔ ان کی مجتہدانہ بصیرت اور پرزور و مستحکم استدلالی قوت کو خراج تحسین ادا کرتے ہوئے سرسید نے آثار الصنادید میں لکھا ''اگر معلم اول (ارسطو) موجود ہوتا تو اپنے دلائل کو تار عنکبوت سے سست تر سمجھتا۔''

یہ تو معقولات کا عالم تھا۔ دینی علوم یعنی قرآن و حدیث اور تفسیر و فقہ وغیرہ تو گویا شاہ صاحب کی میراث تھے۔ پیدا ہوئے تو قال اللہ اور قال الرسول کی وجدانگیز صدائیں کانوں میں پڑیں، ہوش کی آنکھیں کھولیں تو گھر کے اندر عبادت و تقویٰ اور حسن عمل کا دور دورہ

اور مسجد و مدرسہ کی حدود میں کتاب وسنت کی تعلیمات کا دریا موجزن پایا۔ جس کے نارے سمرقند و بخارا اور ہندوستان اور عالم اسلام کے دوسرے گوشوں سے آنے والے اصحاب ذوق وشوق، زندگی کے سارے ہنگاموں سے کٹ کر اپنے دل کے تہی جام وساغر بھرنے میں منہمک تھے۔ اس جان فزا علمی فضا کے ایک ایک لمحے کی مہک کو قلب وروح میں بسائے شاہ اسماعیل پروان چڑھے۔ کتاب وسنت پر شاہ صاحب کی نگاہ جس قدر وسیع و عمیق تھی اس کا اندازہ ''منصب امامت'' پڑھنے سے ہوسکتا ہے۔ سید ابوالحسنی علی ندوی کے الفاظ میں:

''معلوم ہوتا ہے کہ قرآن وحدیث کے صحیفے اور کتب خانے ان کی آنکھوں کے سامنے کھلے ہیں، جہاں سے چاہتے ہیں، نقل کرتے ہیں حالانکہ ان میں سے اکثر کتابیں سفر اور ایسی حالت میں لکھی ہیں کہ آپ کے پاس مشکل سے کوئی کتاب رہی ہوگی۔ استدلال ایسا صحیح ہوتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت یا حدیث اسی موقع کے لیے تھی۔ پھر استنباط واستخراج اور نکتہ آفرینی تو آپ کا حق ہے۔''

''پنجتار میں علماء کی موتمر میں جس میں دو ہزار کے قریب علماء اور دو ہزار کے قریب طلبہ شریک تھے، آپ نے امام کی مخالفت کا حکم بتایا اور فرمایا کہ فقہ کی فلاں فلاں کتابوں کے فلاں فلاں باب، فلاں فلاں فصل میں دیکھیے۔ کتابیں علماء کے پاس تھیں۔ انہوں نے دیکھیں تو کچھ فرق نہ پایا۔''

''لکھنؤ میں مولوی دلدار علی صاحب مجتہد نے آپ کے اس سوال کا جواب کہ تقیہ اور نفاق میں کیا فرق ہے؟ بڑی عرق ریزی، مشورہ اور کتابوں کے حوالے سے طویل مقالہ لکھ کر بھیجا۔ مولوی عبدالحیٔ نے دیکھ کر فرمایا کہ اس کے جواب کے لیے بہت بڑے کتب خانے کی ضرورت ہے جو سفر میں میسر نہیں۔ مولانا اسماعیل صاحب نے قلم برداشتہ اس کا جواب لکھ دیا۔''

اتنے عظیم اور بلند پایہ عالم دین بھتیجے کا ذکر شاہ عبدالعزیزؒ بڑے فخر وناز کے ساتھ کیا کرتے۔ اللہ کی حمد وتقدیس اکثر ان کی زبان پر رہتی جو سیدنا ابراہیم علیہ السلام اپنے بیٹوں کو دیکھ کر بطور شکر وسپاس بیان کیا کرتے تھے بار بار فرمایا کرتے الحمدللہ الذی وھب لی علی الکبر

اسماعیل واسحاق۔ اس اللہ کی ساری حمد وثنا ہے جس نے مجھے اس بڑھاپے میں اسماعیل اوراسحاق عطا فرمائے۔(شاہ اسحاقؒ، شاہ عبدالعزیز کے نواسے تھے)ایک بار ایک مکتوب میں انہیں تاج المفسرین، فکر المحدثین و سرآمد علماء محققین کے القاب سے یاد فرمایا اور لکھا کہ تفسیر، حدیث، نقد، اصول، منطق وغیرہ میں مجھ سے کچھ کم نہیں ہیں۔

شاہ صاحب کی حس ذکاوت غیر معمولی تھی جس کی دھوم شہر بھر میں تھی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد لوگ امتحاناً برسرراہ سوالات پیش کر دیتے خیال یہ ہوتا ہے کتاب پاس نہیں اس لیے شافعی جواب نہ دے سکیں گے۔ لیکن شاہ صاحب بلا تامل جواب دیتے اور مسئلے کی ایسی تشریح فرماتے کہ پوچھنے والے کو اپنی جرات پر شرمندگی ہوتی۔ شاہ شہید رحمتہ اللہ علیہ کے علم و فضل کی شہرت اگرچہ عام تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ طبیعت میں بے پرواہی پائی جاتی تھی۔ یعنی انہوں نے کوئی مستقل مشغلہ اختیار نہیں کیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ خاندان میں جن مشاغل کا رواج تھا شاہ صاحب انھیں اصلاح کے لیے کافی نہ سمجھتے تھے اور کوئی نیا مشغلہ سر دست پیش نظر نہ تھا یا یہ کہ وہ اپنے دل میں الگ لائحہ عمل کا فیصلہ کر چکے تھے اور رفقاء و معاونین کی تلاش میں تھے۔ دوسری طرف سید احمد شہید نواب امیر خاں والی ٹونک کی رفاقت چھوڑ کر راجپوتانہ سے دہلی پہنچے اور اکبر آبادی مسجد میں مقیم ہوئے تو شاہ صاحب ان کی دعوت و جہاد کے منہج پر مبنی فکر سے بہت بتاثر ہوئے۔ ان کے ہاتھ پر بیعت کی اور پھر دن رات دعوت و اصلاح کی غرض سے وعظ وارشاد میں مصروف رہنے لگے۔ منگل اور جمعہ کو شاہی مسجد میں بالالتزام وعظ فرماتے شاہ صاحب کے وعظ کی وجہ سے نماز جمعہ کے لیے لوگ اس کثرت سے آنے لگے جیسے نماز عیدین میں آتے ہیں۔ وعظ ایسا فرماتے کہ جو کچھ فرماتے دلوں میں پیوست ہو جاتا۔ احیائے سنت اور رد شرک و بدعت وعظوں کا خاص موضوع ہوتا۔ یہی وہ دور تھا جس میں احیائے دین کا کام پوری سرگرمی سے شروع ہوا۔ اسی کے متعلق مولانا ابوالکلام آزاد نے تذکرہ میں تحریر فرمایا ''دعوت واصلاح امت کے جو بھید پرانی دہلی کے کھنڈروں اور کوٹلہ کے حجروں میں دفن کر دیئے گئے تھے۔ اب اس سلطان وقت اور سکندر اعظم کی بدولت آباد کے بازاروں اور جامع مسجد کی سیڑھیوں پر ان کا ہنگامہ مچ گیا اور ہندوستان کے کناروں سے

بھی گز رکر نہیں معلوم کہاں کہاں تک چرچے اور افسانے پھیل گئے۔ جن باتوں کے کہنے کی بڑوں بڑوں کو بند حجروں کے اندر بھی تاب نہ تھی اب وہ برسر بازار کہا اور کہی جارہی تھیں اور خون شہادت کے چھینٹے حرف وحکایت کے نقوش صفحہ عالم پر ثبت کررہے تھے۔

۱۲۳۴ھ میں سید احمد شہید نے حج کا قصد کیا سمندری سفر میں متوقع ہلاکتوں کی وجہ سے مختلف علماء نے فرضیت حج کے سقوط کا فتوی دیا ہوا تھا اور بعض اصحاب تو کہنے لگے تھے کہ ولاتلقوا باید یکم الی التھلکۃ کی رو سے حج کا مقصد (معاذ اللہ) مصیبت ہے۔ اس فتنے کا سد باب تحریر وتقریر سے سید احمد شہید، شاہ اسمعیل شہید اور آپ کے دوسرے رفقاء نے کیا۔ جبکہ دوسری طرف سید صاحب کی سرکردگی میں ملک بھر میں عملی طور پر اس بات کا شعور بیدار کیا گیا کہ حج فرض عین ہے اور اسکا سقوط نہیں ہوا۔ اس تحریک سے عملاً آشکارا کیا گیا کہ یہ فرض بہ سہولت ادا ہوسکتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ اسے حکم الہی سمجھ کر ایک سچے مسلمان کی طرح بجالانے کا ارادہ کرلیا جائے۔ چنانچہ سید صاحب ساڑھے سات سو مسلمانوں کے قافلے کے ساتھ حج کے لیے روانہ ہوئے دس جہاز کرایے پر لیے گئے اور ہر جہاز میں ایک امیر مقرر کیا گیا۔ ان میں سے ایک جہاز کے امیر شاہ اسمعیل شہید تھے۔

حج سے واپسی کے بعد شاہ اسمعیل شہید اپنے امیر کے فرمان کے مطابق ہمہ تن جہاد کی دعوت کے لیے وقف ہو گئے۔ سید احمد خاں لکھتے ہیں انہوں نے اس طرح سے وعظ وتقریر کی بنیاد ڈالی کہ مسائل جہاد فی سبیل اللہ بیشتر بیان ہوتے یہاں تک کہ آپ کی تقریر سے مسلمانو ں کا آئنہ باطن مخفی ومجلیٰ ہوگیا اور وہ اس طرح سے راہ حق میں سرگرم ہو گئے کہ ہر شخص بے اختیار چاہنے لگا کہ اس کا سر راہ حق میں خدا اور جان سیدنا محمد ﷺ کے دین کے لیے صرف ہو۔

تقریباً پونے دوسال دعوت جہاد کی دعوت کے نتیجے میں جا بجا مجاہدین کی جماعتیں تیار ہوگئیں تو غور وفکر کے بعد سرحد سے آغاز جہاد کا فیصلہ ہوا۔ جہاں پنجاب کی سکھ حکومت نے یورش شروع کی ہوئی تھی۔ ۷ جمادی الاخری ۱۲۴۱ھ کو سید صاحب نے صرف پانچ سو آدمی ساتھ لیے تھے اور پروگرام تھا کہ تجویز کردہ مقام پر پہنچ کر حالات کے جائزے کے بعد باقی

جماعتوں کو بلالیں گے۔ شاہ شہید اس سفر کے دوران عام تنظیمی اور تبلیغی امور کے کفیل خاص تھے۔ یہ جماعت رائے بریلی سے براستہ بندھیلا گھنٹہ گوالیار، ٹونک اجمیر صحرائے ماڑواڑ، عمر کوٹ حیدر آباد شکار پور کوئٹہ قندھار غزنی اور، کابل ہوتی ہوئی پشاور پہنچی۔ یہ کم وبیش تین ہزار میل کا سفر تھا اس میں تپتے ہوئے صحرا بھی تھے جہاں میلوں تک پانی کا نام ونشان تک نہ ملتا تھا۔ بڑے بڑے دریا بھی تھے دشوار گزار پہاڑ اور برفستان بھی۔ تقریباً دس ماہ کا عرصہ سید صاحب کے قافلے کو یہ سفر طے کرنے میں گزرا۔

۲۰ جمادی الاول ۱۲۴۴ھ کو جہاد کا آغاز ہوا۔ اس سلسلے میں شاہ شہید کے مخصوص وممتاز کارناموں کا اجمالی جائزہ درج ذیل ہے۔ شاہ صاحب کی کوششوں سے اہل سرحد نے سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی اور اور وہاں کے علماء واکابرین سے گفت وشنید شاہ صاحب کرتے تھے۔ ہزارہ میں جہاد کی تنظیم شاہ صاحب نے ہی فرمائی۔ شنکیاری کی جنگ میں ان کے ساتھ اگرچہ صرف دس گیارہ افرد تھے تاہم غیر معمولی استقامت کے ساتھ سکھوں کے خاصے بڑے لشکر کو شکست فاش دی۔ اس جنگ میں شاہ شہید رحمہ اللہ کی قبا گولیوں سے چھلنی ہوگئی اور ایک انگلی پر گولی کا زخم لگا۔ بعد میں اس انگلی کا طرف اشارہ کرتے ہوئے مزاحاً فرمایا کرتے تھے کہ یہ ہماری انگشت شہادت ہے۔ انہی کی کوششوں سے بیعت اقامت شریعت کا آغاز ہوا اور اہل سرحد پہلی مرتبہ صحیح شرعی حکومت کی برکت سے سرفراز ہوئے۔

انھی کی قیادت میں امب عشرہ مردان اور مایار کی جنگوں میں نمایاں فتوحات حاصل ہوئیں۔ فتح پشاور کے بعد سلطان محمد خاں بارک زئی سے گفت وشنید کے لیے بھی سید صاحب انھی کو نامزد کیا۔ جب مفاد پرستوں کی عناد آرائی کے باعث علاقہ سرحد میں حالات نازک صورت اختیار کر گئے اور سید صاحب نے اس مرکز کو چھوڑ کر دشوار گزار پہاڑی راستوں کشمیر کا ارادہ کیا تو شاہ صاحب ان کے ساتھ تھے۔

مسلمانوں کا قافلہ جب بالاکوٹ کے مقام پر پہنچا تو پیچھے سے سکھوں کا لشکر بھی آدھمکا۔ جوراستہ مسلم قافلے نے اختیار کیا تھا وہ بہت تنگ تھا۔ ساتھ میں ایک توپ بھی نہیں جاسکتی تھی۔ جب سکھوں کے حملے کی خبر ہوئی تو شاہ شہید نے پہاڑوں پر چڑھ کر دو تین

مورچے بنائے اور ہر مورچہ پر مسلمانوں کی قلیل تعداد مقرر کر دی۔ آپ نے خود مسجد کے غرب رویہ مکان میں مورچہ بنالیا۔ صورتحال یہ تھی کہ مسلمانوں کی کل تعداد تو سو سے زیادہ نہ تھی اور سوائے توڑے دار بندوقوں کے کوئی اسلحہ بھی پاس نہ تھا۔ جو توپیں وغیرہ تھیں وہ خراب راستے کی وجہ سے امانتاً رکھوا آئے تھے۔ اب صرف تلواریں اور بندوقیں پاس تھیں جبکہ مقابلے میں سکھوں کی تعداد بیس ہزار تھی اور انکے پاس دیگر اسلحہ کے ساتھ ساتھ توپیں بھی تھیں۔ شاہ شہید سمجھ گئے تھے کہ یہ آخری میدان ہے جہاں تک ہو سکے جان توڑ کر لڑیں اور اسلام کے لیے اپنی جان قربان کر دیں۔ پہاڑی لوگ روپے کے لالچ میں سکھوں سے مل گئے اور انہوں نے راستہ ہی دینے پہ قناعت نہیں کی بلکہ سید صاحب کے ضعف کی کیفیت بھی ساری بیان کردی۔ اب وہ وقت آن پہنچا تھا کہ جانباز بہادر اپنی اصلی شجاعت کا جوہر دکھا سکتے۔ سکھوں نے مورچہ بندی کی اور گولہ باری شروع کردی۔ گولوں کا جواب گولیوں کی صورت میں ممکن نہیں تھا۔ کئی گھنٹے تک تو شاہ صاحب نے یہ غیر نتیجہ کوشش کی مگر جب آپ نے بندوقوں کے فائر کرنے فضول سمجھے تو مورچے پر تین آدمی چھوڑ کر نشیب میں جا کے سکھوں کے مورچے کی پشت پر جا پہنچے اور جوں ہی اللہ اکبر کا نعرہ لگایا سکھ پریشان ہو گئے اور مورچہ چھوڑ کر بھاگ گئے۔ بدقسمتی سے جب آپ حملہ کر رہے تھے ایک مسلمان نے پکار کر کہا اسمٰعیل دوڑو سید صاحب کی حالت نازک ہے۔ سکھوں نے گھیر لیا ہے۔ یہ سننا تھا کہ آپ بے تاب ہو گئے اور سیدھے سید صاحب کے پاس پہنچ گئے۔ بڑی مشکل سے سید صاحب کو وہاں بچایا۔ وہ مورچے جو شاہ شہید نے قائم کیے تھے ان پر سکھوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ شاہ صاحب نے غصے میں آکر بھرپور حملے شروع کر دیے جس طرف جاتے غل مچ جاتا بھاگو اسمٰعیل آیا۔ سکھوں کو رنجیت سنگھ نے کہہ دیا تھا کہ شاہ اسمٰعیل کو زندہ گرفتار کرنے کی کوشش کریں۔ سکھوں نے کوشش کی مگر بھلا وہ بپھرا ہوا شیر جس کا نام سن کر سپاہیوں کے ہاتھوں سے ہتھیار گر پڑتے تھے انھیں کس طرح گرفتار کر سکتے تھے۔ سخت خون ریزی ہوئی شاہ صاحب نے جان توڑ کوشش کی اور خوب داد شجاعت دی بالآخر یہ بے مثل بہادر اور عظیم کمانڈر جام شہادت نوش کر گیا۔

شاہ اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے دعوت و جہاد کے عملی میدان کے ساتھ ساتھ فکری

میدان میں بھی گرانقدر خدمات سرانجام دیں اور متعدد کتب ورسائل تصنیف فرمائے۔ جن کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

۱۔ اصول فقہ میں ایک رسالہ

۲۔ منطق میں ایک رسالہ

۳۔ ردالیفاح الحق الصریح فی احکام لمیت والفرو الفریح'' محققین کا بیان ہے کہ حقیقت بدعت میں ایسی کوئی کتاب کسی زبان میں نہیں لکھی گئی

۴۔ منصب امامت''

۵۔ تنویر العینین فی اثبات رفع الیدین''

۶۔ صراط مستقیم۔ اس کتاب کے چار باب ہیں جن میں سے صرف پہلا باب شاہ شہید کا لکھا ہوا باقی مضامین سید احمد شہید صاحب کے ہیں جبکہ عبارت اوراسلوب بیان شاہ صاحب کا ہے۔

۷۔ تقویۃ الایمان۔توحید کے موضوع پر ایک گرانقدر تصنیف ہے جس میں شاہ صاحب نے اسلام کی تعلیم توحید کے خلاف عقیدہ وعمل کی خوفناک غلطیوں کو مختلف عنوانات کے تحت جمع کیا ہے۔

۸۔ یک روزی۔مختصر رسالہ جس میں تقویۃ الایمان پر مولوی فضل حق خیر آبادی کے بعض اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔

۹۔ مکاتیب۔ان کا بہت بڑا مجموعہ۔

اس کے علاوہ شاہ صاحب شعروشاعری سے بھی دلچسپی رکھتے تھے اور شاعری کی بھی منظومات کی کیفیت یہ ہے۔

ایک فارسی قصیدہ نعت میں ......ایک فارسی مثنوی توحید کے مضمون پر......ایک فارسی قصیدہ سید صاحب کی مدح میں......ایک مثنوی فارسی زبان میں ایک حدیث کی شرح میں۔

❀❀❀

کتابیات

(1) تاریخ اسلام...... شاہ معین الدین ندوی

(2) تاریخ اسلام...... اکبر شاہ نجیب آبادی

(3) طبقات اکبری...... نظام الدین احمد

(4) تاریخ مبارک شاہی...... یحیٰ بن احمد سرہندی

(5) طبقات ناصری...... منہاج سراج

(6) فتوح البلدان...... علامہ بلاذری

(7) تاریخ ابن ہشام...... ابن ہشام

(8) سیاست نامہ...... نظام الملک طوسی

(9) تاریخ الخلفاء...... جلال الدین سیوطی

(10) شامی جہاد...... خواجہ حسن نظامی

(11) سلاطین عباسہ...... خواجہ حسن نظامی

(12) پراسرار بندے...... عشرت جاوید

(13) غزنوی جہاد...... خواجہ حسن نظامی

(14) ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ...... ثروت صولت

(15) مسلمان اندلس میں...... رشید اختر ندوی

(16) تاریخ ہندوستان...... ذکاء اللہ

(17) تاریخ فرشتہ...... محمد بن قاسم فرشتہ

(18) محمود غزنوی ...... نصیر احمد جامعی

(19) محمود غزنوی ...... پروفیسر حبیب اللہ [illegible]

(20) آئینہ حقیقت ...... معین الدین ندوی

(21) تابعین ...... معین الدین ندوی

(22) تہذیب و تمدن اسلامی ...... رشید اختر ندوی

(23) سو تاریخی واقعات ...... غلام رسول مہر

(24) سلاطین اسلام ...... غلام جیلانی برق

(25) سلطان محمد فاتح ...... محمد احمد پانی پتی

(26) مسلمان حکمران ...... رشید اختر ندوی

(27) سلیمان عالیشان ...... عزیز احمد

(28) تاریخ اسلامی کے حیرت انگیز لمحات۔ عبدالوہاب ظہوری

(29) عثمانی ترکوں کی تاریخ ...... عبدالصبور طارق

(30) یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے۔ طالب ہاشمی

(31) مسلمانوں کے بحری کارنامے ...... عبدالصبور طارق

(32) دس سلطان ...... سعدی سنگروری

(33) دس فاتح ...... سعدی سنگروری

(34) سو عظیم بادشاہ ...... اختر نواز خان

(35) تاریخ دعوت و عزیمت ...... ابوالحسن ندوی

(36) جرنیل صحابہ ...... محمود احمد غضنفر

(37) مسلمان امیر البحر ......

(38) روشن ستارے ...... آبادشاہ پوری

(39) شاہسوار صحابہ ...... محمود احمد غضنفر

(40) عماد الدین زنگی......طالب ہاشمی

(41) سید بادشاہ کا قافلہ......آباد شاہ پوری

(42) شاہکار اسلامی انسائیکلو پیڈیا......سید قاسم محمود

(43) اردو دائرہ المعارف......پنجاب یونیورسٹی

(44) انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا......

(45) ماہنامہ اردو ڈائجسٹ...... لاہور

(46) ماہنامہ دعوۃ......اسلام آباد

(47) ماہنامہ بیدار ڈائجسٹ......لاہور

(48) سہ ماہی المعارف ......لاہور

(49) ماہنامہ ضرب طیبہ......لاہور

(50) پندرروزہ شمشیر......کراچی

(51) ماہنامہ مجاہد......راولپنڈی

اللہ کے سپاہی



زیرِ نظر کتاب میں ان مسلم فاتحین، مجاہدین اور سپہ سالاروں کا تذکرہ ہے جنہوں نے جہاد و وغا کے میدانوں میں فتح و نصرت کے جھنڈے گاڑے، عزم و ہمت اور سرفروشی کی داستانیں رقم کیں اور جریدۂ عالم پر اپنی سیرت و کردار کے تابندہ نقوش ہمیشہ کے لیے ثبت کر گئے۔ "خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را۔"

یہ فاتحین و مجاہدین، دنیا کے نرالے فاتحین و کشور کشا تھے جن کے پیش نظر صرف کشور کشائی تھی۔ نہ دنیا پہ حکمرانی کرنے کی آرزو، دولت دنیا مطلوب تھی، نہ جاہ و حشمت مقصود۔ اپنی عظمت و بہادری کا نقش بٹھانے کی خواہش تھی، نہ ناموری حاصل کرنے کا شوق۔ بلکہ صرف اور صرف ایک ہی جذبہ ان میں کارفرما تھا، ایک ہی ولولے سے وہ سرشار تھے اور ایک ہی مقصد ان کی ساری تگ و تاز کی بنیاد تھا۔ اور وہ یہ کہ دنیا سے کفر و شرک کا خاتمہ ہو جائے، اور اللہ کا کلمہ بلند ہو جائے۔ جہالت و ظلالت کافور ہو جائے اور ایمان کی روشنی ہر سو پھیل جائے اور بندے، بندوں کی غلامی سے نکل کر اللہ کی غلامی میں آ جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اگرچہ عزم و ہمت کے اعتبار سے، بقول علامہ اقبال.........

دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا   سمٹ کر پہاڑ انکی ہیبت سے رائی

اور "دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان" کا مصداق تھے۔ لیکن دوسری طرف "وہ جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم" کے آئینہ دار بھی تھے۔ وہ جہاں گئے، انہوں نے کہیں بھی ظلم و ستم کا بازار گرم نہیں کیا، لوٹ کھسوٹ کو شعار نہیں بنایا، کشتوں کے پشتے نہیں لگائے۔ بلکہ وہ اللہ کے عاجز بندے بن کر گئے، وہاں ابر کرم بن کر برسے اور لوگوں کو عدل و امن اور راحت و آشتی سے آشنا کیا۔ یوں وہ صرف ایک فاتح ہی نہیں بلکہ ہر جگہ اسلام کے داعی اور پیامبر ثابت ہوئے۔

اس کتاب میں انہی عظیم فاتحین کا تذکرہ ہے جس سے دلوں کو ایک تازہ ولولہ ملتا ہے، ایمان کو جلا اور روح کو بالیدگی ملتی ہے، شوق شہادت پروان چڑھتا اور اسلام کی راہ میں مر مٹنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ مولوں کے اندر شہبازوں سے ٹکرانے کا عزم و حوصلہ بیدار ہوتا اور کنجشک فرومایہ کے اندر ہم دوش سلیمان ہونے کی تڑپ اور آرزو پیدا ہوتی ہے۔ اور آج امت مسلمہ کو ایسے ہی ولولے، جذبے، تڑپ، آرزو اور ایمانی قوت کی ضرورت ہے جو اس کی عروق مردہ میں حیات نو کی لہر دوڑا دے۔

وما ذالك على الله بعزيز

حافظ صلاح الدین یوسف لاہور